متاعِ لوح و قلم
مؤلف
محمد انصار اللہ قاسمی
www.besturdubooks.net

مری انتہائے نگارش یہی ہے
ترے نام سے ابتداء کررہا ہوں

مختلف عنوانات پر لکھے گئے علمی، فکری، اصلاحی اور ادبی مضامین کا مجموعہ، آسان اُسلوب تحریر سے آراستہ، برجستہ اشعار سے مزین گلدستہ، زبان شستہ و شائستہ مسافرانِ علم وعمل کی خدمت میں زادِ راہ اور خوبصورت و دلچسپ تحفہ

مؤلف

محمد انصار اللہ قاسمی

ناشر : دارالثقافہ حیدرآباد، الھند

تفصیلاتِ کتاب

نام کتاب : متاعِ لوح وقلم

مصنف : محمد انصار اللہ قاسمی
آرگنائزر مجلس تحفظ ختم نبوت
واستاذ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد

صفحات : 375

سنِ اشاعت : صفر المظفر ۱۴۳۸ھ مطابق نومبر 2016ء

قیمت : -/250

کمپوزنگ : عزیز گرافکس 9030735447

ناشر : دار الثقافۃ حیدر آباد الہند

بحسن اہتمام : حضرت مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی
ناظم دار العلوم سیاٹل امریکہ

ملنے کے پتے

(۱) دفتر مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا پردیش 040-24562051

(۲) ہدیٰ ڈسٹری بیوٹرس پرانی حویلی، حیدرآباد 9246543507

(۳) مکتبہ کلیمیہ، حضرات یوسفینؒ چوراستہ، ناملی حیدرآباد 9885655591

(۴) زم زم بک ڈپو دیوبند (۵) کتب خانہ نعیمیہ دیوبند

برائے رابطہ مصنف:

Ph. No: 09985030527
E.mail :maqasmi1978@gmail.com

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبولی ہیں انگلیاں ہم نے
زبان پہ مُہر لگی ہے تو کیا رنج ہے
کہ رکھ دی ہے ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
اسباب غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گورا
دَم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
ایک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
ایک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

فیض احمد فیضؔ

فہرستِ مضامین

۞	مقدمہ .... از حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب	8
۞	پیشِ لفظ .... از مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی صاحب	11
۞	حرفِ آغاز .... از مصنف	14
	پروردگار کے دربار میں	
۱	بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو!!	22
۲	دعاء ـــــ آداب و احکام	26
۳	توبہ ـــــ گناہوں کا تریاق	30
۴	توبہ ـــــ مجرمین کی اصلاح کا مؤثر ذریعہ	35
۵	حادثات سے بچنے کا اہتمام کیجئے!	39
۶	رنج و غم کے بادلوں سے لطف و کرم کی بارش!	46
۷	بیمار پر رحمن کی رحمتیں	50
۸	صبر و شکر سے متعلق سلف صالحین کے سبق آموز واقعات	54

سرمایۂ ایمان و نجات

۹	کی محمد سے وفا تو نے کہ ہم تیرے ہیں	61
۱۰	نگاہِ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر	65

۱۱	شمع رسالت ﷺ کے ننھے پروانے	70
۱۲	ننھے عاشق رسول کی سچائی کا اعلان ہوتا ہے	76
۱۳	میں نہ جاؤں گا کبھی در نبی کا چھوڑ کر!	79
۱۴	اسوۂ نبوی ﷺ اور ہماری زندگی	83
۱۵	عاشقانِ مصطفی ﷺ کے نام!	87
۱۶	رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف!!	91

حالات حاضرہ واصلاحِ معاشرہ

۱۷	بچوں کی دینی تربیت اور ہماری ذمہ داری	96
۱۸	اے میرے بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کروگے؟	99
۱۹	اسلام میں نکاح بہت آسان ہے......!	103
۲۰	خاندان کی اجتماعیت —— ادائیگیِ حقوق میں سہولت	108
۲۱	عالمِ ربانی جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی کی علمی مجالس میں حاضری	113
۲۲	اصلاحِ نفس کے لئے صحبتِ صالحین کی اہمیت وضرورت	123
۲۳	صحافت کا بگاڑ —— باعثِ ننگ و عار	129
۲۴	میڈیا کی اسلام دشمنی کا مقابلہ کیوں اور کیسے؟؟	133
۲۵	امریکہ میں مسلمانوں کے حالات —— استاذِ محترم سے ایک ملاقات	138
۲۶	میر عرب کو ٹھنڈی ہوا آئی جہاں سے!	145
۲۷	ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا آغاز	150
۲۸	انصاف کو آواز دو انصاف کہاں ہے؟؟	154

۲۹	بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟	161
۳۰	ممتاز عالمِ دین مولانا محمد عبد القوی صاحب کی ناحق گرفتاری	173
۳۱	خوشی و مسرت کے دو اہم واقعات	178
۳۲	مسلم پرسنل لاء قوانین سے متعلق حکومت کا حلف نامہ.......	183

نشانِ منزل

۳۳	زندگی نام ہے حرکت و عمل کا نہ کہ جمود و تعطل کا!	199
۳۴	وقت کی ناقدری ـــــ زندگی کی ناکامی	203
۳۵	رواداری کے نام پر مذہبی آوارگی	207
۳۶	مذہبی رواداری ـــــ حدود اور دائرہ کار	213
۳۷	عقل اور عقیدت کی جنگ	218
۳۸	عقل و دانائی کا ناروا استعمال	222
۳۹	داستانِ قدم ـــــ ایک شکستۂ پاء کے قلم سے	227
۴۰	عمل سے فارغ ہوا مسلمان، بنا کے تقدیر کا بہانہ	247

احتساب و جائزہ

۴۱	منصبِ امامت اور ہمارا سماج	254
۴۲	کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن!	261
۴۳	کیا ہم صرف رمضانی مسلمان ہیں؟؟	265
۴۴	ماہِ رمضان کا اختتام ـــــ کیا کھویا کیا پایا؟؟	270
۴۵	شرعی سزائیں ـــــ منصفانہ، نہ کہ ظالمانہ	277

۴۶	شریعت میں تبدیلی کی وکالت ـــــ دانشورانہ حماقت	279
۴۷	اسلامی قوانین ـــــ معراجِ ترقی یا معیار پسماندگی؟؟	285
۴۸	خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنون کا خرد!	293
۴۹	رسول اکرمؐ اور تعددِ ازدواج (افسانہ)	299
۵۰	صحیح اور قابلِ عمل احادیث کیا صرف بخاری و مسلم ہی میں ہیں؟؟	307
۵۱	مدارس اور علماء سے متعلق اظہار خیال میں احتیاط و اعتدال کی ضرورت	314
۵۲	تحقیقِ آدم بہ جواب تخلیقِ آدم	325
۵۳	قرآنی تفسیر میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ..........	342

پیام مسرت و نصیحت

۵۴	گلے سے گلے لگایئے، گِلے شکوے ختم کیجئے!	351
۵۵	گلے ملیں نہ ملیں، دل ملائے رکھیئے!	357
۵۶	یتیم کی قسمت جب جاگ اٹھی	362
۵۷	قربانی کا فریضہ ـــــ عشق و جنوں کا نمونہ	364
۵۸	چھری آپ نے کس پر چلائی؟؟	368
۵۹	جانور کی قربانی سے نفس کی قربانی تک	372

کی محمد سے وفا تو نے کہ ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

مقدمہ

اللہ تعالیٰ نے اس امت کوجس خاص مقصد کے لئے پیدا فرمایا ہے، وہ ہے انسانیت کو نیکی کی طرف بلانا اور برائیوں سے روکنا، یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، امر بالمعروف اگرچہ امت کا بنیادی فریضہ ہے، لیکن شریعت میں اس کا کوئی خاص طریقہ متعین نہیں کیا گیا ہے، داعی اپنی صلاحیت، مدعو کی ضرورت، حالات کی مناسبت اور ماحول کی رعایت کے ساتھ مختلف ایسے طریقے اختیار کرسکتا ہے، جس میں شرعی اعتبار سے کوئی ناپسندیدہ بات شامل نہ ہو، چنانچہ ہر عہد میں سلف صالحین اور داعیان امت نے اس زمانہ کے مزاج و مذاق کے مطابق دعوتِ دین، تبلیغ اسلام اور فکر و عمل کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا۔

تاہم دعوت کا جو بھی طریقہ اختیار کیا گیا اس کے بنیادی ذرائع تین ہیں: عمل، زبان اور قلم ـــــــ عمل ایک خاموش دعوت ہے، بعض اوقات زبان وقلم سے بھی زیادہ داعی کا عمل مدعو کو متاثر کرتا ہے، لیکن اس کے لئے طویل صحبت مطلوب ہوتی ہے اور دور تک براہ راست اس کا اثر نہیں پہونچتا، دوسرا ذریعہ زبان ہے، بلکہ گذشتہ ادوار میں زبان ہی اپنی بات دوسروں تک پہونچانے کا اہم ترین ذریعہ تھا، قرآن مجید میں انبیاء کے بہت سے واقعات مذکور ہیں، جس سے ظاہر ہے ک عام طور پر اسی طریقہ کو اختیار کیا گیا، اس دور میں اس کا اثر اور وسیع ہو گیا ہے، کیوں کہ الیکٹرانک ذرائع ابلاغ کے ذریعہ دور دور تک اپنی بات پہونچائی جاسکتی ہے۔

تیسرا ذریعہ قلم ہے، اس کے ذریعہ دعوت صدیوں زندہ رہتی ہے اور نسل در نسل پیغام منتقل ہوتا رہتا ہے، اسی لئے الہامی پیغامات کو کتابی شکل میں بھیجا گیا اور عمل کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی تلاوت کا بھی حکم دیا گیا، دائرہ ابلاغ کے وسعت، اثر انگیزی کی صلاحیت اور دوام و بقا کے

اعتبار سے یہ سب سے اہم ذریعہ دعوت ہے اور موجودہ زمانہ کی ترقیوں نے اس کی اہمیت کو اور بڑھا دیا ہے، اسی لئے علماء اسلام شروع سے لوح وقلم سے وابستہ رہے۔

موجودہ عہد میں اخبارات کی دنیا نے اس کے دائرہ کو اور بڑھا دیا، کتابیں ہزار دو ہزار کی تعداد میں شائع ہوتی ہیں اور سالہا سال میں پڑھی جاتی ہیں، لیکن اخبارات ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں اور ایک دن میں لاکھوں لوگ اُسے پڑھ جاتے ہیں، اس لئے اچھے مقاصد کے لئے اس سے فائدہ اٹھانا وقت کی ضرورت ہے، لیکن اس کے لئے ضروری ہے کہ قلم کار میں آسان زبان اور عام فہم اسلوب میں لکھنے کی صلاحیت ہو اور ایسی مٹھاس بھی ہو کہ وہ قارئین کو اپنا گرویدہ بنالے، بحمد للہ ادھر مدارس اسلامیہ کے کچھ نوجوان فضلاء نے اس میدان میں قدم رکھا ہے اور وہ کامیابی سے اپنا سفر طئے کررہے ہیں، ان ہی میں ایک اس کتاب کے مؤلف عزیز گرامی مولانا محمد انصار اللہ قاسمی سلمہ اللہ تعالیٰ ہیں۔

عزیزی سلمہ حافظ قرآن ہیں، عمدہ لب ولہجہ میں قرآن کی تلاوت کرنے والے قاری اور دارالعلوم دیوبند جیسی عظیم دینی درسگاہ کے فاضل ہیں، انھوں نے المعہد العالی الاسلامی کے شعبہ تخصص فی الدعوۃ سے بھی فراغت حاصل کی ہے، اس وقت مجلس تحفظ ختم نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا پردیش میں رد قادیانیت اور افکار باطلہ کے تعاقب کی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں، ماشاء اللہ صلاحیت اور صالحیت کا امتزاج ہے اور عصری مسائل کا شعور رکھتے ہیں، عزیزی سلمہ وقتاً فوقتاً اردو کے سب سے کثیر الاشاعت اخبار روزنامہ منصف اور دوسرے رسائل وجرائد میں حالات کے موافق مضامین لکھتے رہتے ہیں، اور قارئین انہیں شوق کی آنکھوں سے پڑھتے ہیں، یہ مجموعہ ان ہی مضامین پر مشتمل ہے۔

اس مجموعہ میں ۵۸ / مضامین ہیں، ان میں بعض مضامین ان شاء اللہ قارئین کے سرمایہ ایمان میں اضافہ کریں گے، بعض مضامین وہ ہیں جن کا مقصد بندوں کے اپنے رب کے تعلق کو تازہ کرنا ہے، سماج کی نبض پر نگاہ رکھنے اور معاشرہ کو اصلاح کی طرف دعوت دینے کی بھی کوشش

کی گئی ہے، ملکی اور عالمی مسائل پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، احتساب اور جائزہ بھی ہے، پیام اور دعوت بھی ہے، سیرتِ نبوی بھی ہے، جگ بیتی بھی ہے اور آپ بیتی بھی ہے، زبان سہل، عام فہم اور شستہ وشائستہ ہے، امید ہے کہ دعوتی اور اصلاحی مضامین کا یہ مجموعہ فکر وعمل کی اصلاح کے لئے بہترین رہنما ثابت ہوگا، قادیانیوں کو ایمان کی طرف بلانے کے لئے عزیزی سلمہ کا ایک رسالہ شائع ہو چکا ہے اور ردّ قادیانیت پر ان کے بہت سے مضامین طبع ہو چکے ہیں، اگر الگ سے ان مضامین کا مجموعہ شائع ہو جائے تو یہ بھی بہت مفید ثابت ہوگا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ عزیزی سلمہ کی اس کاوش کو قبول فرمائے اور امت کو اس سے فائدہ پہونچائے و اللّٰہ ھو المستعان ۔

خالد سیف اللہ رحمانی
ناظم المعہد العالی الاسلامی
سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

۱۴؍ ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ
م ۸؍ مارچ ۲۰۱۲ء

متاعِ دین و دانش مٹ گئی اللہ والوں کی
یہ کس کافر ادا کا غمزۂ خوں ریز ہے ساقی

پیشِ لفظ

علماء، دین حق کے ترجمان اور میراثِ نبوت کے امین ہیں، کتاب وسنت، عقائدِ صحیحہ اور توحیدِ خالص کی اشاعت، اصلاحِ رسوم، تزکیۂ نفس، اعلائے کلمۃ اللہ، حمیت اسلامی اور غیرتِ ایمانی، دین کی صحیح تعلیمات کی دعوت وترجمانی اور تبلیغ کے لئے جدوجہد اور تصنیف وتحریر اور خطابت وتقریر کے ذریعہ اُمت کی رہنمائی اور اصلاح، علماء کا فرض منصبی ہے، اس لئے وہ دعوت واصلاح کے ساتھ حفاظتِ دین کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں، وہ اپنے معاشرہ اور ماحول سے بے گانہ نہیں ہوتے بلکہ معاشرہ اور اس کے قابلِ اصلاح پہلوؤں پر اُن کی گہری نظر ہوتی ہے، دین کے صحیح فہم اور قرآن وحدیث کے گہرے مطالعہ کے زیر اثر اُن کی قوتِ امتیاز اتنی بڑھ جاتی ہے کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں اسلام اور جاہلیت کی آمیزشوں کو محسوس کرنے لگتے ہیں، اُن کی قوت ایمانی اس قدر بیدار ہوتی ہے کہ خارزارِ جاہلیت کی ہر کھٹک انہیں اصلاح کے لئے بے چین کردیتی ہے، علماء بلاشبہ اُمت کے حکیم ہوتے ہیں، اُن کا ہاتھ اُمت کی نبض پر ہوتا ہے، حکمتِ دعوت اور جذبہ نصح کے ساتھ وہ دل کی زمین میں محبت کا بیج بوتے ہیں اور ظلمت کدۂ جہالت میں علم ومعرفت اور ہدایت واصلاح کی شمع روشن کردیتے ہیں اور اپنی عملی زندگی سے یہ پیغام بھی دیتے ہیں کہ ؂

کوئی بزم ہو کہ کوئی انجمن، یہ شعار اپنا قدیم ہے
جہاں روشنی کی کمی ملی، وہیں اِک چراغ جلادیا

قلم، علم وآگہی کا وسیلہ اور دعوت الی الخیر اور اشاعتِ حق کا ایک اہم ذریعہ ہے اور شاید اسی نسبت سے نبی آخرالزماں ﷺ کی اس امت کا دامن علم اور قلم سے باندھ دیا گیا ہے، یہ امت علم وتحقیق، فکر ونظر، تدبر وتفکر اور تصنیف وتالیف سے بے گانہ نہیں رہ سکتی، اسی لئے علماء ومصلحین

امت نے ہر دور میں اپنے علم وقلم سے اصلاح وانقلابِ امت کی جدوجہد میں بھر پور حصہ لیا، زندگی کے مختلف مسائل میں اُن کی رہنمائی کی، دین کی صحیح تفہیم اور تشریح کے ذریعہ اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ امت کا ایمانی وروحانی تعلق مستحکم کیا، زیرِ نظر کتاب بھی دراصل علم وقلم کے اسی زریں سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یہ کتاب ''متاعِ لوح وقلم'' عزیزِ گرامی قدر مولانا محمد انصار اللہ قاسمی (آرگنائزر مجلس تحفظ ختمِ نبوت واستاذ المعہد العالی الاسلامی) کے علمی، اصلاحی اور ادبی مضامین کا قیمتی مجموعہ ہے، مختلف مناسبتوں سے لکھے گئے یہ مضامین بعض اخبارات ورسائل میں شائع ہوکر سندِ قبولیت اور دادِ تحسین حاصل کر چکے ہیں، اور اب انھیں کتابی صورت میں شائع کیا جارہا ہے تاکہ ان کی افادیت ونافعیت کو دوام وبقاء حاصل رہے، ان مضامین کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں علم وفکر کی گہرائی کے ساتھ عصری حسیت اور زمانی شعور پورے طور پر جلوہ گر ہے، اندازِ تحریر نہایت سلیس، رواں اور ادبی ہے، سماج اور معاشرہ کے کمزور اور قابل اصلاح پہلوؤں کی نشان دہی بھی ہے اور نشانِ منزل کا تعین بھی، اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت، تعلق اور انابت کی دعوت بھی ہے اور سرمایۂ ایمان اور متاعِ دین ودانش کی حفاظت کا پیام بھی۔

اسلام اور شریعت محمدی کے تعلق سے پائے جانے والے جدید ذہن کے شبہات کا ازالہ بھی کیا گیا ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس وقت کی یہ اہم ضرورت ہے کہ اہل علم واصحاب قلم جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام کی ضرورت کا احساس پیدا کریں، اسلام کی حقانیت اور اس کی ابدیت اور صلاحیت کو ثابت کریں اور زندگی کے تمام مسائل میں اس کی اہمیت وافادیت اور منفعت بخش پہلوؤں کو واضح کریں، اس مجموعہ کے اکثر مضامین محض ''شوق تحریر'' میں نہیں؛ بلکہ ضرورت اور تقاضۂ وقت کے تحت لکھے گئے ہیں، جس کی وجہ سے اُن میں ایک طرح وقار واعتبار کی شان پیدا ہوگئی ہے۔

عزیز موصوف ایک دینی گھرانے کے چشم وچراغ اور دارالعلوم دیوبند کے ممتاز فاضل ہیں، ان کا علم تازہ اور قلم جواں ہے، اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے اُردو اور عربی میں لکھنے کا ذوق

اور سلیقہ رکھتے ہیں، مجلس تحفظ ختمِ نبوت ٹرسٹ تلنگانہ وآندھرا پردیش کے نہایت متحرک اور فعال ذمہ دار ہیں، انہیں دعوت اور ختمِ نبوت کے موضوع سے گہری دلچسپی ہے، اپنے قلم اور قدم کے ذریعہ امت کے سرمایۂ دین وایمان کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہیں ہے، ان کے اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت پر مجھے بے حد مسرت ہے۔

دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں مزید دینی خدمات کی توفیق عطا فرمائے ،ان کے قلم کو ہمیشہ تازہ دم اور بافیض رکھے اُن کی علمی و عملی زندگی ہر قسم کی تعب اور تھکن سے نا آشنا رہے اور ع

ہر نقشِ پا بلند ہو دیوار کی طرح

احمد عبد المجیب قاسمی ندوی
ناظم واستاذ حدیث وفقہ
دار العلوم اسلامیہ سیاٹل، امریکہ

حضور ! دہر میں آسودگی نہیں ملتی : تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی !
ہزاروں لالہ وگل ہیں ریاض ہستی میں : وفا کی جس میں ہو بو ، وہ کلی نہیں ملتی
مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں : جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

حرفِ آغاز

مجھے کچھ کہنا ہے اپنی زباں میں !!

تمام تر تعریف وتوصیف اُس خدائے بزرگ وبرتر کے لئے ہے جس نے ''قلم'' کے ذریعہ علم سکھایا، بے حد وحساب درود وسلام ہو اُس محمود ومحبوب اور مقدس ترین ذاتِ گرامی حضرت خاتم النبیین ﷺ پر، جن پر ''لوحِ محفوظ'' سے قرآن مجید نازل کیا گیا۔

''متاعِ لوح وقلم'' کے نام سے مختلف عنوانات پر علمی، اصلاحی اور ادبی مضامین کا یہ مجموعہ قارئین کے ہاتھوں میں ہے، جیسا کہ عام معمول ہے کہ کتاب کے شروع میں ''عرضِ مصنف'' کے عنوان سے کچھ ابتدائی اور تمہیدی باتیں پیش کی جاتی ہیں، ان باتوں سے صاحبِ کتاب کے مزاج اور مذاق کا اندازہ ہوتا ہے، کیوں کہ بعض مرتبہ کتاب پڑھنے سے زیادہ صاحبِ کتاب کو سمجھنا زیادہ اہم اور ضروری ہوتا ہے، کہنے والے نے کہا: ؎

یوں تو الفاظ ہیں اظہارِ مطالب کے لئے
لوگ الفاظ میں نیت کو چھپا دیتے ہیں

اسی طرح ''حکیم الشعراء'' اکبر الہ آبادی کا یہ حکیمانہ شعر بھی بہت بجا ہے ؎

مدحتِ گفتار کو سمجھو نہ اخلاقی سند
خوب کہنا اور ہے، اور خوب ہونا اور ہے

۱- مضامین کا یہ مجموعہ ایک اہم دینی فریضہ ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کے تقاضہ کے تحت مرتب ہوا ہے، اس لئے کہ سلسلۂ نبوت ورسالت کے ختم اور مکمل ہونے کے بعد ہر مسلمان اپنی صلاحیت واہلیت کے مطابق اور اپنی قدرت واستطاعت کے بقدر اس عظیم فریضہ کو انجام دینے کا پابند ہے، یہ کام وقت کے نبیوں اور پیغمبروں کا تھا، رسول اللہ ﷺ چوں کہ آخری نبی ہیں

اوراب تا قیامت دنیا میں کسی کو نبوت ورسالت کا منصب نہیں ملے گا، کسی شخص کو رسول اور پیغمبر ہونے کا درجہ اور مرتبہ حاصل نہیں ہوگا، اس لئے بھلائی کی طرف بُلانے اور بُرائی سے روکنے کا ''پیغمبرانہ مشن'' اُمت محمدیہ کے حوالہ کیا گیا، **کنتم خیرا امۃ اخرجت للناس،تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر** تم بہترین امت ہو، جولوگوں کی بھلائی وخیرخواہی کے لئے پیدا کی گئی،تم لوگوں کو نیکی کا حکم کرتے ہواور بُرائی سے روکتے ہو(ال عمران:۱۱۰)

تاریخ گواہ ہے کہ گمراہی وبے دینی کے ہر دور میں اس پیغمبرانہ مشن کے تحت بزرگانِ دین اور سلفِ صالحین نے اصلاح وتجدید کے بے مثال اور لازوال کارنامے انجام دیئے، انقلاب واحتساب کی روشن وتابناک تاریخ مُرتب کی، اس کے برخلاف گذشتہ امتوں میں چوں کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ جاری تھا، ایک نبی کے گذر جانے کے بعد دوسرے نبی اور پیغمبران کے جانشین ہوا کرتے اور نبوت ورسالت کے مشن کو آگے بڑھاتے، اس لئے انفرادی حیثیت سے اوراجتماعی حیثیت سے بھی گذشتہ امتوں کے افراد دعوت وتبلیغ اور اصلاح وتجدید کی ایسی عظیم تاریخ نہیں بنا سکے، پس معلوم ہوا کہ ''ختمِ نبوت'' کی وجہ سے یہ اُمت اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس اور نبوت ورسالت کے فیوض وبرکات سے محروم نہیں ہوئی، بلکہ ''ختمِ نبوت'' کی برکت سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جیسے عظیم الشان پیغمبرانہ مشن کے اعزاز سے اس کو نوازا گیا، غورکرنا چاہیئے اگر ختمِ نبوت کا عقیدہ نہ ہوتا تو کیا یہ اعزاز اُس کو حاصل ہوتا ؟ کیا مسلمانوں میں ''دعوت وعزیمت'' کے تاریخ ساز کارنامے وجود میں آتے ؟؟ پس اس پیغمبرانہ مشن کی ادائیگی کے سلسلہ میں تاقیامت نیکی کی دعوت اور برائی سے ممانعت کی جتنی کوششیں اور کاوشیں جس پہلو اور جس حیثیت سے ہوتی رہیں گی وہ سب خاتم النبین ﷺ کی ''شان ختمِ نبوت'' کا مظہر ہوں گی اور اُن کو عقیدۂ ختمِ نبوت کا احسان وفیضان مانا جائے گا۔

۲- مضمون نگاری کے اس سفر میں راستہ کی جن دشواریوں اور پریشانیوں کا سامنا ہوا اُس کا اظہار شاید نامناسب نہ ہوگا، تاکہ اس کوچۂ میں مجھ جیسے نووارداس راہ کی حوصلہ شکنیوں کو

جھیلنے کے لئے پہلے ہی ذہنی طور پر تیار اور آمادہ رہے اور وہ نادانوں کی ناقدری کا شکوہ کر کے نا اُمید اور مایوس نہ ہو جائیں۔

حوصلہ افزائی یا قدر دانی، یہ وہ خارجی عمل ہے جس کی وجہ سے صلاحیت و قابلیت پروان چڑھتی ہے اور ترقی و کامیابی کی پرواز آسان ہوتی ہے، یہ گویا بالکل ایسے ہی ہے جیسے کسی زرخیز زمین میں پودا لگایا جائے، اس پودے کے پھل دار اور سایہ دار درخت بننے کے لئے صرف زمین کا زرخیز اور قابلِ کاشت ہونا کافی نہیں، بلکہ اُس پودے کی نشو و نما کے لئے ضروری ہے کہ وقت پر اُس کی سیرابی ہو، اُس کو صحیح آب و ہوا ملے، ایسا اگر نہ ہو تو باوجود زمین اچھی اور قابل کاشت ہونے کے پودا وقت سے پہلے مُرجھا جاتا ہے، اچھا لکھنے والوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، اگر انھیں حوصلہ افزائی کی ''آب و ہوا'' نہ ملے اور قدر دانی کے ذریعہ ان کی ''سیرابی'' نہ ہو تو ایسے باصلاحیت اور قابل مضمون نگار اپنی قوم اور معاشرہ کے لئے ''شجر سایۂ دار'' نہیں بن پاتے، شہنشاہِ رباعیات امجد حیدر آبادی کی زبان میں وہ کہتے ہیں:۔

ہے چرخِ ستم گار عجب دوں پرور
ہیں اہل کمال ناقصوں سے بدتر
ہے رویت ماہِ نو کا مشتاق جہاں
ماہِ کامل پہ کون کرتا ہے نظر

شروع شروع میں یہ عاجز مضمون اخبارات کو بھیجتا تو اُس کی اشاعت کی بھی جلدی رہتی تھی پھر اخبار والوں کا اپنا مزاج اور دماغ ہوتا ہے، مضمون کبھی شائع ہوتا کبھی نہیں ہوتا، مضمون کی اشاعت کے لئے بعض مرتبہ منت سماجت بھی کرنی پڑتی، اس کے باوجود بھی اگر شائع نہ ہو تو طبیعت میں جھن جھلاہٹ پیدا ہوتی کہ ''یہ بھی کوئی تُک ہے مغز ماری کر کے مضمون لکھو اور پھر اُس کو شائع کروانے کے لئے منت سماجت بھی کرو'' پھر جب رفتہ رفتہ کچھ مضامین شائع ہوئے اور خوش قسمتی سے قارئین کو بھی پسند آئے تو اخبار والوں نے بھی پذیرائی کی، خود اخبار کے دفتر سے

فون آیا کرتے تھے کہ کیا ہوا بھائی! بہت دن ہو گئے، کوئی نیا مضمون تیار ہے تو بھیجئے، اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً اپنے اساتذہ، بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں کی طرف سے حوصلہ افزائی بھی ہونے لگی، اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت دراصل ان ہی حوصلہ افزائیوں اور کرم فرمائیوں کا نتیجہ ہے۔

قارئین کو یہ غلط فہمی اور بدگمانی نہیں ہونی چاہیے کہ یہاں ''اپنے منہ میاں مٹھو'' بن کر اپنی صلاحیت کا ڈھونگ رچایا جارہا ہے، یا اپنی قابلیت کا ڈھنڈورا پیٹا جارہا ہے، واللہ، باللہ، تاللہ..... اور آگے جتنے قسمیہ الفاظ ہوسکتے ہیں، آپ بڑھا لیں، یہاں ایسا کچھ نہیں ہے بات اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی صرف اتنی ہے کہ جنہوں نے مضمون نگاری کی راہ میں قدم رکھا ہے یا جو رکھنا چاہتے ہیں وہ زمانہ کی ناقدری اور ماحول کی حوصلہ شکنی سے پست ہمت نہ ہوں، ہمت سے کام لیں، بلند حوصلگی کے ساتھ اپنا قلمی سفر یوں جاری رکھے کہ: ؂

بن خود اپنے سفینہ کا ناخدا اے دوست
بلند حوصلے ہواؤں کا رخ بدل دیتے ہیں

۳- مجموعۂ مضامین کی اشاعت کے اس پُر مسرت موقع پر احسان مندی، احسان شناسی اور شکر گذاری کا تقاضہ ہی نہیں بلکہ طالب علمانہ فریضہ ہے کہ اپنے اُن محسن و مشفق اساتذہ کرام کا ذکر خیر کیا جائے جن کی خاص تربیت اور خصوصی شفقت و حوصلہ افزائی کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کا شعور اور شوق پیدا ہوا، ان بڑوں اور بزرگوں کی رہبری و رہنمائی نے ''قلمی سفر'' میں ''سگنلس'' اور ''سنگِ میل'' کا کام کیا....... چنانچہ اس سلسلہ میں میں سب سے پہلے اپنے بڑے بھائی گرامی قدر مولانا مفتی اسعد اللہ قاسمی صدر مدرس ادارۂ اشرف العلوم کا ذکر کرنا چاہوں گا کہ انھوں نے شعبہ عالمیت کی تعلیم کے دوران بالکل ابتدائی مرحلہ میں قلم پکڑنے کا حوصلہ دیا، اس کے بعد باضابطہ مضمون نگاری کا ذوق پیدا کرنے اور اُس کو پروان چڑھانے میں میرے مشفق و محسن، استاذِ محترم، ممتاز عالمِ دین اور مایۂ ناز ادیب حضرت مولانا احمد عبد المجیب قاسمی ندوی ناظم دار العلوم سیاٹل امریکہ و سابق استاذ شعبہ عربی دار العلوم سبیل السلام حیدر آباد کا نہایت اہم

اور بنیادی کردار رہا، آپ طلبہ عزیز کے ہر دل عزیز اساتذہ میں سے تھے، نہ صرف اچھا لکھنے کی تربیت فرماتے، بلکہ اچھا لکھنے کے لئے ''اچھا قلم'' بھی خود ہی اپنے پیسوں سے شہر کی قدیم اور مشہور دوکان ''دکن پن اسٹور عابڈس'' سے لاکر دیتے، آپ نے ابتداء میں عربی میں لکھنے کی عادت ڈالی، اس کے لئے دوپہر کے وقفہ میں آپ کے یہاں ندوۃ العلماء کا ہفت روزہ عربی ترجمان ''الرائد'' اور تنظیم رابطہ عالمِ اسلامی کا ترجمان ''**العالم الاسلامی**'' پڑھنے کا معمول تھا، اس کے علاوہ ''الیومیة'' کے عنوان سے عربی میں روزنامچہ بھی لکھوایا کرتے تھے، اس مجموعۂ مضامین کی اشاعت وطباعت دراصل حضرت مولانا ہی کی خصوصی توجہ کی مرہونِ منت ہے۔

1999ء میں مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند سے فضلیت کی تکمیل کے بعد اس عاجز کی خوش نصیبی رہی کہ اس کو بلند پایۂ فقیہ، نامور صاحبِ قلم اور مایۂ ناز مصنف، حضرت الاستاذ، مشفق ومربی حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی ناظم المعہد العالی الاسلامی کی خصوصی توجہ اور تربیت نصیب ہوئی، اس تربیت اور شفقت کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کے ذوق میں ترقی ہوئی اور تحریر میں نکھار وسدھار آیا، حضرت مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سے احقر نے ''قلم پکڑنا'' سیکھا تو آپ سے ''قلم چلانا'' سیکھا، حضرت الاستاذ ہی کے حکم پر اختصاص فی الدعوۃ کی دوسالہ تعلیم کے لئے احقر نے علم وتحقیق اور تربیت تصنیف وتالیف کے مشہور ومعروف ادارہ ''المعہد العالی الاسلامی'' میں داخلہ لیا، یہ معہد کے قیام کا پہلا سال تھا، شعبہ دعوہ میں حضرت الاستاذ کے یہاں ''شبہات حول الاسلام'' کا گھنٹہ ہوا کرتا تھا، اس گھنٹہ میں آپ قرآن وحدیث، سیرت نبوی، فقہ اسلامی اور تاریخِ اسلامی سے متعلق متشرقین کے اعتراضات لکھواتے اور پھر مختلف اردو وعربی کتابوں کی مدد سے ان کے جوابات لکھنے کا حکم فرماتے، بعض مرتبہ اعتراضات کے جوابات لکھنے میں کئی ایک صفحات سیاہ ہوجاتے اور یہ جوابات مستقل مضمون کی شکل اختیار کرجاتے، دارالعلوم دیوبند سے عرفی فراغت کا زمانہ بالکل نیا نیا تھا، اس لئے مادرِ علمی کے خاص شعار وشناخت ''احقاقِ حق وابطالِ باطل'' کے جذبہ کی بناء جوابات لکھنے کے دوران موقع بے موقع ''رگِ قاسمیت'' بھڑک

جاتی تھی، حضرت الاستاذ مولانا رحمانی اپنے خاص منہج اور مزاج کے مطابق بڑی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ اُس کی اصلاح فرماتے، اس طرح آپ کی اصلاح وتربیت کی دوش پر ''قلم چل پڑا'' یہ کہنا تو میرے لئے ''خوش فہمی'' ہی نہیں بلکہ ''خودفریبی'' ہوگی کہ میری تحریروں میں حضرت الاستاذ کی تحریروں کا رنگ ہوتا ہے لیکن جب آپ کے بعض خاص شاگردوں کے تأثرات سنے کہ ''میاں! تمہاری تحریر میں حضرت مولانا کی تحریروں کی جھلک نظر آتی ہے'' اگرچہ طالب علمانہ کاہلی اور کوتاہی کی وجہ سے آپ سے بھرپور کماحقہ استفادہ کی توفیق نہیں ہوئی، مگر اس تأثر کے بعد محسوس ہوا کہ کچھ تو حضرت الاستاذ کی تعلیم وتربیت کی لاج رکھی ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

۴- اس کے علاوہ یہ عاجز اپنے ان تمام اساتذہ کرام کا بھی شکرگذار اور احسان مند ہے جن سے ''نورانی قاعدہ'' سے لے کر تعلیم سے رسمی فراغت تک ایک حرف بھی پڑھا اور سیکھا ہے اپنی اس کاوشِ قلم کو دارالعلوم سبیل السلام حیدرآباد، دارالعلوم دیوبند یوپی اور المعہد العالی الاسلامی جیسی تعلیمی وفکری اور تربیتی درسگاہوں کا فیض سمجھتا ہے، جو اساتذہ کرام اس دارِ فانی سے رخصت ہوگئے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی قبروں کو نور سے بھر دے، ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے، جو اساتذہ کرام باحیات ہیں، اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان کی زندگیوں میں خیر وبرکت عطا فرمائے، ان کی بلند پایۂ خدمات کو دیر اور دور تک کے لئے قبول فرمائے۔

۵- بہر حال مختلف مہینوں اور سالوں کے وقفہ سے اخبارات اور ماہناموں میں شائع شدہ متفرق مضامین کی اگر یہ نئی صورت گری نہیں ہوتی تو یہ پھر ''طاق نسیاں'' کی زینت اور ''اوراقِ پریشان'' کی علامت ہوتے، اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت سے یہ مضامین مستقل کتابی شکل میں شائع ہورہے ہیں، دعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ محض اپنے فضل وکرم سے اس کو اپنی بارگاہِ عالی

میں قبول فرمائے، اس کا نفع عام وتام فرمائے، جن مخلصین اور اہل خیر نے اس کی طباعت میں تعاون کیا ہے، اللہ تعالیٰ انھیں دنیا وآخرت کی بھلائی اور سعادت عطا فرمائے، مصنف اور اُس کے والدین کے لئے اس مجموعہ کو اپنی رضاء وخوشنودی کا ذریعہ بنائے، اس لئے کہ خوشنودی رب ہی سب سے بڑی نعمت ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی بھی، ورضوان من اللہ اکبر، ذالك هو الفوز العظيم

۴/صفر المظفر ۱۴۳۸ھ
مطابق 5/نومبر 2016ء

محمد انصار اللہ قاسمی
خادم مجلس تحفظ ختم نبوت
واستاذ المعہد العالی الاسلامی
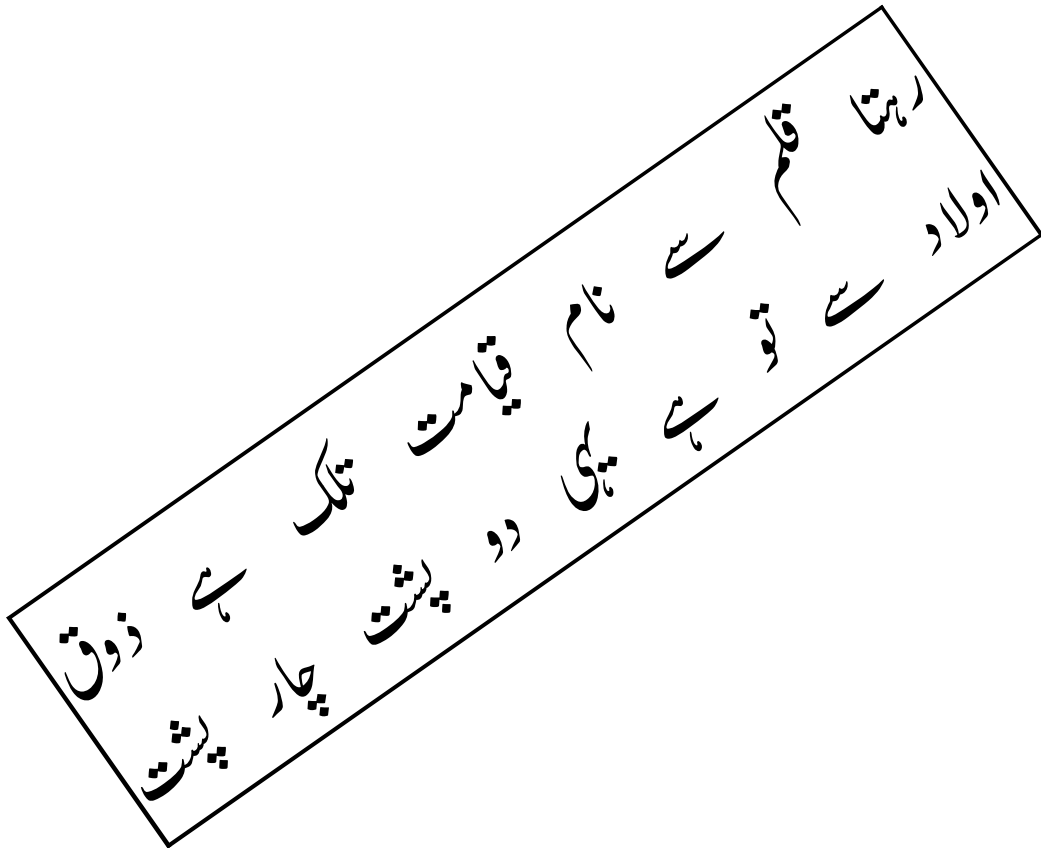
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی، جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانۂ خراب کو، ترے عفوِ بندہ نواز میں

پروردگار کے دربار میں

بندے ہوا گر رب کے تو رب سے مانگو!

اللہ تعالیٰ کی ذات کا تصور، اس کی طاقت وقدرت، عزت وعظمت اور محبت وشفقت سے متعلق تعلیمات تمام مذاہب میں موجود ہیں، اسلام کے علاوہ جن مذاہب میں یہ تعلیمات ہیں وہ خودساختہ اور من گھڑت ہیں، مثلاً یہ کہ عیسائی مذہب میں تین خداؤں کا تصور ہے تو ہندو برادرانِ وطن کے یہاں تین کڑ ور خداؤں کا عقیدہ ہے، یعنی ''جتنے کنکر اُتنے شنکر''، بعض مذاہب میں خدا تعالیٰ کی مہربانی ورحم دلی اور شفقت ونرمی کا ایسا تصور دیا گیا کہ وہ (نعوذ باللہ) مجبور ومعذور نظر آنے لگے، کچھ مذاہب میں اللہ تعالیٰ کی طاقت وقدرت ایسی بتائی گئی کہ وہ بالکل غصہ اور سختی کے پیکر معلوم ہو، الفت ومحبت کا مادّہ ہی جس میں نہ ہو، (العیاذ باللہ) اس طرح کے فرسودہ اور ازکارِ رفتہ تصورات وتعلیمات اللہ تعالیٰ کی بلند و برتر ذات سے ذرّہ برابر میل نہیں کھاتے، خود باری تعالیٰ کا فرمان ہے: وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ۔ (سورۃ الانعام: آیت ۹۲)

اسلام دین برحق ہے، تمام آسمانی مذاہب کا آخری ایڈیشن ہے، اس وجہ سے وہ کامل ومکمل بھی ہے، وہ خدا تعالیٰ کا پسندیدہ اور منتخب دین ہے، افراط وتفریط سے پاک، عدل واعتدال کا حامل اور حامی ہے اور داعی بھی، اللہ تعالیٰ نے تمام مذاہب میں اسلام کو ''سندِ قبولیت'' دی فرمایا: اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ دین تو بس اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے۔ (سورۃ آل عمران: آیت ۱۹)

زندگی میں انسان مختلف مراحل اور مسائل سے گزرتا ہے، مسائل ومشکلات جہاں اس کو درپیش ہوتے ہیں وہیں خوشی ومسرت کے احوال بھی اس کا استقبال کرتے ہیں، راحت وآسانی، مشکل وپریشانی اور خوشی وغم ہر موقع پر اسلام انسان کی رہبری ورہنمائی کرتا ہے، زندگی میں ''نعمتِ غیر مترقبہ'' اگر مل جائے تو آدمی خوشی سے پھولے نہ سمائے، حدیث میں اس کی بہت اچھی مثال بیان کی گئی ہے کہ ایک شخص جنگل وبیابان کا سفر کرتا ہے، کسی ضرورت کی بنا پر وہ اپنی سواری اونٹ سے کچھ دیر کے لیے الگ

ہوتا ہے، اسی اثناء میں اس شخص کی سواری اس سے دور ہوگئی اور اونٹ گم ہوگیا، اسی اونٹ پر اس کا زادِ سفر بھی تھا، اب یہ بے چارہ مسافر بہت ہی غمگین وافسردہ ہوکر درخت کے سایہ میں لیٹ جاتا ہے، سواری اور زادِ سفر کی فکر اس کو سلا دیتی ہے، کچھ دیر بعد نیند سے بیدا ہوکر کیا دیکھتا ہے کہ اس کا اونٹ زادِ سفر لیے اس کے قدموں کے پاس کھڑا ہے، اس کو دیکھ کر وہ "شکریہ" کے الفاظ یوں ادا کرتا ہے: **اَللّٰھُمَّ اَنَا رَبُّکَ وَ اَنْتَ عَبْدِیْ** اے اللہ میں آپ کا رب ہوں اور آپ میرے بندے ہیں، خوشی کے مارے اس شخص سے جملوں کی ترتیب صحیح ادا نہیں ہوگی، وہ یوں کہنا چاہتا تھا کہ **اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ وَ اَنَا عَبْدُکَ** حد درجہ خوشی میں اس نے غلطی کی، (صحیح مسلم/ ریاض الصالحین، ص: ۱۲ باب التوبہ)

اسی طرح جب "بلائے ناگہانی" آپڑے تو انسان سب کچھ بھول کر، ہر ایک سے یکسو ہوکر صرف اللہ ہی سے لو لگاتا ہے، اسی کی چوکھٹ پر جبین نیاز خم کرتا ہے، اپنا ماتھا ٹیکتا ہے، قرآن مجید میں مشرکین کے حوالہ سے بتایا گیا کہ دریائی سفر میں جب ان کی کشتی بھنور میں پھنستی ہے، ہچکولے کھانے لگتی ہے تو انہیں فوراً خدا یاد آتا ہے، اس وقت وہ اپنے تمام معبودانِ باطل کو بھول کر اور ٹھکرا کر صرف خدائے واحد کو پکارتے ہیں، پھر جیسے ہی اللہ تعالیٰ ان کی کشتی کو طوفان سے بچا کر خشکی پر لے آتے ہیں تو یہی مشرکین اپنی پرانی روش پر آجاتے ہیں، وہی کفر وانکار اور وہی ناشکری واحسان فراموشی کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ (سورہ یونس: آیت ۲۲ تا ۲۳) صرف مشرک اور کافر کا مسئلہ نہیں، بلکہ ہر انسان کی یہ فطری کمزوری ہے کہ وہ صرف مصیبت وتکلیف میں اپنے خالق و پروردگار کو یاد کرتا ہے اور راحت وآرام میں بھول جاتا ہے۔ (سورہ یونس: آیت ۱۲)

راحت ومصیبت کے مواقع پر اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کی کیفیت وحالت کو اسلام میں "دعا" کہتے ہیں، دعا کیا ہے؟ درحقیقت اعلان ہے اللہ تعالیٰ کی بے پناہ بڑائی وکبریائی کا اور اپنی بے انتہاء بے چارگی، بے بسی اور غلامی کا، اظہار ہے، خدا تعالیٰ کی ناقابل تصور شانِ غناء وبے نیازی کا اور اپنی کمالِ عاجزی، انکساری اور محتاجی ودرماندگی کا، اسلام میں عبادت وبندگی کے جتنے آداب اور فرائض و واجبات کے جتنے احکام ہیں وہ سب دعا ہی کی شکلیں ہیں، صرف الفاظ کا فرق ہے، عبادت وبندگی میں ذلت ومسکنت کی مطلوبہ صورت دعاء میں بھی پائی جاتی ہے، حدیث میں مروی ہے کہ: **الدعاء**

هو العبادة ،دعاءعبادت ہی ہے، پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ: **اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَکْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَھَنَّمَ دَاخِرِیْنَ** ۔(سورۃ مؤمن: آیت ٦٠)

دنیا کا تجربہ اور مشاہدہ تو یہ ہے کہ ایک مرتبہ اگر کسی کے سامنے اپنی ضرورت کا اظہار کرے پھر دوبارہ کچھ مانگنے اور طلب کرنے میں شرمندگی وندامت کا احساس ہوتا ہے،بعض مرتبہ دینے والا خود بھی بادلِ ناخواستہ دیتا ہے،لیکن اللہ تعالیٰ کی بخشش ونوازش اور لطف وعطا کا انداز ہی نرالا ہے، وہ مانگنے سے خوش ہوتا ہے نہ مانگنے پر ناراض ہوتا ہے،اس کے خزانوں میں کمی نہیں،طویل حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے ارشاد فرماتے ہیں:''اے میرے بندو! اگر تمہارے پہلے لوگ اور بعد میں آنے والے لوگ، جوانسان ہیں وہ بھی اور جو جنات میں سے ہیں وہ بھی،سب کے سب ایک ہی چٹیل میدان میں جمع ہوجائیں اوران میں کا ہر شخص اپنی الگ الگ ضرورت کا اظہار کرنے لگے اور مجھ سے سوال کرے اور میں ان میں سے ہر ایک کے سوال کو پورا کردوں تب بھی میرے خزانوں میں اتنی بھی کمی نہیں ہوتی جتنی کہ سوئی سمندر میں ڈبودی جائے اور دیکھے کہ اس کے ناکہ میں کتنا پانی آیا ہے۔'' (ریاض الصالحین باب المجاهدة) نماز،روزہ،زکوٰۃ اور حج جتنی بھی بڑی عبادتیں ہیں کسی نہ کسی خاص وقت کے ساتھ متعین اور زمانہ کے ساتھ مخصوص ہیں، دعا کا معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ بندہ جب چاہے اور جہاں چاہے خدا کی بارگاہ میں اپنی عرضی اور درخواست پیش کرسکتا ہے،تاہم احکم الحاکمین کی بارگاہ میں رسائی کے جو حدود وآداب ہیں ان کی رعایت وپابندی بھی ضروری ہے،اس لیے کہ دعا لاپرواہی، لاابالی اور بغیر توجہ ویکسوئی کے قبول نہیں ہوتی۔

احادیث میں ایک سے زائد مرتبہ دعا کے فضائل وآداب کو بتاکر آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ہر چیز اللہ سے مانگا کرو، اگرچہ وہ جوتے کا تسمہ کیوں نہ ہو۔ یہ بھی آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جس شخص کی یہ خواہش وآرزو ہو کہ اللہ تعالیٰ مصیبت وتکلیف میں اس کی دعا کو قبول کرے، اس کو چاہیے کہ وہ وہ راحت وفراخی میں بھی اللہ کو یاد رکھے،حدیث میں بتایا گیا ''دعا عبادت کا مغز ہے'' پس عبادت وبندگی کے جس طریقہ میں خالق کائنات سے التجاء والتماس نہ ہو،تضرع وگریہ زاری نہ ہو،ایسی عبادت وریاضت بے کیف وبے مزہ ہوتی ہے،اس لیے کہ دعا عبادت کی تکمیل وتتمہ ہے۔ **الدعاء مخ العبادة**......

اسلام کے نظامِ زندگی اور طرزِ معاشرت میں بندہ کو کبھی بھی اپنے مالک وآقا سے الگ علیحدہ نہیں رکھا گیا اور نہ خالق و بندہ کے درمیان ایسے واسطے، خودساختہ دوریاں اور حدبندیاں قائم کی گئی کہ بندہ کی اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں رسائی ہی مشکل ہوجائے، چنانچہ جب بھی مسلمان اچانک کسی پریشانی میں پڑ جائے یا شدید ہنگامی ضرورت پیش آجائے تو وہ فوراً "صلوٰۃ الحاجۃ" پڑھتا ہے، بارگاہِ خداوندی میں اپنی ضرورت و پریشانی کا اظہار کرتا ہے، اسی طرح اگر کوئی اہم معاملہ یا مسئلہ درپیش ہوتو اس کو نمازِ استخارہ پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ اس کے علاوہ احادیث کی کتابوں میں "کتاب الدعوات" کے عنوان سے جتنی دعائیں ہیں یا اردو زبان میں دعا کے جتنے مجموعے اور کتابچے ہیں ان پر آپ اگر سرسری نظر بھی ڈال لیں تو اندازہ ہوگا کہ سونے جاگنے، کھانے پینے پہنے، چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے غرض یہ کہ ہر ہر موقع کی دعا موجود ہے، روزمرہ کی زندگی کا شاید ہی کوئی لمحہ یا لحظہ ہو جس کے لیے اسلام میں دعا نہ ہو، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے ایک مرتبہ کسی یہودی نے طنزیہ انداز میں کہا کہ تمہارے پیغمبر بھی کیسے پیغمبر ہیں کہ ہر ہر بات تمہیں بتاتے ہیں، یہاں تک کہ قضائے حاجت کے وقت کیا پڑھنا چاہیے اور کیسے بیٹھنا چاہیے؟ یہ بھی بتاتے ہیں؟ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ذرّہ برابر مرعوب ہوئے بغیر کہتے ہیں: ہاں کیوں نہیں، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ہر بات کی تعلیم دیتے ہیں، اگرچہ وہ چھوٹی اور معمولی ہی کیوں نہ ہو اور یہ دین اسلام کے کامل و مکمل ہونے کی دلیل ہے، غرض یہ کہ اسلام میں دیگر مذاہب کی طرح خدا اور بندہ کا تعلق محض رسمی اور خانہ پُری کے طور پر نہیں بلکہ اتنا مضبوط و پختہ ہے کہ وہ ہر آن انسان کو اپنے خالق و مالک سے جوڑے رکھتا ہے اور دعا کے عمل سے اپنے رب کو ماننے، منانے اور اس سے مانگنے کا جذبہ پیدا بھی کرتا ہے اور بیدار بھی رکھتا ہے۔

روزنامہ منصف ۷ رجنوری ۲۰۰۵ء

دعاء —— آداب واحکام

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ’’والله الغني وانتم الفقراء‘‘ (محمد:۳۸)اللہ تعالیٰ غنی وبے نیاز ہیں اورتم وفقیر ومحتاج ہو،ظاہر سی بات ہے جب ہم فقیر اور محتاج ہیں تو ہمیں اپنی ضرورتوں کی تکمیل،مصیبتوں سے چھٹکارا اور آزمائشوں سے نجات پانے کے لئے اپنے پروردگار و پالنہار کے دربار میں بصد عجز ونیاز رجوع ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا طریقۂ کار اور چارۂ کار نہیں ہے، دنیا کا کوئی کتنا ہی امیر ترین اور طاقتور شخص کیوں نہ ہو،مصیبت وامتحان کے وقت اُس کو خدا ضرور یاد آتا ہے،اللہ تعالیٰ کے دربار میں رجوع ہونے کی کیفیت اور حالت کو دین وشریعت کی اصطلاح میں ’’دعاء‘‘ سے تعبیر کیا جاتا ہے،بارگاہِ الٰہی میں دعاء کی قبولیت کے کچھ آداب واحکام بھی ہیں۔

بارگاہ خداوندی میں دعاء کے قبول ہونے کے لیے یہ بات انتہائی اہم اور ضروری ہے کہ وہ مناسب سلیقہ اور بہتر طریقہ سے کی جائے،دعا میں کیا مانگنا چاہیے؟ اور کیسے مانگنا چاہیے؟ اس کی ہدایات احادیث میں جابجا ملتی ہیں،اس لیے کہ دنیا میں ایک معمولی عہدیدار،افسر اور صاحبِ منصب کے یہاں اپنی کسی ضرورت سے پہونچنا ہو تو ضرورت مند پہلے اپنے ’’حواسِ خمسہ‘‘ کو یکجا اور منجمد کرتا ہے،اپنے حرکات وسکنات کو مکمل قابو میں رکھتا ہے کہ مبادا کھجلانے،انگلیاں چٹخانے اور اِدھر اُدھر نظر دوڑانے وغیرہ ایسی کوئی حرکت سرزد نہ ہوجائے جو ’’مزاجِ شاہانہ‘‘ کو گراں اور ناگوار گزرے،اسی طرح تحریری طور پر اگر کوئی عرض معروض کا موقع ہو تو،پیش کی جانے والی درخواست میں الفاظ کے نوک وپلک اور بال وپر درست اور ٹھیک کیے جاتے ہیں،آداب والقاب پر ایک سے زائد مرتبہ نظرثانی ہوتی ہے،ہاتھ سے لکھنے کے بجائے کمپوزنگ کی جاتی ہے،اس پر بھی اگر اطمینان نہ ہو تو ماہر خوشنویس کو زحمتِ کتابت دی جاتی ہے،آخر میں ’’مزاج خسروانہ‘‘ اور ’’ذوقِ لطیف‘‘ کی بھرپور رعایت اور پابندی کرتے ہوئے درخواست کو خوشنما بیل بوٹوں سے سجایا اور سنوارا جاتا ہے،............ خدائے بزرگ وبرتر جو احکم الحاکمین ہے،کل کائنات کا تنہا مالک ہے،جیسے اپنی ذات میں اکیلا ہے،

ایسے ہی اپنی عظیم تر سلطنت ،حکومت وفرماں روائی میں یکتا ویگانہ ہے،اس کی عظیم بارگاہ اور دربارِ عالی سے رجوع کے وقت بندۂ مؤمن پر لازم ہے کہ جھکاؤ اور بچھاؤ کی آخری کیفیت اختیار کرے،تواضع وانکساری ،عاجزی وفروتنی اور غلامی کی آخری انتہائی حالت جس کے بعد غلامی کا تصور ہی نہیں اس کو وہ ظاہر کرے۔

اللہ عزوجل کے بعد کائنات کی مقدس ترین ہستی آنحضرت ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے، کائنات کی یہ افضل وبلند ترین ہستی ﷺ خدا کی بارگاہ میں دعا کے لیے جب ہاتھ اٹھاتی تو زبانِ مبارک سے نکلنے والے ذلت ومسکنت کے الفاظ اور عاجزی وانکساری کے کلمات سے عرشِ الٰہی لرز اٹھتا ،دعا میں آپ ﷺ یوں گویا ہوتے کہ :اَللّٰھُمَّ اِنِّیۡ اَسۡئَلُکَ مَسۡئَلَةَ الۡمِسۡکِیۡنِ (اے اللہ ! جیسے مسکین مانگتا ہے ایسے ہی میں آپ سے سوال کرتا ہوں) غزوۂ بدر میں تمام جنگی تدابیر اختیار کرنے کے بعد دورانِ دعا آپ ﷺ کے سوز وگداز کی کیفیت یہ تھی کہ ردائے مبارک آپ ﷺ کے کندھوں سے اتری جارہی تھی ، وزیرخاص اور رفیق غار حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو عرض کرنا پڑا کہ اے اللہ کے رسول !بس کیجئے! اللہ آپ کو نا امید ومایوس نہیں کرے گا،سفر طائف کے موقع پر باری تعالیٰ کے حضور آپ ﷺ کی مناجات احادیث کی کتابوں میں موجود اور محفوظ ہیں ،یہ مناجات عبدیت وفنائیت کے اعلیٰ ترین شاہکار ہیں ،پس تواضع وانکساری عاجزی وفروتنی ،بے بسی اور بے چارگی کا اظہار دعا کے قبول ہونے کا پہلا مرحلہ ہے۔

رہا یہ مسئلہ کہ اللہ سے کیا مانگنا چاہیے؟ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ سے عافیت طلب کرو: سَلُو اللّٰہَ الۡعَافِیَةَ(ریاض الصالحین کتاب الدعوات)عافیت دراصل ہر طرح کی بہتری اور بھلائی کو شامل ہے،انسان چاہے فقر وفاقہ میں ہو کہ مالداری یا معاشی خوشحالی میں ،اطمینان اور سکونِ قلب اس کے لیے ضروری ہے،تب ہی وہ آرام وعافیت میں رہ سکتا ہے،آپ ﷺ کے دعائیہ کلمات جامع ہوا کرتے تھے ،جس میں دنیا وآخرت کی ہر بھلائی وکامیابی شامل ہوتی ،حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ اکثر یہ دعا فرماتے کہ :رَبَّنَا اٰتِنَا فِیۡ الدُّنۡیَا حَسَنَةً وَ فِیۡ الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (ریاض الصالحین کتاب الدعوات) امّ المومنین حضرت امّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ آپ ﷺ زیادہ تر کیا دعا فرمایا کرتے تھے؟ انہوں نے بتایا کہ آپ ﷺ اپنی دعاء میں اکثر فرماتے کہ: ”یَا مُقَلِّبَ الۡقُلُوۡبِ ثَبِّتۡ قَلۡبِیۡ عَلٰی دِیۡنِکَ (حوالہ سابق)اے دلوں کے پھیرنے والے ! میرے دل

کو اپنے دین پر جما دے'' اس کے علاوہ بعض خاص مواقع اور حالات کے لیے دعائیں منقول ہیں، دعائیہ کلمات کے جامع ہونے کی مثال بعض اہل لطائف نے یہ لکھی ہے کہ ایک شخص کو درازیٔ عمر، اپنے فرزند کے لیے اولاد اور فقر و فاقہ و تنگدستی سے نجات کی دعا کرنا تھا، اس نے ان الفاظ میں دعا مانگی:

''اے اللہ! مجھے اتنی عمر عطا فرما کہ میں اپنے پوتروں کو سونے کے پیالوں میں چاندی کے چمچوں سے دودھ پیتے دیکھوں۔''

دعا کے آداب میں سے یہ بھی ہے کہ دعا کے قبول ہونے کے لیے آدمی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے، پرامید ہونا چاہیے، ناامیدی اور مایوسی قریب بھٹکنے بھی نہ پائے، فرمانِ رسالت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کی ہر دعا کو قبول کرتے ہیں جب تک کہ وہ جلد بازی نہ کرے، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: جلد بازی کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دعا مانگے، پھر کچھ دنوں بعد کہنے لگے: میں نے اللہ تعالیٰ سے یہ مانگا تھا وہ مانگا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ عطا ہی نہیں فرمایا، اس کے بعد اس نے دعا مانگنا ہی چھوڑ دیا (حوالۂ سابق) اصل میں دعا کی قبولیت کی یہ ایک ہی صورت نہیں کہ جس وقت جو چیز دعا میں مانگی جائے وہ اسی موقع پر مل جائے، اللہ تعالیٰ کی ذات چوں کہ علیم و خبیر ہے، وہ بندہ کی شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے اس لئے وہ رَگ رَگ سے واقف ہیں، اس لیے جو چیز جس موقع پر اس کے لیے مناسب اور بہتر ہے وہی اس کو عطا فرماتے ہیں، االلہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتے وقت بندہ کی مثال اس چھوٹے سے بچے کی سی ہے جو اپنے نفع و نقصان کو جانے بوجھے بغیر اپنے والد سے ہر چیز طلب کرنا شروع کر دے لیکن والدین اس کو وہی چیز دیتے ہیں جو اُس کے لئے مناسبِ حال ہوتی ہے، دعا کے قبول ہونے کی علماء نے تین صورتیں لکھی ہیں: ایک یہ کہ دعا میں جو چیز مانگی جائے اگر وہ باری تعالیٰ کے علم میں بندہ کے لیے مناسبِ حال ہو تو وہ چیز اسی وقت عطا کر دی جاتی ہے، دوسرے یہ کہ اگر ایسا نہ ہو تو اس دعا کے بدلے بندہ پر آنے والی مصیبت و پریشانی کو ختم کر دیا جاتا ہے، یہ بھی دعا کی قبولیت ہی کی ایک صورت ہے، تیسرے یہ کہ اگر یہ بھی نہ ہو تو یہ دعا بندہ کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوتی ہے، آخرت میں اس دعا کا بدلہ اتنا زیادہ ہوگا کہ بندہ تمنا کرے گا کہ کاش میری تمام دعائیں محشر ہی میں قبول ہوتیں۔

دعا صرف اپنی ذات کے لیے نہ مانگی جائے، بلکہ پوری انسانیت کو دعا میں یاد کیا جائے، ایک دیہاتی صحابی مسجدِ نبویؐ میں آئے اور یوں دعا کرنے لگے: ''اے اللہ مجھ پر اور محمد ﷺ پر رحم فرمایئے''

آپ ﷺ نے سن کر فرمایا کہ تم نے اللہ کی رحمت کو محدود کر دیا، ضروری نہیں کہ جس کو ہم دعا میں یاد کریں وہ ہمارے ساتھ ہو یا سامنے موجود ہو، کسی کے پیٹھ پیچھے دعا کرنا بھی باعثِ فضیلت ہے، حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کی دعا اپنے بھائی کے پیٹھ پیچھے قبول ہوتی ہے، جس وقت وہ دعا کرتا ہے تو اس کے سرہانے ایک فرشتہ متعین ہوتا ہے، پھر جب وہ اپنے بھائی کے واسطے خیر کو طلب کرتا ہے تو فرشتہ اس پر ''آمین'' کہتا ہے، پھر مزید کہتا ہے کہ: **وَلَکَ بِمِثْلٍ** تجھے بھی یہ خیر نصیب ہو۔ (حوالۂ سابق) دعا کی قبولیت کے لیے حلال روزی شرطِ اوّل ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ آدمی دعا کے وقت ''یا ربی'' ''یا ربی'' پکارتا ہے، حالانکہ اس کا کھانا حرام ہے، اس کا پینا حرام ہے، اس کا پہننا حرام، جو چیز حرام کمائی سے پلی ہے تو کیسے اس کی دعا قبول ہوگی؟

ملتِ اسلامیہ اس وقت جن نازک حالات سے گزر رہی ہے ہم میں کا تقریباً ہر فرد نہ صرف ان سے واقف ہے بلکہ اپنی دانست میں ان حالات کا بہترین ''تجزیہ نگار'' بھی ہے، شاید ہی کوئی تقریر و تحریر ہو جس میں حالات کا ماتم و مرثیہ نہ ہو، ایسے حالات میں اہل ایمان کو جہاں مادّی ہتھیاروں سے مسلح ہونا ہے وہیں ضروری ہے کہ ''دعا'' کے ہتھیار سے بھی وہ لیس ہوں، نبی ﷺ کا ارشاد ہے: **اَلدُّعَاءُ سَلَاحُ الْمُؤْمِنِ** دعا مؤمن کا ہتھیار ہے، دعا اور دوا دونوں اسوۂ نبی ﷺ ہے، صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی خوبی اور خصوصیت بھی یہی تھی کہ وہ دن کے شہسوار اور رات کے شب بیدار اور تہجد گزار ہوتے: **فُرْسَانٌ فِيْ النَّهَارِ وَرُهْبَانٌ فِيْ اللَّيْلِ** شہسواری کے تعلق سے صحیح یا غلط بہر حال فکر ہو رہی ہے، لیکن اس کے ساتھ ''شب بیداری'' کی طرف بھی توجہ کی ضرورت ہے، تب ہی مسلمان ''غیر کے آگے ہاتھ پھیلانے'' ''کشکول گدائی'' لے کر پھرنے اور دوسروں کی ''کاسہ لیسی'' کرنے سے محفوظ رہ سکتے ہیں، دعا کے آداب واحکام کو حضرت امجد حیدر آبادیؒ نے اپنی مشہور رباعی میں یوں جمع کیا ہے: ؎

ہر چیز مسببِ الاسباب سے مانگو
ادب سے، منت سے، سماجت سے مانگو
کیوں غیر کے آگے ہاتھ پھیلا تے ہو
بندے ہو اگر رب کے تو رب سے مانگو

روزنامہ منصف ۷؍جنوری ۲۰۰۵ء

توبہ ـــــــ گناہوں کا تریاق

قرآن مجید میں جہاں انسان کو زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب قرار دیا گیا، اسی کے ذیل میں بعض جگہ حضرت آدم علیہ السلام کی بھول چوک کو بیان کیا گیا، حضرت آدم اور حضرت حوا کو اللہ تعالیٰ نے گیہوں کے درخت کے پاس جانے سے منع فرما دیا تھا لیکن شیطان ان دونوں بزرگوں کو بہلا پھسلا کر درخت کے قریب لے گیا، اس کے نتیجہ میں دونوں کا جنتی لباس اتر گیا اور وہ دونوں جنت سے نکال دیے گئے، پھر حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائے، خوب گریہ وزاری کی، روئے دھوئے اور اللہ سے معافی طلب کرتے ہوئے یہ دعاء والتجاء کی کہ:

> ''اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا، اگر آپ نے ہمیں معاف نہیں کیا تو ہم نقصان وگھاٹے میں رہ جائیں گے''

(سورۃ الاعراف: ۲۳)

حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ بھول چوک، گناہ اور غلطی کا صدور انسانی مزاج اور طبیعت کا ''حصہ'' ہے، نیز یہ بھی پتہ لگا کہ بھول چوک کا احساس، گناہ اور غلطی کا اعتراف یہ بھی انسانی فطرت ہی کا ''خاصہ'' ہے، غلطی اور جرم ابلیس نے بھی کی لیکن وہ اپنی غلطی پر اڑا اور جما رہا، اس کی وجہ سے وہ خدا تعالیٰ کا مبغوض ومردود بن گیا، جب کہ غلطی کے اعتراف واقرار نے حضرت آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا محبوب ومقبول بنا دیا، یہیں پر یہ بھی واضح ہو گیا کہ گناہ پر اصرار اور اس کی تاویل شیطانی عمل ہے اور گناہ کا اعتراف اور اس پر شرمندگی وندامت کا اظہار حضرت آدم علیہ السلام کی سنت ہے اور انسانی فطرت کا تقاضہ ہے۔

جرم وگناہ کے اقرار واعتراف اور اس پر شرمندگی وندامت کے احساس کو شریعت کی نظر میں ''توبہ'' کہتے ہیں، توبہ کے بارے میں ہمارا تصور وخیال صرف اتنا ہے کہ کان پکڑے اور دونوں گالوں

پر چیپت لگالی جائے اور بس! یہی ہمارے نزدیک توبہ ہے، اسی کو ہم توبہ کہتے اور سمجھتے ہیں، ہمارے ذہن ودماغ میں موجود توبہ کا یہ تصور انتہائی ناقص اور نامکمل ہے۔

توبہ نام ہے ایک نئے قدم کا، جو بُرائی سے بھلائی کی طرف اٹھایا جائے، ایک نئے تاریخ ساز اقدام کا، جو عقیدہ وایمان اور خیالات ونظریات کی گمراہی کو ہدایت سے بدل کر رکھ دے، ایک نئے ولولہ، حوصلہ اور جذبہ کا، جو گناہ سے باز آنے اور رک جانے کی طاقت وقدرت عطا کرے، توبہ نام ہے ایک نئی زندگی کا، جو خالقِ کائنات کی وفاشعاری اور اطاعت وفرمانبرداری میں بسر کی جائے، نیکی وبھلائی اور خیر کے کاموں میں لگائی جائے۔

توبہ کی اہمیت اور اُس کی فضیلت سے متعلق بہت سی آیات واحادیث کتاب وسنت میں موجود ہیں، مثلاً ارشادِ ربانی ہے کہ ''اے نبی! کہہ دیجئے کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے آپ پر زیادتی کی ہے، تم اللہ کی رحمت سے نا امید اور مایوس مت ہوجاؤ، کیوں کہ اللہ تعالیٰ تمام گناہوں کو معاف فرمادیتے ہیں'' (سورۃ الزخرف: ۵۳) دوسری جگہ باری تعالیٰ کا فرمان ہے: رَحۡمَتِیۡ وَسِعَتۡ کُلَّ شَیۡءٍ ''میری رحمت ہر چیز گھیرے ہوئے ہے'' (سورۃ الاعراف: ۱۵۶) یہ بھی فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ کو قبول کرتے ہیں اور ان کی نافرمانیوں کو درگذر کرتے ہیں۔ (سورۃ الشوری: ۲۵) اس کے علاوہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے عذاب وعتاب اور ناراضگی کا ذکر ہوا ہے، اس کے فوراً بعد اِلاَّ مَنۡ تَابَ یا اِلاَّ الَّذِیۡنَ تَابُوۡا کا جملہ بڑھا کر اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کا استثناء کرتے ہیں، مثلاً: آگاہ کیا گیا کہ جو لوگ شریعت میں بیان کردہ نیکی اور بھلائی کی واضح باتوں کو عوام سے چھپاتے ہیں ان پر اللہ کی لعنت اور خود لعنت کرنے والوں (انسان جنات فرشتے) کی لعنت ہے، البتہ جن لوگوں نے توبہ کی اور اپنی اصلاح کرلی اور احکامِ الٰہی کو لوگوں کے سامنے واضح کردیا تو اللہ تعالیٰ ان کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ (سورۃ البقرۃ: ۱۵۹، ۱۶۰) غرض یہ کہ جب بھی کفار ومشرکین اور فاسق وفاجر کا بیان ہو تو توبہ کرنے والے اور نیک اعمال بجالانے والے اس دردناک اور ذلت ورسوائی کے انجام سے مستثنیٰ ہوتے ہیں، گویا توبہ کا عمل صرف گناہ اور جرائم کے صدور ہی کو نہیں بتلاتا بلکہ خدا تعالیٰ کی شانِ رحمت ومغفرت کے ظہور کو بھی واضح کرتا ہے۔

احادیث میں بھی ایک سے زائد دفعہ توبہ کرنے کی ترغیب دلائی گئی، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ رات میں ہاتھ پھیلاتے ہیں (مغفرت کا اعلان کرتے ہیں) تاکہ دن کا گنہ گار اللہ سے معافی مانگے اور دن میں اللہ تعالیٰ مغفرت کا اعلان کرتے ہیں تاکہ رات کا نافرمان اللہ کے حضور بخشش طلب کرے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ دو بندوں کے بارے میں اپنی رضا وخوشنودی کا اظہار کرتے ہیں اور وہ دونوں بندے جنت میں داخل ہوتے ہیں، ایک وہ بندہ جس نے اللہ کے راستہ میں جہاد کیا اور شہید ہوگیا، دوسرا وہ بندہ جس نے حالتِ کفر میں کسی مجاہد کو شہید کیا تھا پھر اس کو اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق دی، اس نے بھی اسلام قبول کیا اور میدانِ جہاد میں شہید ہوا۔

بنی اسرائیل کے قاتل کا واقعہ حدیث کی بڑی اور اہم کتابوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے، اس قاتل نے ۹۹/قتل کئے، اس کے بعد یہ شخص ایک عابد وزاہد کے پاس گیا، اس سے پوچھا کیا میرے لیے اب توبہ کی گنجائش اور سہولت ہے؟ عابد نے بتایا کہ تم نے اتنے زیادہ قتل کردئے اب تمہارے لیے توبہ کا کوئی راستہ نہیں ہے، یہ جواب سن کر اس شخص نے اس عابد کو بھی قتل کردیا، اس طرح اس نے سو قتل مکمل کرلیے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی وہ اندر ہی اندر نادم وشرمندہ ہے، اس نے ابھی بھی توبہ کا ارادہ ترک نہیں کیا، چنانچہ پھر اس نے ایک عالمِ دین کا پتہ لگایا اور اس سے پوچھا کیا میرے لیے توبہ کی کوئی سبیل اور گنجائش ہے؟ عالم نے کہا کیوں نہیں؟ ضرور ہے، البتہ تمہیں اپنی گنہ گار بستی اور ماحول چھوڑ کر نیک لوگوں کی بستی میں جانا ہوگا، اور ان کی صحبت میں رہنا ہوگا، یہ سن کر سو آدمیوں کا قاتل نیک لوگوں کی بستی کی طرف چل پڑا، گویا ''سو چوہے کھا کر بلی حج کرنے کو چلی'' ابھی وہ راستہ ہی میں تھا کہ اس کا انتقال ہوگیا، اب رحمت اور عذاب کے فرشتے دونوں جمع ہوگئے اور اس شخص کو اپنی تحویل میں لینے کے لیے دونوں فرشتے جھگڑنے لگے، عذاب کے فرشتوں کا ماننا تھا کہ یہ شخص سو افراد کا قاتل ہے، اس نے زندگی میں کبھی نیکی نہیں کی اس لیے یہ عذاب کا مستحق ہے، اس کے برخلاف رحمت کے فرشتوں کا کہنا تھا کہ یہ شخص چونکہ توبہ کا ارادہ کرچکا تھا اور نیکی کی طرف چل پڑا تھا، اس لیے یہ شخص گنہگار نہیں کہلاسکتا، ابھی یہ گفتگو ہورہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ایک اور فرشتہ کو انسان کی

صورت میں ان کے درمیان حکم بنا کر بھیجا، اس نے فیصلہ کیا کہ انتقال کی جگہ سے گنہ گار یا نیکوکار لوگوں کی جو بستی قریب ہے اس بستی کے لوگوں میں اس شخص کو شامل کر دیا جائے، چنانچہ جب زمین ناپی گئی تو گنہ گار بستی اس کی نعش سے قریب پائی گئی، قبل اس کے کہ اس پر فیصلہ ہو جاتا اللہ تعالیٰ نے فوراً نیک لوگوں کی بستی کی زمین کو حکم دیا کہ وہ قریب ہو جائے اور گنہ گاروں کی بستی کی زمین کو حکم دیا کہ وہ دور ہو جائے، چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سو افراد کا قاتل رحمت کے فرشتوں کے حوالے کر دیا گیا، کہنے والے نے بالکل سچ کہا کہ "رحمتِ حق بہانہ می جوید" اللہ کی رحمت مغفرت کا بہانہ ڈھونڈتی ہے۔

اس طویل روایت میں جہاں اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت اور اس کی مغفرت و معافی کا نرالا اور انوکھا انداز ہے وہیں بآسانی ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ توبہ صرف ایک مذہبی اور دینی عمل ہی نہیں بلکہ ایک معاشرتی اور سماجی ضرورت بھی ہے، ایسی ضرورت جو گنہ گاروں مجرموں اور نافرمانوں کو اپنی زندگی میں اصلاح و سدھار کا موقع فراہم کرتی ہے، ایسی ضرورت جو معاشرہ میں پاکیزہ انقلاب اور خوشگوار تبدیلی کا ذریعہ بنتی ہے، پھر یہ کہ گناہ اور جرم چاہے کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اس کا مرتکب بہرحال انسان ہی تو ہے، شرمندگی و پشیمانی اور احساسِ ندامت جو انسانی مزاج کا خاص جوہر ہے، یہ جوہر گنہگار اور مجرم میں بھی ہوتا ہے لیکن حالات کی پراگندگی اور ماحول کی کثافت اس کو غبار آلود اور گرد آلود کر دیتی ہے، پھر جیسے ہی اس کے حالات پلٹا کھاتے ہیں، بہتر ماحول اس کو میسر ہوتا ہے اور صحیح فکر اس کو مہیا کی جاتی ہے تو اس کے اندر موجود شرمندگی و پشیمانی رنگ لاتی ہے، پھر وہ صلاح و تقویٰ کے ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ دوسرے لوگ دیکھتے رہ جاتے ہیں اور اس پر رشک کرنے لگتے ہیں۔

اسلام کی روشن و تابناک تاریخ میں ایسی بلند و نامور ہستیاں گذری ہیں کہ جن کی ابتدائی زندگی قتل و غارت گری کا دوسرا نام تھی لیکن جب کایا پلٹی تو ایسی کہ دوسروں کے لیے لائقِ رشک اور قابلِ فخر بن گئے، مثلاً: حضرت فضیل بن عیاضؒ جنہیں دنیا عظیم محدث و فقیہ کی حیثیت سے جانتی ہے، عبادت و ریاضت میں وہ ضرب المثل تھے، نیکی و شرافت اور تقویٰ و طہارت خود ان کی بلائیں لیتی تھی، تاریخِ اسلام کی اس بزرگ و برگزیدہ ہستی کے بارے میں قارئین کے لیے یہ انکشاف حیرت انگیز ہوگا کہ آپ اپنی ابتدائی زندگی میں مشہور ڈاکو تھے، راہ چلنے والے قافلے محض اس خطرہ اور اندیشہ سے اپنا سفر روک

لیتے تھے کہ کہیں ''ڈاکو فضیل'' کا حملہ نہ ہوجائے، زندگی کے اس تاریک دور میں انہیں کسی لڑکی سے محبت ہوگئی تھی، رات کے کسی پہر دروازہ پھلانگ کر اس کے گھر میں داخل ہونا چاہ رہے تھے کہ کسی تلاوت کرنے والے کی زبان سے قرآن مجید کی یہ آیت ان کے کان سے ٹکرائی: اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُھُمْ لِذِکْرِاللّٰہِ (سورۃالحدید:۱۶) ''کیا اہلِ ایمان کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ اللہ کی نصیحت کے لیے ان کے دل جھک جائیں'' اتنا سننا تھا کہ فضیل نرم پڑ گئے، ان کا دل پسیج گیا، بے اختیار کہنے لگے ہاں! میرے رب کیوں نہیں؟ قرآن کی اس آیت نے ان کے دل کی ساری کثافتوں اور گندگیوں کو دھوڈالا اور اس بزرگ نے ایسی سچی پکی توبہ کی کہ اولیاء اور اقطاب میں ان کا شمار ہونے لگا قرآن مجید کی تلاوت جب کرتے یا سنتے تو اس قدر روتے کہ دیکھنے والوں کو رم آجاتا، کہنے والے نے بہت خوب کہا:

موتی سمجھ کر شانِ کریمی نے چن لیے
قطرے جو تھے میرے عرقِ انفعال کے

روزنامہ منصف: یکم اپریل ۲۰۰۵ء

توبہ —— مجرمین کی اصلاح کا مؤثر ذریعہ

اسلام میں جہاں جرائم اور معاصی کی شناعت اور ہلاکت کو بیان کیا گیا وہیں جو لوگ ان میں ملوث ہوتے ہیں یا ان کا ارتکاب کرتے ہیں پھر وہ اپنی غلط کاریوں کا اعتراف کرتے ہیں گناہ کے صدور پر انہیں پریشانی اور پشیمانی ہوتی ہے تو اسلامی تعلیمات ایسے افراد کا حوصلہ بڑھاتے ہیں، انھیں ہمت دلائی جاتی ہے اور ان کی ڈھارس بندھائی جاتی ہے کہ وہ افسردہ، آزردہ اور دل گرفتہ نہ ہو، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ شفیق ومہربان ہیں، ان کے گناہوں کو معاف کرنے والے اور بخشنے والے ہیں، چنانچہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار وہ ہیں جو توبہ کرتے ہیں، ایک حدیثِ قدسی میں آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بندہ کوئی گناہ کرتا ہے پھر کہتا ہے کہ **اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِیْ ذَنْبِیْ** اے اللہ! میرے گناہ کو معاف فرما، اس دعا پر اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ بندہ نے یہ دعا اس لیے مانگی کہ اس کو معلوم تھا کہ اس کا پروردگار گناہ کو معاف کرنے والا ہے اور گناہ پر پکڑ کرنے والا بھی، پھر وہ بندہ دوبارہ گناہ کرتا ہے اور اللہ سے معافی چاہتا ہے اس طرح وہ بار بار گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی چاہتا ہے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ اس بندہ سے فرماتے ہیں کہ اے میرے بندے میں نے تجھے معاف کردیا اب تو جو چاہے کر، مطلب یہ کہ جب تک وہ گناہ کرتے رہے گا اور اللہ سے معافی بھی مانگتے رہے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں گے، اس لیے کہ توبہ کا عمل ان تمام گناہوں اور غلطیوں کا خاتمہ کردیتا ہے جو توبہ کرنے سے پہلے تھے: **فَاِنَّ التَّوْبَةَ تَهْدِمُ مَا قَبْلَهَا**، ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے اگر تم لوگ گناہ نہیں کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم فرمادیں گے اور تمہاری جگہ ایسی قوم کو لائیں گے جو گناہ کرے گی اور پھر اللہ سے توبہ واستغفار بھی کرے گی، اسی مفہوم ومطلب کی حدیث ایک دوسری روایت میں بھی ہے جس میں حضرت ابوایوب خالد بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو

یہ فرماتے ہوئے سنا کہ اگر تم لوگ گناہ نہیں کرو گے تو اللہ تعالیٰ ایسی مخلوق کو پیدا فرمائیں گے جو گناہ کرے گی اور پھر اللہ سے مغفرت چاہے گی اور اللہ اس کو معاف کر دیں گے۔

یہ بڑی نادانی اور حماقت ہے کہ اس طرح کی امید افزاء روایات کی وجہ سے انسان گناہ پر جری اور دلیر ہو جائے اور ہمیشہ گناہ کے موقع پر یوں کہنے لگے اللہ تعالیٰ معاف کرنے والے ہیں، کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی بے پناہ شفقت ومہربانی اور بیکراں رحم دلی وعفوودرگذر کے ذکر کے ساتھ اس کے دردناک اور عبرتناک عذاب کو بھی بیان کیا گیا۔ ارشادِ ربانی ہے: نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ، وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ (سورۃالحجر:۴۹،۵۰)"اے نبی! میرے بندوں کو بتلا دیجئے کہ میں معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں اور ہاں! میرا عذاب بھی دردناک عذاب ہے۔" اسی طرح آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ عقل مند وہ ہے جس نے اپنے آپ کو پہچانا اور موت کی بعد والی زندگی کے لیے اعمال کا ذخیرہ تیار کیا اور بے وقوف وہ ہے جس نے نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور صرف اللہ تعالیٰ سے مختلف امیدیں لگائے بیٹھے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں سیاہ دھبہ لگ جاتا ہے، پھر جیسے ہی وہ توبہ کرتا ہے تو وہ سیاہ دھبہ بھی مٹ جاتا ہے لیکن گناہ کے بعد فوراً توبہ نہ کرے اور گناہ پر گناہ کرتے جائے تو اس کے دل میں سیاہ دھبے بڑھتے جاتے ہیں یہاں تک کہ اس کا دل خود سیاہ ہو جاتا ہے، جب دل ہی سیاہ ہو جائے تو اس کو کسی اچھے اور نیک کام (جس میں توبہ کا عمل داخل ہے) کی توفیق نہیں ہوتی، جب توبہ کرنے کی توفیق نہ ہو وہ کیسے توبہ کے ثمرات اور برکات کو پا سکتا ہے؟

جو خوش نصیب اور سعادت مند انسان توبہ کا ارادہ اور عزم کرلے تو چاہیئے کہ وہ توبہ کے مسائل وآداب کا بھرپور خیال رکھے اور ان کی مکمل رعایت و پابندی کرے، اس لیے کہ قرآن مجید میں اہلِ ایمان کو "توبۃ النصوح" کرنے کا حکم دیا۔ (سورۃالتحریم:۸) اس آیت کی تفسیر میں مفسرین نے حضرت علیؓ کا قول کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ سے سوال کیا گیا کہ "توبۃ النصوح" کیا ہے؟ آپؓ نے فرمایا جس توبہ میں ٦ / چیزیں جمع ہوں وہ "توبۃ النصوح" ہے۔ چھ چیزیں یہ ہیں۔

۱) اپنے گذشتہ بُرے عمل پر ندامت کا اظہار ہو۔

۲) حقوق اللہ سے متعلق جو فرائض وواجبات چھوٹے ہیں ان کی قضاء کرے۔

۳) کسی کا مال ظلماً لیا ہو تو اس کو واپس لوٹائے۔

۴) کسی کو زبان یا ہاتھ سے تکلیف پہنچائی ہو تو اس سے معافی مانگے۔

۵) آئندہ اس گناہ کے پاس نہ جانے کا پختہ عہد اور ارادہ کرے۔

۶) توبہ کرنے والا جس طرح اپنے نفس کو اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دیکھا ہے اسی طرح وہ اپنے نفس کو اللہ کی اطاعت میں بھی دیکھ لے۔

امام نوویؒ نے اپنے شہرۂ آفاق مجموعہ احادیث ریاض الصالحین میں توبہ سے متعلق لکھا ہے کہ ہر گناہ سے توبہ کرنا واجب ہے، توبہ کے صحیح ہونے کی تین شرطیں ہیں، ایک یہ کہ فوری طور پر اس گناہ سے بالکل رُک جائے، دوسرے یہ کہ اس پر نادم وشرمندہ ہو، تیسرے یہ کہ اس گناہ کو دوبارہ نہ کرنے کا پختہ عزم وارادہ کرے اور اگر گناہ ومعصیت کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہو مثلاً کسی کا مال لے لیا ہو، کسی پر تہمت لگائی ہو یا کسی کی غیبت کی ہو تو اس گناہ سے توبہ کرنے میں ان تین شرطوں کے علاوہ چوتھی شرط یہ ہے کہ اس بندہ سے پہلے صلح وصفائی کر لے، مال واپس کر دے، معافی مانگے وغیرہ، اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے۔

توبہ کی مدت کے بارے میں یہ ہے کہ توبہ کا دروازہ تا قیامت کھلا ہے، احادیث میں **حَتّٰی تَطْلُعَ الشَّمْسُ مِنْ مَغْرِبِهَا** کے الفاظ آئے ہیں، مطلب یہ کہ سورج بجائے مشرق سے طلوع ہونے کے مغرب سے طلوع ہو جائے، ایسا قیامت ہی میں ہوگا، اب یہ کون جانے اور کیسے بتائے کہ قیامت کب آئے گی؟ اس لیے بہتری اور بھلائی اسی میں ہے کہ بندہ اپنی موت سے پہلے توبہ کر لے، موت کے سامنے توبہ کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ توبہ قبول ہوگی، قرآن مجید میں بتایا گیا کہ ”ان لوگوں کے لیے توبہ نہیں ہے جو جانتے بوجھتے بُرے کام کرتے ہیں یہاں تک کہ موت جب ان کے پاس آن پہنچتی ہے تو وہ شخص کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں۔“ (سورۃ النساء:۱۸) آنحضرت ﷺ نے فرمایا: **اِنَّ اللّٰہَ یَقْبَلُ التَّوْبَۃَ مَا لَمْ یُغَرْغِرْ** ”اللہ تعالیٰ توبہ کو قبول کرتے ہیں جب تک بندہ موت سے پہلے کی حالت نزاع کی کیفیت میں نہ ہو، اس کے علاوہ فرعون کی توبہ بھی محض اس وجہ سے قبول نہیں ہوئی کہ موت اس

کے سامنے بالکل کھڑی تھی، موت کا بھی کوئی وقت اور موسم متعین نہیں ہے، اس لیے کہ اچھے خاصے اور ہنستے کھیلتے لوگ بیٹھے بٹھائے دنیا سے رخصت ہورہے ہیں، گویا ہر ایک کے چل چلاؤ کے دن ہیں، عافیت اور نجات جلد سے جلد توبہ کرنے میں ہے، گناہ اور معصیت والی زندگی کو چھوڑ کر نیکی وتقویٰ کی نئ زندگی شروع کرنے میں ہے۔

جرائم اور بدعنوانیوں کے حوالہ سے آج دنیا پریشان اور حیران ہے، سخت سے سخت قوانین بنائے جارہے ہیں، پولیس کو زیادہ سے زیادہ اختیارات دئے جارہے ہیں لیکن جرائم ہیں کہ کم ہونے اور ختم ہونے کا نام نہیں لیتے، حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ قانون اور پولیس کے ذریعہ جرائم پر صرف قابو پایا جاسکتا ہے، اس کا مکمل انسداد اور سدِ باب نہیں ہوسکتا، چنانچہ آپ مشاہدہ کرسکتے ہیں کہ ہمارے سماج میں جو صرف مجرم ہوتا ہے وہ چند سال سزائے قید میں جیل کی ہوا کھانے کے بعد "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" کے مصداق وہ "پیشہ ور مجرم" بن جاتا ہے، ضرورت ہے کہ جیلوں میں قیدیوں کے لیے ان کی مذہبی تعلیمات کی روشنی میں ایسی تربیتی کلاسس اور لکچرس کا اہتمام ہو جو ان کی ذہنیت میں اصلاح وسدھار لاسکے، ان کے ضمیر انہیں جھنجھوڑے، پھر وہ احساسِ ندامت وشرمندگی سے مجبور ہوکر ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ اپنی نئ پاکیزہ زندگی کا آغاز کرسکیں، غرض یہ کہ جرائم کی روک تھام مجرمین پر قابو پانے سے نہیں بلکہ ان کی صحیح ذہن سازی اور صحیح تربیت سے ہوگی۔

آیئے! عالمِ اسلام کے ممتاز ومایۂ ناز عالمِ دین مولانا جسٹس محمد تقی عثمانی مدظلہ عالی کی "مناجات" غفور رحیم کی بارگاہ میں بصد عجز ونیاز دہرائیں:

آیا ہوں تیرے دربار میں خاموش نوا لے کر
نیکی سے تہی دامن انبارِ خطا لے کر
لیکن تیری چوکھٹ سے امیدِ سخا لے کر
اعمال کی ظلمت میں توبہ کی ضیاء لے کر
سینے میں تلاطم ہے، دل شرم سے صد پارہ
دربار میں حاضر ہے ایک بندۂ آوارہ

روزنامہ منصف: یکم اپریل ۲۰۰۵ء

حادثات سے بچنے کا اہتمام کیجئے!

زندگی، اللہ تعالیٰ کی انمول نعمت ہے، انسان کے ہر عضو اور ہر جوڑ کی اپنی جگہ اہمیت ہے، اگر آنکھیں نہ ہوں تو دنیا اپنی تمام تر رونقوں، روشنیوں، دلچسپیوں اور دلفریبیوں کے باوجود ایک نابینا کے لیے بے نور اور تاریک ہے، حسین قدرتی مناظر اور کائنات کے حسن و جمال سے وہ لطف اندوز نہیں ہوتا، یوں تو پیدائشی نابینا کو بھی آنکھوں کی قدر و قیمت کا احساس ہوتا ہے لیکن ان کے مقابلہ میں بینائی سے محرومی کا غم اور دکھ ان کو زیادہ ہوتا ہے جن کی آنکھیں کسی حادثہ کا شکار ہو گئیں ہوں یا ان بزرگ افراد کو جو ''دادا''، ''نانا'' کہلاتے ہیں جو اپنے چھوٹوں کی شادی کی بارات نہیں دیکھ سکتے یا اپنے گھر اور خاندان میں نومولود پوتوں، پوتیوں اور نواسوں، نواسیوں کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی نہیں کر سکتے، خوشی مسرت کے مواقع پر یہ حضرات آبدیدہ ہوتے ہیں۔

اسی طرح دیگر اعضاء ہیں، زبان نہ ہو تو قوت گویائی سے محروم شخص اپنے جذبات واحساسات کے اظہار میں عاجز ہوتا ہے، سونگھنے اور چکھنے کی حس اگر ختم ہو جائے تو انواع واقسام کے سارے مزیدار کھانے اور ذائقہ دار سالن اپنی تمام تر خوشبوؤں اور لذتوں کے باوجود بے مزہ معلوم ہوتے ہیں، صحت وتندرستی میں انسان بے پرواہی اور بے احتیاطی کے ساتھ اپنے ہاتھ پیر سے خوب کام لیتا ہے، مسلسل بھاگ دوڑ کرتا ہے، لیکن ذرا کچھ حادثہ ہوا، ہاتھ میں فیکچر آیا یا پیر کی ہڈی ٹوٹ گی تو وہ اب بستر مرض پر معذوری و مجبوری کے دن کاٹ رہا ہوتا اور بیماری کا ایک ایک لمحہ اس کے لیے بارگراں ہوتا ہے، اس طرح حادثات انسان کو اپنے اعضاء و جوارح کے نعمت ہونے کا احساس دلاتے ہیں۔

زندگی کے نعمت ہونے کا تقاضہ یہ ہے کہ اُس کی قدر و قیمت کا شعور اپنے اندر پیدا کیا جائے، حادثات اور خطرات سے اُس کی حفاظت کی جائے، اس کے لیے مادی وسائل کا تو استعمال ہوتا ہے اور ظاہری اسباب بھی اختیار کیے جاتے ہیں، مثلاً: باشعور لوگ ''حفظانِ صحت'' کے اصولوں کی پابندی

اور پیروی کرتے ہیں، خود کو تندرست اور توانا رکھنے کی کوشش کرتے ہیں، گاڑی چلاتے وقت ہیلمٹ اور بیلٹ کا استعمال کرتے ہیں، غرض یہ کہ حادثات سے محفوظ رہنے کے لیے منصوبہ بندی کے طور پر تمام احتیاطی تدابیر اور حفاظتی اقدامات کرتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ خود یا ان کی سواری حادثہ کا شکار ہوجاتی ہے، صرف سڑک حادثات ہی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں معمولی غفلت بڑے حادثہ کا سبب بنتی ہے، کاروبار میں زبردست گھاٹا اور نقصان ہوتا ہے، بعض دفعہ قیمتی سامان چوری ہوجاتا ہے، اچھلتے کودتے بچوں کو معمولی چوٹ لگنے سے گہرا زخم لگتا ہے، پس بیماریاں اور پریشانیاں یہ سب زندگی کے حادثات ہیں، انسان ان حادثات کو نہ چاہتے ہوئے بھی جھیل جاتا ہے، بعضوں کے لیے بیماریاں اور پریشانیاں ان کی زندگی کا حصہ بن جاتی ہیں، بقول شاعر ؎

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر اتنی پڑیں کہ آساں ہوگئیں

آج کی مصروف ترین مشینی زندگی میں اتنی فرصت کس کے پاس ہے کہ وہ یہ سوچے اور غور کرے کہ احتیاط اور حفاظت کے تمام مادی وسائل اور ظاہری اسباب کے اختیار کرنے کے باوجود صحت وتندرستی کے آنگن میں بیماریاں کیوں پڑاؤ ڈالتی ہیں؟ زندگی کا چمن پریشانیوں سے کیوں کر ''خزاں رسیدہ'' اور اجاڑ ہوجاتا ہے؟؟ بے شک رنج وغم کے واقعات اور جان لیوا حادثات زندگی کا حصہ ہے، ان کے پیش آنے پر صبر کرنے اور اللہ کی مرضی ومشیت پر راضی رہنے کی تعلیم دی گئی، یہ گمان اور خیال ہوسکتا ہے کہ بہت سے لوگ لاپرواہی اور بے احتیاطی کی زندگی گذارتے ہیں اور وہ بعض مرتبہ حادثات میں بال بال بچ جاتے ہیں، اس کی وجہ اللہ تعالیٰ کی اپنے بندوں پر خاص رحمت وشفقت ہے، ہر انسان کی حفاظت اور نگرانی کے لیے فرشتوں کی جماعت اس کے ساتھ مستقل لگی رہتی ہے، قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا فرمان ہے: **لَهٗ مُعَقِّبٰتٌ مِّنۢ بَيۡنِ يَدَيۡهِ وَمِنۡ خَلۡفِهٖ يَحۡفَظُوۡنَهٗ مِنۡ اَمۡرِ اللّٰهِ** (سورۃ الرعد:۱۱) اس آیت کی تشریح وتفسیر میں مفسرین کرام نے جو احادیث نقل فرمائی ہیں ان میں بتایا گیا کہ فرشتوں کی دو جماعتیں حفاظت کے لیے مقرر ہیں، ایک رات کے لیے دوسری دن کے لیے اور یہ دونوں جماعتیں صبح اور عصر کی نمازوں میں جمع ہوتی ہیں، فجر کی نماز کے بعد رات کے محافظ

فرشتے رخصت ہوجاتے ہیں، دن کے محافظ کام سنبھال لیتے ہیں، عصر کی نماز کے بعد دن کے محافظ فرشتے رخصت ہوجاتے ہیں اور رات کے فرشتے اپنی ڈیوٹی سنبھال لیتے ہیں۔ (صحیح بخاری) ابوداؤد کی ایک حدیث میں حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ہر انسان کے ساتھ کچھ حفاظت کرنے والے فرشتے مقرر ہیں، جو اس کی اس طرح حفاظت کرتے رہتے ہیں کہ اس کے اوپر کوئی دیوار وغیرہ نہ گرجائے، یا وہ کسی غار اور گڑھے میں نہ جا گرے، یا کوئی جانور یا انسان اس کو تکلیف نہ پہنچائے، حضرت کعب بن احبارؓ فرماتے ہیں کہ انسان کی حفاظت کا یہ خدائی پہرہ اگر نہیں ہوتا تو جنات اس کی زندگی وبال کردیتے، پھر یہ حفاظتی پہرے اس وقت تک کام کرتے ہیں جب تک تقدیر الٰہی ان کی حفاظت کی اجازت دیتی ہے، تقدیر الٰہی کے مطابق انسان پر جب کسی ابتلاء آزمائش کا فیصلہ ہوتا ہے تو فرشتوں کا حفاظتی پہرہ ہٹالیا جاتا ہے، (ملخص از معارف القرآن ۵ / ۱۸۲ مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ) یہ بھی ممکن ہے کہ گناہوں کی گندگی اور نحوست کی وجہ سے حفاظت کرنے والے فرشتے انسان سے دور ہوجاتے ہیں، پھر اس دوران کوئی انسان کسی حادثہ یا مصیبت کا شکار ہوجاتا ہو، جیسا کہ جھوٹ کی برائی اور مذمت کے بارے میں حدیث میں ہے کہ جب کوئی شخص جھوٹ بولتا ہے تو اس کی بدبو سے فرشتے اس شخص سے دور ہوجاتے ہیں۔

موجودہ دور میں اگر ایک عام انسان اپنی مشینی اور مصروف ترین زندگی کا جائزہ لے تو اس کو محسوس ہوگا کہ اس کی یہ بھاگ دوڑ والی زندگی روزانہ کی ایک ''روٹین'' ہے، ہر شخص صبح اٹھتا ہے، دن بھر اپنی مصروفیات، ملازمت اور کاروبار میں لگا رہتا ہے، پھر شام یا رات دیر گئے سوجاتا ہے، اگر ہم ۵ / وقت نماز پڑھتے ہیں، اور دیندار طبقہ میں سمجھے جانے کی وجہ سے اگر کچھ دینی و مذہبی خدمات انجام دیتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا یہ بھی ہماری روزانہ کی ''روٹین'' کا ایک حصہ ہے، سوچنے اور غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اپنی مصروف زندگی کا آیا کوئی حصہ ایسا بھی گزار جس میں ہم اللہ تعالیٰ کے حضور ذکر واذکار کرسکیں؟ ہم میں سے کتنے لوگ ہیں جو پورے اہتمام اور پابندی کے ساتھ صبح وشام کی دعائیں پڑھتے ہیں؟ یا اوراد ووظائف پورے کرتے ہیں؟ صبح وشام کی دعائیں ہوں یا اوراد ووظائف یہ سب روزمرہ حادثات سے بچنے کا مؤثر ذریعہ ہے اور اُن سب کا تعلق ''ذکر اللہ'' سے ہے، اللہ تعالیٰ

کی یاد اور اس سے وابستگی ہی میں زندگی کی بقاء وسلامتی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی کا کوئی شعبہ اور لمحہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد سے خالی نہیں رکھا گیا، زندگی کی ہر نقل وحرکت پر اس کے لیے دعائیں ہیں، کھانے، پینے، اٹھنے، بیٹھنے، سوتے، جاگتے کسی بھی لمحہ وہ اپنے پروردگار سے غافل نہیں رہ سکتا، قرآن مجید میں عقلمندوں کی نشانی اور علامت یہ بتائی گئی ہے کہ وہ کھڑے، بیٹھے، اور پہلوؤں کے بل لیٹے اللہ کو یاد کرتے ہیں، (آل عمران) ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک دیہات کے رہنے والے صحابی حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! لوگوں میں بہترین آدمی کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ شخص جس کی عمر زیادہ ہو اور اس کے اعمال اچھے ہوں، پھر انہوں نے پوچھا کہ اے اللہ کے رسول! اعمال میں کون سا عمل افضل ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دنیا کو اس حال میں خیر باد کہو کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو، یعنی مرتے دم تک خاص کر زندگی کے آخری وقت ذوق اور لذت کے ساتھ تمہاری زبان پر اللہ کا نام ہو۔ (معارف الحدیث ۵ / ۳۸) صبح وشام کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اس کی یاد کی بڑی اہمیت ہے، جیسے کوئی شخص موٹر گاڑی چلا رہا ہے، گاڑی فراٹے بھرتے ہوئے طوفانی رفتار کے ساتھ چل رہی ہے، ایسے موقع پر ڈرائیور بعض مرتبہ شوقیہ انداز میں ''اسٹیرنگ'' پر سے ہاتھ بھی اٹھا دیتا ہے، لیکن اس کا دل اور ذہن پوری طرح ''اسٹیرنگ'' پر ہی رہتا ہے، کیونکہ اس کو معلوم ہے کہ اس موقع پر ذراسی غفلت وکوتاہی سے موٹر گاڑی کسی بھی وقت بے قابو ہو سکتی ہے، ایسے ہی اللہ تعالیٰ کا ذکر ہماری زندگی کا ''اسٹیرنگ'' ہے زندگی کی گاڑی کتنی ہی تیز رفتار کیوں نہ ہو، اگر ''اسٹیرنگ'' پر ہماری توجہ نہیں ہے اور اللہ کی یاد سے ہم غافل ہیں تو کسی بھی وقت زندگی کی ''گاڑی'' بے قابو ہو کر حادثہ کا شکار ہو سکتی ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ امت پر بے انتہاء مہربان اور شفیق ہیں، خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ انھیں (یعنی آنحضرت ﷺ کو) بہت شاق اور گراں گذرتا ہے جب تمہیں کوئی تکلیف پہنچتی ہے، (التوبۃ:۱۲۸) اس لیے آپ ﷺ نے ہمیں صبح وشام کی دعائیں بتائیں اور سکھلائی ہیں، تاکہ ہماری زندگیاں ان خطرات اور حادثات سے محفوظ رہ سکیں، آپ ﷺ کی حفاظت سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَاللّٰہُ یَعۡصِمُکَ مِنَ النَّاسِ، لوگوں کے شر وفتنہ سے اللہ تعالیٰ آپ کو محفوظ رکھے گا، آنحضرت

ﷺ کی حفاظت کے لیے خدائی نظام کا اندازہ اس سے لگائیے کہ آپ ﷺ کا سایہ مبارک تک زمین پر نہیں پڑتا تھا، لیکن اس کے باوجود امت کی تعلیم کے لیے آنحضرت ﷺ صبح وشام کی دعاؤں کا اور رات میں سوتے وقت میں خاص اوراد وظائف کا عملی اہتمام فرماتے تھے، صبح وشام کی دعاؤں کی اہمیت کے پس منظر میں نامور عالمِ دین اور بلند پایہ مصنف حضرت مولانا منظور نعمانیؒ لکھتے ہیں:

''ہر آدمی کے لیے رات کے بعد صبح ہوتی ہے اور دن ختم ہونے پر شام آتی ہے، گویا صبح وشام زندگی کی ایک منزل طے ہوکر اگلی منزل شروع ہوجاتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے ارشادات اور اپنے عملی نمونہ سے امت کو ہدایت فرمائی کہ وہ ہر صبح وشام اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو تازہ ومستحکم کرے، اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرے، اپنے قصوروں کے اعتراف کے ساتھ معافی مانگے، اور سائل وبھکاری بن کر ربِ کریم سے مناسب وقت دعائیں کرے۔'' (معارف الحدیث ۵/ ۱۶۷)

دنیا وآخرت کی بھلائی اور حادثات وخطرات سے حفاظت کے لیے صبح وشام میں رسول ﷺ کی بہت سی دعائیں حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں، ان میں سے کچھ آسان اور مختصر دعائیں اس طرح ہیں:

۱) حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ جب شام یا صبح ہوتی تو رسول اللہ ﷺ یہ دعا ضرور کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ الْعَفْوَ وَالْعَافِیَةَ فِیْ دِیْنِیْ وَدُنْیَایَ وَاَھْلِیْ وَمَالِیْ، اَللّٰھُمَّ اسْتُرْ عَوْرَاتِیْ وَاٰمِنْ رَوْعَاتِیْ، اَللّٰھُمَّ احْفَظْنِیْ مِنْ بَیْنِ یَدَیَّ وَمِنْ خَلْفِیْ وَعَنْ یَمِیْنِیْ وَعَنْ شِمَالِیْ وَمِنْ فَوْقِیْ وَاَعُوْذُ بِعَظْمَتِکَ اَنِ اغْتَالَ مِنْ تَحْتِیْ۔ (رواہ ابوداؤد)

اے اللہ! میں تجھ سے دنیا وآخرت میں معافی وعافیت کا طالب وسائل ہوں، اے میرے اللہ! میں اپنے دین اور دنیا اور اپنے اہل وعیال اور مال کے بارے میں معافی اور عافیت کا طلب گار ہوں، اے اللہ! میری شرم اور عار والی باتوں کی

پردہ داری فرما، میرے دل کی گھبراہٹ اور تشویشوں کو دور فرما کر مجھے امن واطمینان نصیب فرما، اے اللہ! میری حفاظت فرما میرے آگے سے اور پیچھے سے اور میرے دائیں بائیں اور میرے اوپر کی جانب سے، اور میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس بات سے کہ نیچے کی جانب سے کوئی آفت آئے، مجھے ہمیشہ اس سے محفوظ رکھ۔

صبح وشام کی دعاؤں میں یہ بڑی جامع دعا ہے، اس میں نہ صرف انسانی ضروت کا اظہار ہے بلکہ ہر حادثہ، اس کے خطرہ وامکان سے حفاظت بھی ہے،

۲) حضرت طلقؒ فرماتے ہیں کہ ایک شخص صحابی رسول ﷺ حضرت ابوالدرداءؓ کی خدمت میں حاضر ہوکر آپ ﷺ کے مکان جلنے کی خبر سنائی، آپؓ نے فرمایا نہیں جلا، پھر دوسرے، تیسرے شخص نے آکر یہی خبر سنائی، آپؓ نے فرمایا نہیں جلا، چوتھے شخص نے آکر کہا کہ اے ابوالدرداء آگ کے شرارے بہت بلند ہوئے مگر جب آپ کے مکان تک آگ پہنچی تو بجھ گئی، اس پر صحابی رسول نے فرمایا کہ مجھے معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ میرے مکان کو جلنے سے بچائے گا، اس لیے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا ہے کہ جو شخص صبح یہ کلمات پڑھ لے شام تک اس کو کوئی مصیبت نہیں پہنچے گی، اور جو شام میں پڑھ لے گا صبح تک اس کو کچھ نقصان نہیں ہوگا، میں نے صبح میں یہ کلمات پڑھ لیے تھے اس لیے مجھے یقین تھا کہ میرا مکان نہیں جل سکتا، وہ کلمات یہ ہیں:

اَللّٰھُمَّ اَنْتَ رَبِّیْ لاَ اِلٰہَ اِلاَّ اَنْتَ عَلَیْکَ تَوَکَّلْتُ وَاَنْتَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ، مَا شَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَلَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ وَلاَ حَوْلَ وَلاَ قُوَّۃَ اِلاَّ بِاللّٰہِ الْعَلِیِّ الْعَظِیْمِ، اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْئٍ قَدِیْرٌ وَاَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْئٍ عِلْماً، اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ شَرِّ نَفْسِیْ وَمِنْ شَرِّ کُلِّ دَابَّۃٍ اَنْتَ اٰخِذٌ بِنَاصِیَتِھَا، اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ۔

ان طویل دعاؤں کے علاوہ مختصر دعائیں بھی ہیں، جن کا یاد کرنا اور یاد رکھنا ہمارے لیے آسان ہوگا۔ مثلاً یہ مشہور کلمات:

بِسْمِ اللّٰہِ الَّذِیْ لَا یَضُرُّ مَعَ اسْمِہٖ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَاءِ وَھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ،

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص ہر دن کی صبح اور رات میں ان کلمات کو ۳؍مرتبہ پڑھے گا وہ ہر مصیبت اور حادثہ سے محفوظ رہے گا۔(حضرت عثمانؓ بن عفان کی روایت ترمذی وابوداؤد) اگر کسی کے لیے یہ دعائیں یاد کرنا مشکل اور دشوار ہو تو کم از کم صبح وشام کے آغاز میں ۳؍مرتبہ قُلْ ھُوَ اللّٰہُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ پڑھ لیا کرے، یہ اس کے لیے ہر چیز کے واسطے کافی ہوگی۔(حضرت عبداللہ بن خبیب کی روایت، ابوداؤد) یہ سورتیں آسان ہیں اور عام طور پر ہر مسلمان کو یاد بھی رہتی ہیں، اس لیے اس سے غفلت بہت بڑی ناقدری کی بات ہے۔(دعاؤں سے متعلق تمام احادیث معارف الحدیث جلد:۵ کتاب الاذکار والدعوات سے لی گئیں)

اللہ تعالیٰ ہمیں ایمانی کیفیت اور یقین کی دولت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی ان مقبول دعاؤں اور کلمات کو اپنا معمول بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

اے زندگی سپرد خدا کردیا تجھے
بے فکر ہوگئے تیرے سود وزیاں سے ہم

روزنامہ منصف ۵؍ستمبر ۲۰۰۸ء

رنج وغم کے بادلوں سے لطف وکرم کی بارش!!

زندگی اوراس کی نیرنگی کے بھی عجیب تماشے اورجلوے ہیں ،اس میں خوشی ومسرت کے نغمے وترانے ہیں اورغم وماتم کے افسانے بھی ،فرحت وسرور کے لمحے ہیں اور رنج والم کے صدمے بھی ، خوشیوں کی بارات ہےاورغموں کی برسات بھی،مبارک بادیوں کی سوغات ہیں اورتعزیت کےکلمات بھی ،راحت وآرام کے حالات ہیں اورمصیبت و پریشانی کے حادثات بھی ،صحت وتندرستی کی تن آسانیاں ہیں اور بیماری ومعذوری کی پریشانیاں بھی ،فراخی وخوش حالی کے سامان ہیں اورغربت وتنگدستی کی داستان بھی،دل فریب مسکراہٹیں اورخوش گپیاں ہیں اوردردوکرب کی سسکیاں بھی،غرض یہ کہ زندگی کا فلسفہ پھول اورکانٹے دھوپ اور چھاؤں سے عبارت ہے،قرآن کی زبان میں کہ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِیُسْراً تنگی کے ساتھ کے ساتھ آسانی ہے،زندگی کی اس نیرنگی اوراس کے مجموعۂ اضدادمناظر کے پس منظرمیں شاعراسلام علامہ اقبال نے بجافرمایا ؎

زندگی قطرے کی سکھلاتی ہے اسرار ِحیات
یہ کبھی گوہر ،کبھی شبنم ،کبھی آنسو ہوا

جیسے زندگی کے مختلف تماشے اورجلوے ہیں اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کرزندگی عطا کرنے والی اورزندگی بنانے والی ذاتِ کریمی کی رحمت ومہربانی کے کرشمےاوراس کے اندازبھی نرالے ہیں،انسانی فطرت اورطبیعت صرف آسانی اورخوشحالی کی خوگراوردلدادہ ہے،حالات میں ذرااتارچڑھاؤہو یا پھر امتحان وآزمائش کا موقع ہوتو انسان پر مایوسی اورافسردگی کے بادل چھا جاتے ہیں،لیکن اللہ تعالیٰ ہرحال میں اپنے بندہ کواپنی بے پناہ شفقت ومہربانی اورالطاف وعنایات کا امیدوار بنائے رکھنا چاہتا ہے، ناامیدی اور مایوسی کواس کی بارگاہ میں ناشکری کی علامت کہا گیا ہے۔خودارشادِ ربانی ہے:اِنَّہٗ لَایَیْئَسُ مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ اِلاَّ الْقَوْمُ الْکَافِرُوْنَ (یوسف:۸۷) صرف ناشکرے لوگ ہی اللہ کی رحمت

سے مایوس ہوتے ہیں۔

بیماری اور پریشانی روزمرہ زندگی کا حصہ ہے۔ایسے موقع پر مصیبت اوردکھ کا اظہار انسان کا فطری تقاضہ ہے،لیکن ایک بندۂ مؤمن غم وتکلیف کے اظہار میں حدود سے تجاوز کرنے اور بارگاہ الٰہی میں شکوہ وشکایت کی زبان کھولنے کے بجائے اس سے صبر وبرداشت کی توفیق مانگتا ہے،امت کے غم خوار اورغمگسار رسول اللہ ﷺ نے مختلف پیرایۂ بیان میں بیمار، پریشانی میں گرفتار اورحادثہ کا شکار افراد کے غم کو ہلکا فرمایا ہے،اس سلسلہ میں چند روایات ملاحظہ ہوں:

۱) حضرت صہیب بن سنانؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن کا معاملہ بڑا عجیب ہے،یعنی اس کا پورا معاملہ سراسر خیر ہی خیر ہے اور یہ صرف مؤمن کی خصوصیت ہے،اگر اس کو نعمت ملتی ہے تو وہ شکر گذار ہوتا ہے جو اس کے لیے بہتر ہے اور اگر وہ نقصان اور مصیبت سے دوچار ہوتا ہے تو صبر کرتا ہے تو یہ بھی اس کے لیے بہتر ہے۔(ریاض الصالحین،ص:۲۴ باب الصبر) گویا مسلمان کے دونوں ہاتھ میں لڈو! آسانی اورفراخی میں اللہ کا شکر اور بیماری وپریشانی میں صبر،کسی بھی حال میں محرومی اور مایوسی نہیں،اس لیے کہ شکر اور صبر دونوں عمل اجر وثواب پانے کا ذریعہ ہیں۔

۲) حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابوھریرۃؓ سے مروی ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کو جو بھی دکھ اور جو بھی بیماری اور جو بھی پریشانی اور جو بھی اذیت وتکلیف پہنچتی ہے یہاں تک کہ کانٹا بھی اگر اس کو چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذریعہ اس کے گناہوں کی صفائی کردیتا ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم/ ریاض الصالحین،ص:۳۱ باب الصبر)

۳) اسی مضمون کی ایک اور روایت حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بندۂ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے خواہ بیماری ہو یا اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ اس کے ذریعہ اس کے گناہوں کو اس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح سوکھا درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے۔ (صحیح بخاری ومسلم بحوالہ سابق)

۴) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کے بعض ایمان والے بندے اور بندیوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب وحوادث آتے رہتے ہیں،کبھی اس کی

جان پر، کبھی اس کے مال پر، کبھی اس کی اولاد پر اوراس کے نتیجہ میں اس کے گناہ جھڑتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے حضور میں اس حال میں پہنچتا ہے کہ اس کا ایک گناہ بھی باقی نہیں ہوتا۔(جامع ترمذی بحوالہ سابق، ص:۳۶ باب الصبر)

۵) کسی گناہ اور جرم کی سزا کا التواء بجائے خود ایک طرح کی سزا ہے، اس میں آدمی مختلف خیالات اور اندیشوں میں گھرا ہوتا ہے، یہ ایسے ہی ہے کہ دو طالبِ علم شرارت کرتے ہیں ایک کو استاذ فوری سزا دیتا ہے اور دوسرے کی سزا کو ملتوی کرتا ہے، اب پہلا طالب علم تو مطمئن اور پرسکون ہے کہ مجھے اپنی شرارت کی فوری سزا مل گئی، اس کو کوئی اندیشہ اور خوف نہیں لیکن دوسرا طالبِ علم اپنی ملتوی سزا کے بارے میں فکرمند اور پریشان ہے کہ نہ جانے وہ سزا کیسی ہوگی؟ سزا کا طریقہ کیا ہوگا؟ سزا کا موقع کیا ہوگا آیا سزا چند لوگوں کے سامنے دی جائے گی یا بھری مجلس میں؟ پھر اس وقت خود استاذ کا مزاج کیسا ہوگا؟ غرض طرح طرح کے اندیشے اور خیالات اس کے اندر ہوتے ہیں، گویا پریشانی خود اصل سزا سے پہلے ایک سزا ہے ،ایسا ہی معاملہ دنیا اور آخرت کی سزا کا ہے، دنیا کی سزا فوری سزا ہے، اور آخرت کی سزا بہت سخت اور پوری انسانیت کے سامنے ہوگی، اللہ کے رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندہ کے ساتھ خیر کا معاملہ فرماتے ہیں تو دنیا ہی میں جلد اس کے گناہوں کی سزا دیتے ہیں اور جب کسی بندہ کے ساتھ برائی کا معاملہ فرماتے ہیں تو دنیا میں اس کے گناہوں کی سزا کو روک لیتے ہیں یہاں تک قیامت کے دن اس کے گناہوں کا پورا پورا بدلہ مل جاتا ہے۔(رواہ الترمذی، ریاض الصالحین، ص:۳۳ باب الصبر)

۶) یہ بھی دنیا کا مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ بڑا بننے کے لیے ''بڑے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں'' کسی کے منظور نظر اور محبوب بننے کے لیے اس کی ''جلی کٹی'' بھی سننی پڑتی ہے، طلبہ محنت و مشقت کے مختلف مراحل طے کرنے کے بعد سماج میں اعلیٰ مقام ومنصب پاتے ہیں، ماتحت افراد تنگی و تلخی میں اطاعت وفرمانبرداری کرنے سے اپنے ذمہ داروں کے محبوب اور منظور نظر ہوتے ہیں، پس جتنا بڑا انعام ومرتبہ اتنی ہی بڑی اور سخت آزمائش، وقت کے نبی اور پیغمبر اللہ تعالیٰ کے سب سے زیادہ مقرب اور محبوب ہوتے ہیں، اس لیے وہی سب سے زیادہ آزمائے جاتے ہیں، آپ ﷺ نے پوچھنے پر فرمایا کہ لوگوں

میں سب سے زیادہ سخت آزمائش انبیاء علیہم السلام کی ہوتی ہے، اس کے بعد درجہ بدرجہ دوسرے افضل لوگوں کی، آدمی اپنی دینداری کے لحاظ سے آزمایا جاتا ہے، اگر وہ دین میں سخت ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوگی ورنہ ہلکی۔ (مشکوۃ باب عیادۃ المریض) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ بڑا بدلہ بڑی آزمائش کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ جس قوم کو چاہتے ہیں اسے آزمائش میں مبتلا کرتے ہیں، پس ان میں جو شخص اس آزمائش پر راضی رہا اللہ تعالیٰ بھی اس سے راضی اور جو ناراض ہوا اللہ تعالیٰ بھی اس سے ناراض۔ (رواہ ترمذی بحوالہ ریاض الصالحین، ص: ۳۳ باب الصبر)

غرض یہ کہ بیماری اور پریشانی میں صبر و تحمل کی تعلیم و تلقین کا مقصد یہ ہے کہ بندہ اس موقع پر مایوس اور دل شکستہ ہونے، واویلا مچانے اور شکوہ وشکایت کرنے کے بجائے اللہ کی رحمت وشفقت کا امیدوار رہے، جیسے صحت وتندرستی کی امید میں آدمی ڈاکٹر کا انجکشن لیتا ہے اور حکیم کی کڑوی کسیلی دوائیں کھاتا ہے اور اس کی تکلیف برداشت کرتا ہے، یہ شکوہ وشکایت اور واویلا نہیں مچاتا کہ ڈاکٹر کو انجکشن چبھونے اور حکیم کو کڑوی کسیلی دوائیں کھلانے کے لیے کیا صرف میں ہی ملا ہوں! ایسے ہی آدمی بیماریوں اور پریشانیوں کو ''خدائی نشتر'' سمجھے اور یہ امید رکھے کہ اس کی تکلیف میرے گناہوں کی معافی اور درجات کی بلندی کا ذریعہ ہوگی، پس بیماری اور پریشانی کا ''خدائی نشتر'' نیکوکاروں کی روحانی وایمانی قوت کو بڑھاتا ہے، عام مسلمانوں سے گناہوں کی گندگی کو دور کرتا ہے، اور باغیوں اور نافرمانوں کے لیے عذابِ الٰہی کا فیصلہ ہے۔

روزنامہ منصف، ۱۱ر جولائی ۲۰۰۸ء

بیمار پر رحمن کی رحمتیں

یقیناً ہر انسان بیماری کو ناپسند کرتا ہے، اُس سے ڈرتا اور خوف کھاتا ہے، مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض مرتبہ پسندیدہ چیزوں کے حسن وخوبصورتی کو باقی رکھنے کے لئے ناپسندیدہ چیزوں سے نباہ کرنا پڑتا ہے، جیسے پیڑ پودوں کی صحت وتندرستی کے ئے جراثیم کش دوائیں ضروری ہیں، اسی طرح انسان کی صحت وتندورستی کے لئے بیماریاں بھی ایک ''جراثیم کش دوا'' ہی ہیں، انسان کو بہت زیادہ ''لوز موشنس'' ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ''پیٹ کی صفائی ہورہی ہے'' بہت زیادہ نزلہ اور زکام ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ ''فاضل اور فاسد مادہ کا اخراج ہورہا ہے'' بہرحال زندگی کے ساز پر صحت وتندرستی کا نغمہ گانے کے لئے بیماری و پریشانی کا سوز بھی سننا ضروری ہے۔

پھر یہ کہ زندگی کے بارے میں ایک مسلمان اور بندۂ مومن کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ زندگی کا مالک اللہ تعالیٰ ہیں، صحت اور بیماری بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے، اُس کو تو اپنے مالک ومولیٰ کا بے دام غلام اور سراپا محکوم بن کر اُس کے فیصلوں پر راضی برضا رہنا ہے، اس لئے مسلمان بیماری کو محض ایک مصیبت اور پریشانی کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ اس میں خدائے رحمان کی رحمتوں کے پہلوؤں کو تلاش کرتا ہے، چنانچہ عام مصائب اور پریشانیوں کے علاوہ احادیث میں تسلی اور تسکین کے کلمات بطورِ خاص بیماری اور بیمار سے متعلق بھی بیان کیے گئے، اوران میں شفقت ورحمت اور خیر کے پہلو کو اجاگر کیا گیا، اس خصوص میں چند روایات اس طرح ہیں:

۱) مریض پر اللہ تعالیٰ کی رحمت اور شفقت ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا ضرور قبول فرماتے ہیں، نہ صرف اس کے اپنے حق میں بلکہ دوسروں کے حق میں بھی، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جب تم کسی بیمار کے یہاں جاؤ تو اس سے اپنے لیے دعا کی درخواست کرو، اس لیے کہ قبولیت میں اس کی دعا فرشتوں کی دعا کی طرح ہے۔ (رواہ ابن ماجہ مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض)

۲) کسی پر بوجھ اور بار بنے بغیر ہنستے کھیلتے اور بیٹھے بٹھائے دنیا سے گذر جانا ایک اچھی علامت اور خوش نصیبی ہے، یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے، اس لیے کہ احادیث میں ارذل العمر سے پناہ مانگنے کی تعلیم دی گئی، ارذل العمر زندگی کا وہ مرحلہ ہے جس میں آدمی زندگی کی ضروریات اور بشری تقاضوں کی تکمیل کے دوسروں کا محتاج اور دست نگر ہوجائے، پھر یہ دعا بھی سکھائی گئی کہ اے اللہ! جب تک ہمیں زندہ رکھ ہمارے اعضاء وجوارح کی قوت کو باقی رکھ، لیکن اگر کوئی مسلمان یا اللہ کا نیک بندہ بیماری سے یا بستر مرض پر انتقال کر جائے تو اس کے بارے میں بدگمان نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ بیماری کی موت برائیوں کا کفارہ اور گناہوں کی بخشش کا ذریعہ ہے۔ حضرت یحییٰ بن سعید ؒ کی روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے میں ایک شخص کے انتقال پر خوشی کا اظہار کیا گیا کہ بغیر بیماری کے اس کی موت ہوگئی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تم پر رحم فرمائے تمہیں کیا معلوم اگر اللہ تعالیٰ اس کو کسی بیماری میں مبتلا کرتا تو یہی بیماری اس کے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی۔ (رواہ مالک مرسلاً مشکوٰۃ باب عیادۃ المریض) پھر یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ کی وفات حالتِ مرض میں بستر مرض پر ہوئی، ام المؤمنین حضرت عائشہ ؓ فرماتی ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے وقت آپ ﷺ پر موت کی شدت وتکلیف کو دیکھنے کے بعد آسانی اور سہولت سے کسی کی موت ہونے پر مجھے رشک نہیں آیا۔ (حوالہ سابق) ایک جگہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو بیمار ہوکر مرا وہ شہید کی موت مرا، عذاب قبر کے فتنہ سے وہ بچا لیا گیا اور اس کو صبح وشام جنت کا رزق دیا جاتا ہے۔ (حوالہ سابق)

۳) مریض کو چاہیے کہ وہ بیماری کو اللہ تعالیٰ کے انعام واکرام کا خاص انداز سمجھ کر اس کا شکر بجالائے، حضرت شداد بن اوس ؓ کی روایت ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کو یہ حدیثِ قدسی بیان کرتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: جب میں اپنے بندوں میں سے کسی بندۂ مؤمن کو بیماری میں مبتلا کرتا ہوں اور اس پر وہ میری تعریف کرتا ہے تو وہ گناہوں سے پاک صاف ہوکر اپنے بستر مرض سے ایسے اٹھتا ہے کہ گویا آج ہی اس کو اس کی ماں نے جنا ہو، اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے بیمار بندہ کو نیک اعمال کی ادائیگی سے روکے رکھا لیکن فرشتو! تم اس کا اجروثواب لکھتے رہو جیسا کہ صحت وتندرستی میں تم اس کا اجر لکھا کرتے تھے۔ (حوالہ سابق)

۴)اسی طرح بیمار کو چاہیے کہ وہ اپنی بیماری کو کوسے نہیں، اس سلسلہ میں بطور خاص بخار کا تذکرہ حدیث میں ہے، اللہ کے رسول اللہ ﷺ بخار میں مبتلا ایک بیمار صحابیؓ کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، اور فرمایا تم اتنا بے چین کیوں ہو؟ تو صحابیؓ نے بخار کو برا بھلا کہا، آپ نے فرمایا کہ تم بخار کو برا بھلا نہ کہو، کیوں کہ وہ گناہوں کی گندگی کو اس طرح صاف کرتا ہے جس طرح آگ لوہے کی گندگی صاف کرتی ہے، (ریاض الصالحین، ص:۶۰۲ باب کراھۃ سب الحمی)ایک مرتبہ آپ ﷺ مریض کی مزاج پرسی کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا: خوشخبری ہو، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے یہ میری آگ ہے جس کو میں اپنے مؤمن بندہ پر مسلط کرتا ہوں، تاکہ گناہوں کی وجہ سے دوزخ کی آگ کا حصہ جو اس کو قیامت میں ملے گا وہ دنیا ہی میں مل جائے۔

۵)مریض کو اس کا افسوس اور غم نہیں کرنا چاہیے کہ وہ بیماری اور معذوری کی وجہ سے عبادت اور دیگر دینی معمولات پورا نہ کرنے پر اجر وثواب سے محروم ہے، حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب کوئی بندہ بیمار ہو یا سفر میں جائے اور اس بیماری یا سفر کی وجہ سے اپنی عبادت وغیرہ کے معمولات پورا نہ کر پائے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس کے اعمال اسی طرح لکھے جاتے ہیں جس طرح وہ صحت وتندرستی اور مقیم رہنے کی حالت میں کیا کرتا تھا۔(صحیح بخاری/ ریاض الصالحین، ص:۷۴ باب فی بیان کثرۃ طرق الخیر)

۶)بیماری میں اللہ تعالیٰ کا خاص لطف وکرم مریض کے علاوہ مریض کی عیادت اور مزاج پرسی کرنے والوں کے لیے بھی ہے، حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس بندے نے کسی مریض کی عیادت کی تو اللہ کا منادی آسمان سے پکارتا ہے کہ تو مبارک اور عیادت کے لیے تیرا چلنا مبارک اور تو نے یہ عمل کر کے جنت میں اپنا گھر بنا لیا۔(سنن ابن ماجہ ابن ماجہ/ معارف الحدیث ۳/۷۴۴ کتاب الصلوٰۃ) غرض یہ کہ بیماری میں صحت وتندرستی کے اعمال کا ثواب، برائیوں کا کفارہ، گناہوں کی صفائی اور درجات کی بلندی یہ سب بیماری کے رحمت وشفقت ہونے کے پہلو ہیں، ضرورت ہے کہ مریض بیماری کے اس خاص پہلو پر غور وفکر کرے اور صبر وتحمل سے کام لے، اس لیے ایسے موقع پر بے صبری سے بیماری تو نہیں ٹلتی لیکن بیماری کا اجر وثواب ختم ہو جاتا ہے اور مریض اس سے محروم رہ جاتا ہے۔

۷) بیماری میں خیر کا پہلو یوں بھی ہے کہ یہ بیماری مریض کو اپنے رب سے قریب کردیتی ہے، بارگاہ الٰہی میں رجوع ہونے کا راستہ دکھاتی ہے اور مریض کی معصیت زدہ اور گناہوں سے آلودہ زندگی میں اصلاح کی نقیب بن کر نیکی وتقویٰ کا انقلاب لاتی ہے، اس سلسلہ میں حضرت عامر رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے ایک دفعہ بیماریوں کے سلسلہ میں کچھ ارشاد فرمایا (یعنی بیماری کی حکمتیں اور اس کے خیر کے پہلو کو بیان فرمایا) آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب بندۂ مؤمن بیماری میں مبتلا ہوتا ہے پھر اللہ تعالیٰ اس کو صحت وعافیت دیتا ہے تو یہ بیماری اس کے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہوجاتی ہے اور مستقبل کے لیے نصیحت وتنبیہ کا کام کرتی ہے۔ (خدا اور آخرت سے غافل وبے پروا) منافق آدمی جب بیمار پڑتا ہے اور اس کے بعد اچھا ہوجاتا ہے (تو وہ اس سے کوئی سبق نہیں اور کوئی نفع نہیں اٹھاتا) اس کی مثال اس اونٹ کی سی ہے جس کو اس کے مالک نے باندھ دیا، پھر کھول دیا، لیکن اس کو کوئی احساس نہیں کے کیوں باندھا اور کیوں کھولا؟ (سنن ابی داؤد/ معارف الحدیث ۳/ ۴۴۴ کتاب الصلوٰۃ)۔

اللہ تعالیٰ کی اَن گنت نعمتوں اور نوازشوں پر نظر رکھنے والا بندۂ مؤمن رنج وغم کے واقعات، موت ومصیبت کے حادثات اور بیماری وپریشانی کے حالات میں اپنے شکستہ دل اور غمگین جذبات کی یوں تسکین کرتا ہے:

دل کا ہر داغ تبسم میں چھپا رکھا ہے
ہم نے ہر غم کو غم ِیار بنا رکھا ہے
نوک ہر خار سے پوچھو وہ گواہی دیں گے
ہم نے کانٹوں میں بھی گلزار کھلا رکھا ہے
خود میرے دل نے تراشے ہیں غموں کے پیکر
میرے مولا نے تو ہر غم سے بچا رکھا ہے

صبر وشکر سے متعلق سلف صالحین کے سبق آموز واقعات

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی ذات گرامی میں تمہارے لئے زندگی گذارنے کا بہترین نمونہ موجود ہے، لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ (الاحزاب:۲۱) یہ بات اللہ تعالیٰ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں بھی فرمائی کہ ابراہیم اور اُن کے صاحبِ ایمان ساتھ ساتھیوں کے حالات تمہارے لئے ''اسوۂ حسنہ'' ہیں، قد کانت لکم اسوۃ حسنۃ فی ابراھیم والذین معہ........الخ (الممتحنۃ:۴) آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے لئے نمونہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم زندگی کے مختلف مراحل اور معاملات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو پیشِ نظر رکھیں، زندگی میں سردگرم حالات حضرات انبیاء کرام اوران کے بلند کردار ساتھیوں کو بھی پیش آئے، انھوں نے مصائب ومشکلات میں صبر کا دامن تھامے رکھا اور تسلیم ورضاء کے پیکر بنے رہے، پھر اسلامی تاریخ میں ہر دور کے سلفِ صالحین اللہ کے نیک بندوں، انبیاء کرام کے سچے پیروکاوں نے امتحان وآزمائش کے موقع صبر وتحمل کا عملی نمونہ پیش کیا، تاکہ بعد میں آنے والے ان کے واقعات سے سبق حاصل کریں۔

چنانچہ زندگی کے مختلف مراحل میں صبر وشکر اور تسلیم ورضاء سے متعلق سلف صالحین کے سبق آموز واقعات بھی ہیں، جو بیماری اور پریشانی کے موقع پر اجر وثواب سے متعلق احادیث پر ہمارے ایمان ویقین میں اضافہ کرتے ہیں، چند ایک واقعات ملاحظہ ہوں:

۱) حضرت عبداللہ بن محمد جہادی مہم کے سلسلے میں مصر کے ایک ساحلی علاقہ میں مقیم تھے، ایک مرتبہ ٹہلتے ٹہلتے ساحل سمندر پر پہنچے، وہاں ایک خیمہ میں دیکھا کہ ہاتھ پاؤں سے معذور اور آنکھوں کی

بینائی سے محروم ایک شخص پڑا ہے اور با آواز بلند کہہ رہا ہے:

”میرے رب! مجھے اپنی نعمتوں پر شکر کی توفیق عطا فرما، مجھے تو نے اپنی مخلوق میں سے بہت سوں پر فضیلت اور فوقیت بخشی ہے، اس فوقیت پر مجھے اپنی حمد وثناء کی توفیق عطا فرما۔“

حضرت عبد اللہ کو معذور شخص کی اس دعاء پر بڑی حیرت اور تعجب ہوا کہ ہاتھ پیر سے معذور اور بینائی سے محروم ہے، جسم میں زندگی کی تازگی کا کوئی اثر نہیں ہے پھر بھی اللہ کی حمد وثناء اور شکر گذاری میں مصروف ہے، چنانچہ وہ قریب آئے اور پوچھا کہ: محترم! آپ اللہ تعالیٰ کی کس نعمت پر شکر گذار ہیں؟ اس پر معذور شخص نے کہا:

”آپ کو کیا معلوم میرے رب کا میرے ساتھ کیا معاملہ ہے، بخدا اگر وہ آسمان سے آگ برسا کر مجھے راکھ کر دے، پہاڑوں کو حکم دے کہ مجھے کچل دے، سمندروں کو مجھے غرق کرنے کے لیے کہہ دے اور زمین کو مجھے نگلنے کا حکم دے تو میں کیا کر سکتا ہوں، میرے ناتواں جسم میں زبان کی بے بہا نعمت کو دیکھئے کہ یہ سالم ہے، کیا صرف اس زبان کی نعمت کا میں زندگی بھر شکر ادا کر سکتا ہوں۔“

اس کے بعد معذور شخص نے حضرت عبد اللہ سے اپنے خدمت گذار، گم شدہ بیٹے کا پتہ لگانے کی گذارش کی، ایسے صابر وشاکر بندہ کی خدمت کو سعادت سمجھ کر عبد اللہ بن محمد نے جنگل میں گمشدہ لڑکے کی تلاش شروع کر دی، اچانک وہ یہ دردناک منظر دیکھتے ہیں کہ اللہ کے اس صابر وشاکر بندہ کے گمشدہ لڑکے کی لاش مٹی کے دو تودوں کے درمیان بے گور و کفن پڑی ہوئی ہے جس کو جگہ جگہ سے درندوں اور پرندوں نے نوچ کھا رکھا ہے، عبد اللہ کے آنسو بھر آئے، وہ پریشان اور حیران ہوئے کہ کیسے معذور شخص کو اس کے بیٹے کی وحشت ناک موت کی خبر دیں، آخر بڑی مشکل سے لمبی چوڑی تمہید باندھنے کے بعد انھوں نے اس کو یہ المناک خبر سنائی، اس پر اللہ کے اس شاکر وصابر بندہ کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے، دل پر غموں کے بادل چھا جاتے ہیں تو آنکھوں سے اشکوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک نعمت ہے کہ غم کا غبار اشکوں میں ڈھل کر نکل جاتا ہے، بیٹے کی موت

پر شکوہ شکایت کرنے کے بجائے معذور شخص یوں گویا ہوئے:

حمد و ستائش اس ذات کے لیے ہے جس نے میری اولاد کو اپنا نافرمان نہیں پیدا کیا، اور اسے جہنم کا ایندھن بننے سے بچایا، پھر انا للہ...... پڑھا اور ایک چیخ کے ساتھ اللہ کے اس نیک بندہ کی روح پرواز کر گئی......

اب ہمیں کیا ستائیں گے دوراں کی گردشیں
اب ہم حدود سوز زیاں سے نکل گئے

معذور شخص کی اس اچانک موت پر عبداللہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے پھر انھیں معلوم ہوا کہ یہ معذور شخص کوئی اور نہیں بلکہ وقت کے بلند پایۂ مشہور محدث حضرت ابوقلابہ ہیں جو حضرت ابن عباس ؓ کے شاگرد اور رسول اللہ ﷺ کے سچے عاشق تھے، آپ صبر و استقامت کے پیکر اور تسلیم و رضاء کے خوگر تھے، تجہیز و تکفین کے بعد حضرت عبداللہ نے انہیں خواب میں دیکھا کہ وہ جنت کے باغات میں سیر و تفریح کر رہے ہیں، جنت کا لباس زیب تن کیے ہوئے ہیں، اور یہ آیت تلاوت کر رہے ہیں: سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ (سورۃ الرعد: ۲۴) صبر کرنے کے سبب تم پر سلامتی ہو اور آخرت کا گھر بہترین ٹھکانہ ہے، حضرت عبداللہ نے پوچھا کیا آپ وہی معذور شخص ہیں؟ فرمانے لگے:

''جی ہاں! میں وہی شخص ہوں اللہ تعالیٰ کے یہاں چند بلند مراتب اور درجات ایسے ہیں جن تک رسائی مصیبت میں صبر راحت میں شکر اور جلوت و خلوت میں خوف خدا کے بغیر ممکن نہیں، اللہ تعالیٰ نے اسی صبر و شکر کی بدولت مجھے ان نعمتوں سے سرفراز فرمایا'' (کتابوں کی درس گاہیں، ص: ۳۹ تا ۴۱ مؤلف ابن الحسن عباسی)

۲) حضرت عروۃ ابن زبیر مشہور تابعی ہیں، دوران سفر پیر کو چوٹ لگنے سے پاؤں زخمی ہو گیا، تکلیف کی شدت بے انتہاء تھی، طبیبوں کی رائے یہ ٹھہری کہ پاؤں کاٹنا ضروری ہے، حضرت عروہ ابن زبیرؒ نے اس کو منظور فرما لیا، مگر پاؤں کاٹنے سے پہلے بے ہوشی کے لیے نشیلی دوا کے استعمال سے انکار کر دیا اور فرمایا کہ میں کوئی لمحہ اللہ کی یاد سے غفلت میں نہیں گذار سکتا، بہر حال ہوش و حواس کی حالت میں آراء گرم کر کے آپ کا پیر کاٹا گیا، اس دوران آپ نے کسی تکلیف کا اظہار نہیں کیا، پھر اپنا

کٹا ہوا پاؤں سامنے رکھ کر فرمایا ''کیا غم ہے اگر مجھے ایک عضو کے بارے میں آزمائش میں ڈال کر باقی اعضاء کے سلسلہ میں امتحان سے بچالیا گیا'' ابھی آپ یہ کہہ ہی پائے تھے کہ خبر ملی آپ کا ایک بیٹا چھت سے گر کر انتقال کر گیا ہے آپ نے انااللہ و انا الیہ راجعون پڑھی اور فرمایا ''اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے ایک جان لی اور کئی جانوں کو سلامت رکھا'' یعنی باقی بیٹے باحیات تھے۔ (ملخص حوالہ سابق، ص: ۴۳)

۳) حضرت عمران بن حصینؓ صحابی رسول ہیں، بدن میں ایک ناسور پھوڑے کے پھٹنے سے ۳۲/ برس صرف چت لیٹے رہے، کروٹ نہیں لے سکتے تھے، کھانا پینا، عبادت کرنا اور قضاء حاجت کرنا وغیرہ سب کچھ ایک ہی حالت میں ہوتا تھا، اتنی سخت اور لمبی بیماری میں بھی آپ بالکل ہشاش بشاش رہتے تھے، چہرہ پر کسی تکلیف و پریشانی کے آثار نہیں ہوتے، لوگوں نے حیرت و تعجب سے عرض کیا کہ حضرت! اتنی شدید اور طویل بیماری میں آپ کے چہرہ پر جو بشاشت اور تازگی ہے وہ کسی صحت مند اور تندرست کو بھی نصیب نہیں، آخر اس کی وجہ؟ حضرت عمران بن حصینؓ فرماتے ہیں:

> ''میں نے بیماری پر صبر کیا، اس کو بھی اللہ کا عطیہ سمجھا اور اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہ کر یہ سمجھا کہ میرے لیے اللہ کی مصلحت یہی ہے، اس صبر کرنے کا پھل اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ فرشتوں سے مصافحہ کرتا ہوں، مجھے عالم غیب کی زیارت ہوتی ہے، عالم غیب میرے اوپر کھلا ہوا ہے۔''
>
> (ملخص بکھرے موتی ۲/ ۱۶۳ مؤلف مولانا یونس پالن پوری)

جنت اور اس کے باغات عالم غیب سے تعلق رکھتے ہیں، عالم غیب کی زیارت اور اس کا کھلا ہونے کے معنی یہ ہے کہ صحابیٔ رسول دنیا ہی میں جنت کے باغات اور اس کے خوبصورت و خوشنما مناظر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، تب ہی تو آپؓ کے چہرہ پر اتنی بشاشت اور تازگی ہے، مولانا محمد علی جوہر نے بہت خوب کہا ؎

ہر رنگ میں راضی برضا ہو نے کا تو مزہ دیکھ
دنیا ہی میں بیٹھے ہوئے جنت کی فضاء دیکھ

۴) مولانا محمد علی جوہر کا یہ شعر ''جگ بیتی'' نہیں خود شاعر کی ''آپ بیتی'' ہے، ہوا یوں کہ آپؒ

آزادیٔ وطن کی جدوجہد میں گھر سے میلوں دور جیل کی سزا کاٹ رہے تھے، اطلاع ملی کہ آپ کی چہیتی اور لاڈلی دوسری بیٹی آمنہ دق کی بیماری میں مبتلا ہے، فطری طور پر آپ کو اس کا صدمہ اور غم ہوا لیکن اس موقع پر آپ کے کہے گئے اشعار جذبۂ صبر اور تسلیم ورضا کی اعلیٰ مثال ہیں، فرماتے ہیں:

میں ہوں مجبور اللہ تو مجبور نہیں
تجھ سے میں دور سہی وہ تو مگر دور نہیں
امتحان سخت سہی پر دل مؤمن ہی وہ کیا
جو ہر اک حال میں امید سے معمور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں

تسلیم ورضاء کے ان جذبات کے بعد آخر میں اپنی عاجزی اور بندگی کا یوں اظہار کرتے ہیں:

تیری قدرت سے خدایا تری رحمت نہیں کم
آمنہ بھی جو شفا پائے تو کچھ دور نہیں
میری اولاد کو بھی مجھ سے ملا دے یارب
تو ہی کہہ دے تری رحمت کا یہ دستور نہیں

(ملخص، محمد علی ذاتی ڈائری کے چند اوراق ص: ۱۱۷/ از مولانا عبدالماجد دریابادیؒ)

مصائب وپریشانیوں میں صبر واستقامت کے یہ معنی ہر گز نہیں کہ آدمی ایسے مواقع پر ''دعا اور دوا'' سے بالکل غافل اور بے پروا ہو جائے، بیماری اور پریشانی میں بارگاہِ الٰہی میں دعا وگریہ وزاری اور اسباب کے درجہ میں علاج کی تدبیر وکوشش دراصل اپنی بے بسی، بے چارگی، عاجزی اور بندگی کا اظہار ہے، دعا اور علاج درحقیقت خدا تعالیٰ کے حضور اس بات کا اقرار ہے کہ ''اے اللہ ہم تیرے عاجز، کمزور اور ناتواں بندے ہیں، ہم امتحان وآمائش کے قابل نہیں، ہم صرف تیرے رحم وکرم کے محتاج ہیں، اس لیے قرآن مجید میں بندوں کو دعا سکھائی گئی کہ رَبَّنَا لاَتُحَمِّلْنَا مَالاَ طَاقَةَ لَنَابِهٖ (سورۃ البقرۃ:۲۸۶) (اے ہمارے پروردگار ہم پر ایسا بار نہ ڈال جس کو سہنے کی ہم میں طاقت نہیں) اس کے

علاوہ قرآن مجید میں جلیل القدر پیغمبر حضرت ایوب علیہ السلام جن کا صبر ضرب المثل ہے، ان کی دعا کا ذکر ہے: رَبِّ اِنِّیْ مَسَّنِیَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِیْنَ (الانبیاء:۸۳) (اے میرے پروردگار! مجھے تکلیف پہنچی ہے اور آپ تمام رحم کرنے والوں میں سب سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں) ایک مرتبہ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا کہ دعا میں کیا مانگا جائے؟ آپ ﷺ نے فرمایا سَلُو اللّٰہَ الْعَافِیَۃَ اللہ سے عافیت مانگو، عافیت یہ ہے کہ آدمی کی زندگی صحت وتندستی، خیر وبرکت کی روزی، عزت وسربلندی اور دین وایمان کی سلامتی سے آباد وشاد رہے، غرض یہ کہ مصائب ومشکلات کے موقع پر سلف صالحین کے صبر اور تسلیم ورضاء کے یہ واقعات بندۂ مومن کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ ؎

مالک تری رضاء رہے اور تو ہی تو رہے
باقی نہ میں رہوں نہ میری آرزو رہے

روزنامہ منصف، ۱۱ر جولائی ۲۰۰۸ء

خوف خدا ، الفت احمدؐ نہ چھوڑ اے اکبر
منحصر ہے ان ہی دولفظوں پہ سارا اسلام

سرمایۂ ایمان ونجات!

کی محمد سے وفا تو نے کہ ہم تیرے ہیں

اس وقت عالمِ اسلام میں شانِ رسالت میں گستاخی کے واقعہ کے خلاف جو شدید غم وغصہ، بے چینی اور احتجاج کی لہر جاری ہے وہ بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں اپنی بے پناہ عقیدت اور والہانہ وابستگی اور وارفتگی کا ایک حقیر سا نذرانہ ہے، ڈنمارک کی اشیاء کے معاشی بائیکاٹ کی وجہ سے یورپی سرمایہ داروں کی آنکھوں سے نیند غائب ہوگئی، معاشی اداروں کی چولیں ہل گئیں، بڑی بڑی سوپر مارکٹس لرزہ براندام ہیں، ناموسِ رسالت ﷺ کے تحفظ کے سلسلہ میں معاشی بائیکاٹ کا یہ فیصلہ ایک چھوٹا اور ہلکا سا اقدام ہے، ورنہ اسلام کی روشن وتابناک تاریخ گواہ ہے کہ اہل ایمان نے رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں اپنی جانوں کو قربان کردیا اور یہ تمنا وآرزو لے کر شہید ہوئے کہ اے کاش! سو مرتبہ مجھے زندگی دی جاتی اور ہر بار آپ ﷺ کی عظمت وناموس کی پاسبانی میں اپنی زندگی آپ ﷺ پر نثار ونچھاور کردیتا۔

اسلامی تاریخ کے ان تابندہ نقوش کو ذرا ذہن میں لایئے اور نگاہِ تصور سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان سبق آموز اور اثر انگیز واقعات کو پڑھئے کہ کس طرح ان برگزیدہ ہستیوں اور پاکیزہ نفوس نے بارگاہِ رسالت مآب ﷺ میں اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کیا، ان اہل وفاء اور اربابِ صدق وصفا میں مرد وخوتین، بچے، جوان اور بوڑھے سبھی شامل ہیں۔

لیجئے! یہ ہے بدر کا میدان اور اس میں کھڑے ہیں دو معصوم نونہال، ایک کا نام ہے عمرو بن جموح اور دوسرے کا نام معاذ بن عفراء، صحابی رسول حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میدانِ جنگ میں صف بندی کے وقت میری دونوں طرف آزو باز و یہ دو کم عمر لڑکے کھڑے تھے، مجھے کچھ افسوس سا ہونے لگا کہ جنگ کے نازک موقع پر یہ معصوم کم عمر بچے میرے کیا کام آسکتے ہیں؟ ابھی میں اسی سوچ وفکر میں گم تھا کہ اتنے میں ایک نے مجھے ہلا کر پوچھا چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو

جانتے ہیں؟ اس کی بات ابھی ختم نہ ہو پائی تھی کہ دوسرے لڑکے نے کہا چچا جان! ہم نے سنا ہے کہ ابوجہل رسول اللہ ﷺ کو ستاتا ہے اور آپ ﷺ کو برا بھلا کہتا ہے، میں نے کہا کہ تم نے ٹھیک سنا ہے ،لیکن یہ تو بتاؤ! تم دونوں اس کا پتہ معلوم کر کے کرو گے کیا؟ دونوں معصوم بچوں نے بیک آواز ہوکر کہا چچا جان! آج ہم نے عہد کر رکھا ہے کہ یا تو ابوجہل اس زمین پر رہے یا ہم رہیں، گفتگو ختم ہوئی، کچھ دیر کے بعد کفار کے لشکر کا سردار ابوجہل اپنی صفوں کا جائزہ لینے کے لیے نکلا، میں نے ان دونوں معصوم بچوں کو اشارہ کیا کہ یہ دیکھو تمہارا مطلوب ہے، جس کے بارے میں ابھی تم مجھ سے پوچھ رہے تھے، میرا اتنا کہنا تھا کہ یہ دونوں معصوم بچے شاہین کی طرح اس پر جھپٹے اور تھوڑی دیر میں اس کا کام تمام کر دیا اور اس طرح دشمنانِ اسلام کا ایک نامور، طاقتور اور سپہ سالار اسلام کے دو ننھے مجاہدین کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہوکر جہنم رسید ہو گیا۔

بچپن انسان کی زندگی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنے بچوں کی تین عادتوں کی بنیاد پر پرورش اور تربیت کرو پہلی اور دوسری یہ کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل بیت کی محبت ان کی گھٹی میں بٹھاؤ اور تیسرے یہ کہ انھیں قرآن مجید کی تعلیم دو: اربوا اَوْلَادَکُمْ عَلٰی ثَلَاثِ خِصَالٍ، حُبُّ نَبِیِّکُمْ وَحُبُّ اٰلِہٖ وَتِلَاوَۃِ الْقُرْآنِ۔ اسلامی تاریخ کے یہ دونوں ننھے مجاہد سن وسال کے اعتبار سے یقینا کم عمر اور چھوٹے تھے، لیکن ان کے عزم وحوصلہ شجاعت و بہادری کے اور جذبات کے سامنے دنیا کے بڑے بڑے سورما، رستم اور گاما پہلوان بھی "بونے" نظر آتے ہیں۔

غزوۂ احد کا موقعہ ہے، لیکن ابھی جنگ کا کوئی قطعی اور آخری فیصلہ نہیں ہوا، اسلامی فوج کے سپہ سالار اور کمانڈران چیف سید الاوّلین والآخرین خاتم النبیّین حضرت محمد ﷺ اپنے ساتھیوں سے رائے مشورہ فرمارہے ہیں کہ جنگ مدینہ سے باہر نکل کر کی جائے یا مدینہ میں رہ کر کی جائے؟ مختلف رائے سامنے آتی ہیں، حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اے اللہ کے رسول! ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم نہیں ہیں جو یہ کہے کہ جنگ کے لیے آپ جائیں اور آپ کا رب جائیں، ہم تو یہیں بیٹھیں رہیں گے: اِذْھَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَا اِنَّا ھٰھُنَا قَاعِدُوْنَ ہم تو وہ لوگ ہیں کہ اگر آپ ہمیں "برک غماد" (مدینہ سے بہت دور جگہ کا نام ہے) چلنے کا حکم فرمائیں تو ہم میں سے ایک فرد بھی پیچھے

نہیں رہے گا۔حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کی تقریر سے رسول اللہ ﷺ بہت خوش ہوئے، پھر فرمانے لگے کہ لوگو! تم بھی کچھ کہو! آپ ﷺ کا اشارہ انصار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی طرف تھا، انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! ہم آپ پر ایمان لائے ،اور آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کیا، ہم نے اس کا پختہ عہد کیا کہ ہم اپنے بال بچوں سے بڑھ کر بلکہ اپنی جانوں سے زیادہ آپ کی حفاظت کریں گے، یا رسول اللہ! آپ ہمیں صرف مدینہ سے باہر نہیں بلکہ آگ کے سمندر میں کود جانے کا حکم فرمائیں تو قسم بہ خدا! آپ کے ایک اشارۂ ابرو پر انصار کی پوری جماعت آگ میں چھلانگ لگا دے گی ، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے ان جذبات کو سن کر رسول اللہ ﷺ کا چہرۂ انور فرطِ مسرت سے دمک اٹھا، اور آپ ﷺ نے تمام مسلمانوں کو میدانِ احد کی طرف کوچ کرنے کا حکم فرمایا۔

جنگِ احد کا آغاز ہو چکا ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنی بے مثال اور لازوال شجاعت و بہادری کے جوہر دکھا رہے ہیں، شیر خدا حضرت علی رضی اللہ عنہ، سید الشہداء امیر حمزہ رضی اللہ عنہ ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم دشمنانِ اسلام کے چھکے چھڑا دئے اور نعشوں کے پشتے لگا دئے ،اس طرح اسلامی لشکر ایک تاریخ ساز فتح حاصل کرنے کے قریب تھا ہی کہ ایک ''چوک'' نے جنگ کی کایا پلٹ دی ، جنگ کا نقشہ بدل گیا، خود رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے، حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کے سمیت ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس جنگ میں شہید ہوئے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم زخموں سے چور اور غموں سے نڈھال مدینہ واپس ہو رہے ہیں، راستہ میں ایک خاتون سے سامنا ہوتا ہے، کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بہن! تمہارے شوہر شہید ہو گئے، وہ کہتی ہے اللہ تمہیں امان میں رکھے، یہ تو بتاؤ آقا حضرت محمد ﷺ کیسے ہیں؟ جواب دیا جاتا ہے کہ الحمد للہ وہ بخیر و عافیت ہیں، اس پر خاتون کو یقین نہیں ہوتا، وہ آگے بڑھتی ہے اور بڑھتی چلی جاتی ہیں، کچھ دور جانے کے بعد اس کو بتایا جاتا ہے کہ تمہارے بھائی شہید ہو گئے، وہ کہتی ہے اللہ تمہیں خوش رکھے! یہ تو بتاؤ کہ آقا کیسے ہیں؟ جواب دیا جاتا ہے کہ الحمد للہ وہ محفوظ ہیں، اس پر بھی وہ یقین نہیں کر پاتیں، پھر وہ آگے بڑھ جاتی ہیں، ابھی وہ تھوڑی دور آگے بڑھی نہیں کہ پھر خبر دی جاتی ہے کہ تمہارا بیٹا شہید ہو گیا،

اس کو بھی وہ سن کر دعائیہ کلمات کہہ کر آگے بڑھ گئیں، ابھی کچھ دور ہی گئی تھیں کہ اتنے میں رسول اللہ ﷺ کے چہرۂ انور پر نظر پڑ گئی، خاتون بے ساختہ پکار اٹھتی ہے یا رسول اللہ! اگر آپ موجود ہیں تو پھر کسی کے چلے جانے کا کوئی غم نہیں، آپ کے رہتے ہوئے ساری مصیبتیں ہیچ ہیں، سلام ہو اس پاکباز اور جانثار خاتون پر!

کی محمد سے وفا تو نے کہ ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کہ لوح و قلم تیرے ہیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وفاداری اور جانثاری کے یہ عظیم واقعات ہمارے عقیدۂ وایمان کا انمول سرمایہ اور ہمارے دین و مذہب کی روشن و تابناک تاریخ کا لائق فخر اثاثہ ہے، ان واقعات کو پڑھنے اور سننے سے آج بھی برف جیسے ہمارے یخ بستہ ایمان کو گرمی اور حرارت ملتی ہے، ہماری ایمانی زندگی میں تازگی اور توانائی پیدا ہوتی ہے، جب تک ہمارے ایمان اور یقین کو ان روشن واقعات سے ایندھن اور آکسیجن ملتا رہے گا اپنی تمام عملی کمزوریوں اور اخلاقی کوتاہیوں کے باوجود دنیا کی کوئی طاقت ہمیں ایمان کی دولت سے محروم نہیں کرسکتی اور نہ آقاء دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم سے ہماری غلامی کے رشتہ کو ختم کرسکتی ہے۔

نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر

رسول اللہ صلی علیہ وسلم سے بے انتہا عشق ومحبت ایک مسلمان و بندۂ مؤمن کے لیے شرط اول ہے، آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اٹوٹ وابستگی اور والہانہ رفتگی کیسی ہونی چاہیے؟ اس کی بے نظیر اور لازوال مثالیں اور نمونے صحابہ کرامؓ کی زندگیوں میں ہیں، ان برگزیدہ ہستیوں نے عشق ومحبت اور فدائیت وفنائیت کی ایسی تاریخ رقم کی پوری انسانی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ہے اور نہ تا قیامت مل سکتی ہے، صحابہ کرام کی جاںنثاری وجانبازی اور قربانی کے والہانہ جذبات اور واقعات صرف جنگ کے میدان ہی میں نہیں ہوتے، بلکہ روزمرہ کی زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھرپور عقیدت ومحبت کے ساتھ پیش آئے، جنگ میں عموماً صورتِ حال نازک ہوتی ہے ،فطری طور پر ہر شخص کچھ کر دکھانے کا جذبہ اور حوصلہ اپنے اندر رکھتا ہے، برخلاف روزمرہ کی زندگی کے ،اس میں آدمی کے ساتھ رہتے رہتے کچھ بے تکلف سا ہوجاتا ہے، تقدس وعظمت اور ادب واحترم کی جانب اتنا دھیان نہیں رہتا، لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی عقیدت ومحبت میں اس طرح کا فرق وامتیاز نہ رہا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق سے ان کا جذبۂ فدائیت اور فنائیت ہر جگہ اور ہمیشہ یکساں رہا، خلوت وجلوت ، سفر وحضر اور جنگ ہو یا امن ، ہر موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی بھرپور وارفتگی اور اٹوٹ وابستگی کو نبھائے رکھا، اس تمہیدی گفتگو کو ذہن میں رکھ کر نگاہِ تصور سے صلح حدیبیہ کے واقعہ کو پڑھیے!

موقع ہے صلح حدیبیہ کا ، اس میں عرب کے ماہر وممتاز سفارت کار آتے ہیں ،قریش مکہ اور مسلمانوں میں صلح جوئی اور جنگ بندی کے امور پر غور وخوض ہوتا ہے، بالآخر حضرت سہیل بن عمرو (جو اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) کی آمد اور طویل گفت وشنید کے بعد قریش مکہ اور مسلمانوں کے درمیان جنگ بندی اور اس کے ذیل میں دیگر امور پر معاہدہ قطعیت پاتا ہے،

حضرت سہیل بن عمرو عرب کے ماہر سفارت کاروں میں تھے، نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، مختلف باتیں ہوئیں، رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے دوران انھوں نے آپ ﷺ کے ساتھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے والہانہ لگاؤ اور عقید تمندانہ برتاؤ کو بہت قریب سے دیکھا، پھر جب وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس سے واپس گئے تو سردارانِ مکہ کے سامنے اپنے تاثرات ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"بھائیو! امیروں اور رئیسوں کا تو ذکر ہی کیا ہے، میں نے نجاشی کی بزم شاہانہ اور قیصر وکسریٰ کے دربارِ خسروری کا طمطراق بھی دیکھا ہے، مگر محمد بن عبداللہ کے ساتھی ان سے جس قدر عقیدت اور وابستگی رکھتے ہیں اور جو جاہ ووقار میں نے وہاں دیکھا وہ کہیں نظر نہیں آیا، خدا کی قسم! اگر آپ ﷺ کو بھی تھوکنے کا اتفاق ہوتا ہے تو اس تھوک کو ان کے ساتھی زمین پر گرنے نہیں دیتے، بلکہ ہاتھ میں لے کر اپنے جسم اور چہرہ پر مل لیتے ہیں، ادھر آپ ﷺ نے کسی بات کا حکم دیا ادھر فوراً تعمیلِ حکم کے لیے ہلچل شروع ہوگئی، جب آپ ﷺ وضو کرتے ہیں تو آپ ﷺ کے ساتھی وضو کا پانی لینے کے لیے ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑتے، جب آپ ﷺ بات کرتے ہیں تو آپ ﷺ کی عظمت ووقار کا یہ حال کہ کوئی صحابی آپ ﷺ کو نظر بھر کر نہیں دیکھ سکتا"

یہ دیکھئے! قتل گاہ تیار ہو رہی ہے، پھانسی کا پھندا لگایا جا رہا ہے، سولی کا تخت سج رہا ہے، میدان میں لوگوں کی بھیڑ اور اژدحام جمع ہے کہ سزا کا نظارہ کر سکے، کیسی سزا اور کس جرم کی سزا! جرم یہ تھا کہ وہ مسلمان تھے، اسلام کے علمبردار اور شریعتِ محمدی کے پیروکار تھے، رسول اللہ ﷺ کی محبت میں گرفتار تھے، اسلام سے عداوت اور نفرت کے ہر دور میں یہ چیزیں جبر وانتقام اور ظلم وجور کا معیار تھیں، وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اِلَّآ اَنْ يُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَمِيْدِ، (سورۃ البروج:۸) غرض یہ کہ قتل گاہ کے میدان میں انتظار کی گھڑیاں بہت شاق گذر رہی تھیں، اتنے میں ایک شخص کو سولی کے تخت پر لایا جاتا ہے، پھانسی کا پھندا پہننے میں چند لمحے باقی رہ گئے ہیں، عین اسی موقع پر ابوسفیان (جو اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے) آگے بڑھتے ہیں اور اس شخص سے کہتے ہیں:

''اب تم بھوکے پیاسے قتل ہونے جارہے ہو، کیا تم یہ پسند کروگے
کہ تم اس وقت اپنے اہل وعیال کے درمیان ہوتے اور ہم تمہاری
جگہ (نعوباللہ) محمد ﷺ کی گردن........''

اتنا سننا تھا کہ اس شخص کے اندر جذبۂ فدائیت نے زبرست انگڑائی لی، عقیدت ومحبت کا پیالہ چھلک پڑا، کچھ دیر کے لیے وہ مستانہ وار اور دیوانہ وار جھوم گیا اور پھر پوری قوت اور جرأت کے ساتھ کہا:

''قسم بخدا! مجھے ہرگز یہ پسند نہیں کہ میں اپنے اہل وعیال اور بال
بچوں میں رہوں اور رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ایک کانٹا بھی
چبھے''

یہ جواب سن کر ابوسفیان بول اٹھے: واللہ! میں نے آج تک کسی کا کوئی ایسا دوست نہیں دیکھا جیسے محمد ﷺ کے دوست ہیں، اس واقعہ کے کردار اور رول ماڈل ہے صحابیٔ رسول حضرت زید بن الدشنہ رضی اللہ عنہ، جنہیں عضل وقارہ کے قبیلہ والوں نے تبلیغ اسلام اور تعلیمِ اسلام کے نام پر رسول اللہ ﷺ سے مانگ کر لے گئے، درمیانِ راستہ میں ہی ان کے ساتھیوں کو دھوکہ دے کر شہید کردیا گیا اور انھیں قید کرلیا گیا، پھر بھوکا پیاسا رکھ کر انھیں شہید کیا گیا، اس طرح صحابیٔ رسول اپنی زندہ جاوید شہادت کے ذریعہ بعد میں آنے والے عاشقانِ مصطفیٰ کے نام یہ پیغام دے گئے ؎

جان اپنی محمدؐ پہ قربان کر
جینے والے اگر زندگی چاہیے

یہ تو تھیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بلند وبرگزیدہ ہستیاں، رسول اللہ ﷺ کے تئیں جن کے والہانہ اور عاشقانہ جذبات کو پڑھ کر اور سن کر ایمان میں تازگی اور روح میں بالیدگی اور اعمال کی سرد انگیٹھی گرم ہونے لگتی ہے، ان کے نامِ نامی اسمِ گرامی آنے پر دلوں میں رقت طاری ہوجاتی ہے اور پیشانیاں بصد ادب واحترام جھکی جاتی ہے، محبتِ رسول ﷺ کا یہ چراغ ہر امتی کے دل میں روشن رہتا ہے، حتیٰ کہ ایک گنہ گار مسلمان جو معاصی کا خوگر، لاابالی وآوارہ، ہر دم غفلت ومعصیت کا دلدادہ، اس

کے سامنے بھی جب رسول اللہ ﷺ کا نام مبارک آ جائے تو اس کی آنکھوں میں نور اور محبت کا سرور جھلکنے اور چھلکنے لگتا ہے۔

دیکھئے! یہ ہیں اختر شیرانی، اردو کے مشہور شاعر، شراب کے رسیا، جام و مینا ہر دم ساتھ موجود، لاہور کی ہوٹل میں کمیونسٹ نوجوانوں کے ساتھ محفل سجی ہے، شراب کی دو بوتل چڑھا چکے ہیں، بے ہوشی، مدہوشی اور رعشہ کی کیفیت طاری ہے، اس حالت میں بھی اپنی ''انا'' کا احساس ہے، شاعر شاذ و نادر ہی کسی کو مانے، کمیونسٹ نوجوانوں نے ''فیض'' کے بارے میں سوال کیا، طرح دیئے گئے، ''سردار جعفری'' کا نام لیا تو مسکرائے، ظہیر کاشمیری کے بارے میں پوچھا تو کہا: نام سنا ہے، احمد ندیم قاسمی؟ کہا میرا شاگرد ہے، کمیونسٹ نوجوانوں نے دیکھا کہ ترقی پسند تحریک ہی کے منکر ہیں تو بحث کا رخ پھیر دیا، پوچھا ''حضرت! فلاں پیغمبر کے بارے میں کیا خیال ہے؟ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں، نشہ میں چور تھے، زبان پر قابو نہیں تھا، چونک کر فرمایا: کیا بکتے ہو؟ ادب و انشاء یا شعر و شاعری کی بات کرو، نوجوانوں میں سے کسی نے فوراً افلاطون کی طرف رخ موڑ دیا کہ ان کے مکالمات کی بابت کیا خیال ہے؟ پھر ارسطو اور سقراط کے بارے میں سوال ہوا، اس وقت اختر شیرانی زبردست موڈ میں تھے، فرمایا اجی یہ پوچھو کہ ہم کون ہیں؟ یہ ارسطو، افلاطون یا سقراط آج ہوتے تو ہمارے حلقے میں بیٹھتے، ہمیں ان سے کیا کہ ہم ان کے بارے میں رائے دیتے پھریں، اس لڑکھڑاتی آواز کا فائدہ اٹھا کر ایک کمیونسٹ جوان سوال کر بیٹھا کہ حضرت محمد ﷺ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟..........

اللہ اللہ، ایک شرابی جیسے کوئی برق تڑپی ہو، بلور کا گلاس اٹھایا اور اس کے سر پر دے مارا ...... بدبخت! ایک عاصی سے سوال کرتا ہے، ایک رُوسیاہ سے پوچھتا ہے! ایک فاسق سے کیا کہلوانا چاہتا ہے؟ تمام جسم کانپ رہا تھا، یکا یک رونا شروع کیا، ہچکی بندھ گئی ...... ایسی حالت میں تم نے یہ نام کیوں لیا؟ تمہیں جرأت کیسے ہوئی؟ گستاخ! بے ادب ''باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار'' اس شریر سوال پر توبہ کرو، تمہارا خبثِ باطن سمجھتا ہوں ...... خود قہر و غضب کی تصویر ہو گئے، اس نوجوان کا حال یہ تھا کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، اس نے بات کو موڑنا چاہا، مگر اختر کہاں سنتے تھے، اسے اٹھوا دیا

، پھر خود اٹھ کر چلے گئے، تمام رات روتے رہے، کہتے تھے...... یہ لوگ اتنے نڈر ہو گئے ہیں کہ آخری سہارا بھی ہم سے چھین لینا چاہتے ہیں، میں گنہ گار ضرور ہوں، لیکن یہ مجھے کافر بنا دینا چاہتے ہیں۔

(مجھے ہے حکمِ اذاں ص:۱۷-۱۸)

اسلامی تاریخ کے یہ تابندہ نقوش، روشن وتابناک واقعات ملتِ اسلامیہ کا عظیم سرمایہ اور قیمتی اثاثہ ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھرپور وارفتگی اور اٹوٹ وابستگی ہماری زندگی کی اصل پونجی ہے، انسانی تاریخ گواہ ہے کہ مسلمان اپنی اس پونجی کی پاسبانی ونگہبانی میں حددرجہ حساس اور غیرت مند واقع ہوئے ہیں، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمارے اس والہانہ لگاؤ اور عقیدت مندانہ تعلق کو دنیا پاگل پن اور دیوانگی کہتی ہے، خدا گواہ ہے اور سچی بات یہی ہے کہ یہ جنون ودیوانگی ہمارے لیے عقل مندی ودانشمندی سے ہزار درجہ بڑھ کر اور بہتر ہے، ہم اس کو سرمایۂ نجات اور کشتیِ حیات سمجھتے ہیں، کسی بھی ذات اور ہستی سے حقیقی محبت اور سچی عقیدت اس کی اتباع وپیروی کا جذبہ پیدا کرتی ہے، خدا کرے کہ اسلام تعلیمات سے دوری اور بیزارگی کے اس دور میں ڈنمارک اخبار کی گستاخانہ حرکت پر مسلمانوں کی اسلامی حمیت اور ایمانی غیرت کا یہ مظاہرہ ان میں اتباعِ نبوی ﷺ کا نیا جوش، نیا جذبہ پیدا کرے اور اس مسئلہ پر عالمِ اسلام کا اتفاق ملتِ اسلامیہ کے اتحاد ویکجہتی کا سنگِ میل ثابت ہو، پھر مسلمان محبتِ رسول ﷺ کے جذبہ سے سرشار ہو کر آپ ﷺ کی مبارک سنتوں کے سانچہ میں ڈھل کر دورِ اوّل کے جاںنثار وجانباز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تاریخ دہرائیں، جس میں ظلم وجور کا خاتمہ ہوگا، عدل وانصاف کا بول بالا ہوگا، اخوت ومحبت کا پیغام عام ہوگا۔

نگاہِ عشق ومستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی طٰہٰ، وہی یٰسین، وہی قرآں وہی فرقاں

......روزنامہ منصف: ۱۰/مارچ ۲۰۰۶ء......

شمع رسالتؐ کے ننھے پروانے

بات ہے آج سے چودہ سوسال قبل پرانی، لیکن ایسی پرانی نہیں کہ اس کے پڑھنے اور سننے سے طبیعت میں بوریت اور اکتاہٹ ہو، بات وہ ہے جس کے پڑھنے سے جذبات وحوصلوں کو زندگی اور توانائی ملتی ہے، عقائد ونظریات میں پختگی اور بہتری آتی ہے، فکرونظر میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی ہے، گناہ اور معصیت سے آلودہ اخلاق وکردار میں پاکیزگی آتی ہے اور افراد صالح تبدیلی سے ہمکنار ہوتے ہیں، جس زمانہ کی یہ بات ہے اُس زمانہ میں بھی موجودہ دور کی طرح اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت ودشمنی کا ماحول تھا، فرق صرف اتنا ہے کہ جب ابوجہل، عتبہ، ولید بن مغیرہ وغیرہ **ائمة الکفر** (کفار کے امام ومقتداء) کے ہاتھوں میں کمان تھی، آج ان ہی کے روپ میں "امنِ عالم" کے نام نہاد ٹھیکہ دار اسلام دشمنی کا رول ادا کررہے ہیں، حق وباطل کی کشمکش، ہدایت وگمراہی کی چپقلش سچ اور جھوٹ کی آویزش روزِ اوّل سے جاری ہے، شاعر کی زبان میں ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

غزوۂ بدر "چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی" کا پہلا ٹکراؤ اور تصادم تھا، یہ حق وباطل کے درمیان پہلی باضابطہ منظم جنگ تھی، اس موقع پر صحابہ کرامؓ کے اندر اسلام کی سربلندی اور نگہبانی کے جذبات اور حوصلوں کا ایک طوفان برپا تھا، آقائے دوجہاں نبی آخرالزماں ﷺ سے وفاداری اور غلامی کے احساسات کا سمندر ان کے قلوب میں ٹھاٹیں ماررہا تھا، اس کا کچھ اندازہ صحابہ کرامؓ کی تقریروں سے ہوتا ہے جو جنگ کا فیصلہ لینے سے متعلق رسول اللہ ﷺ کے روبرو اس موقع پر کی گئیں، حضرت مقداد بن عمروؓ عرض کرتے ہیں:

"اے اللہ کے رسول! جدھر رب کا حکم ہے اُس طرف لے چلیے، ہم آپ کے ساتھ ہیں، ہم بنی اسرائیل (موسیٰ علیہ السلام کی قوم) کی طرح نہیں ہیں جنہوں نے اپنے نبی سے کہا تھا کہ آپ اور آپ کا رب جا کر جنگ کریں ہم تو یہیں بیٹھیں رہیں گے: **اذھب انت وربک فقاتلا انا ھھنا قاعدون**۔ خدا کی قسم اگر آپ ہمیں برکِ غماد (دور دراز مقام) چلنے کے لئے فرمائیں تو ہم چلنے تیار ہیں"۔

اس کے بعد مدینہ میں انصار کے سردار حضرت سعد بن معاذؓ تمام انصارِ مدینہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ سے جاں نثاری، وفاداری اور وارفتگی کا اظہار یوں کرتے ہیں:

"میں اس وقت سارے انصار کی طرف سے بول رہا ہوں، اللہ کے رسول! ہم آپ پر ایمان لائے ہیں، ہم نے آپ کو سچا سمجھا ہے، ہم نے گواہی دی ہے کہ آپ کی باتیں حق ہیں، ہم آپ کی اطاعت کا عہد کر چکے ہیں، اللہ کے نبی! اب آپ نے جس کام کا ارادہ فرمایا ہے بے جھجک اس کے لیے قدم بڑھائیے، خدا کی قسم! اگر آپ ہمیں لے کر سمندر میں کود پڑیں تو ہم بخوشی تیار ہیں، ہم میں کوئی پیچھے رہنا والا نہیں، ہماری دولت بھی آپ کے قدموں پر ہے، جتنی چاہے لے لیجئے، جتنی ہی زیادہ آپ لیں گے ہمیں اتنی ہی زیادہ خوشی ہوگی......"

عشق ومحبت اور وفاداری و جاں نثاری کے جوش وجذبات سے بھری ان تقاریر کے بعد رسول اللہ ﷺ نے باضابطہ جنگ کا فیصلہ اور اُس کا اعلان فرمایا۔

نگاہِ تصور میں اسی غزوۂ بدر کے میدان کو سامنے رکھئے! یہ دیکھئے مجاہدینِ اسلام کی صف بندی ہو رہی ہے، جو صحابی کم عمر اور کمسن ہیں انہیں واپس کیا جا رہا ہے، حالاں کہ اپنے بڑے بزرگوں کی طرح ان کی بھی تمنا و آرزو ہے کہ وہ بھی جنگ میں شریک ہو کر دینِ حق کے لیے مر مٹنے کے سلسلہ میں اپنے جذبۂ دروں کا اظہار کریں اور پیارے نبی ﷺ سے محبت اور غلامی کا حق ادا کریں، اس موقع پر کم عمر اور

کمسن صحابہ کرامؓ کے دوتین کردار اسلامی تاریخ کے ریکارڈ پر موجود اور محفوظ ہیں۔

یہ دیکھئے! محمد عربی ﷺ کے ننھے وفادار ہیں، عمیر بن ابی وقاص ان کا نام ہے، سن ان کا ۱۳ / سال ہے، جتنی چھوٹی ان کی عمر اتنا ہی ان کا قد ہے، یہ بھی مجاہدینِ اسلام کی صفوں میں کھڑے ہیں، دیکھا کہ جب رسول اللہ ﷺ صفوں کا جائزہ لیتے ہوئے قریب تشریف لا رہے ہیں تو یہ پنجوں کے بل کھڑے ہو گئے، تاکہ دراز قد نظر آئے اور اپنی عمر کو چھپا سکیں، یہ دیکھ کر آنحضرت ﷺ مسکرا دیئے اور محبت سے انہیں واپسی کا حکم فرمایا، جب دیکھا کہ ان کی یہ تدبیر ناکام ہو گئی ننھے صحابی بے اختیار رو دیئے، اپنے والدین اور بڑوں کو کسی بات پر راضی اور آمادہ کرنے کے سلسلہ میں معصوم بچوں اور کم عمر لڑکوں کی یہ آخری تدبیر اور فارمولا ہوتا ہے، پیارے نبی ﷺ بچوں پر ان کے ماں باپ سے زیادہ شفیق اور مہربان ہیں، رحمتِ دوعالم ﷺ نے انہیں روتا دیکھ کر جنگ میں شریک ہونے کی اجازت مرحمت فرمادی، ادھر دربارِ رسالت سے اجازت کیا ملی عمیر بن ابی وقاصؓ کی پیشانی پر مسرت رقص کرنے لگی اور مارے خوشی کے ان کا دل نہال ہو گیا۔

نگاہِ تصور میں ابھی غزوۂ بدر ہی کے نقشہ کو رکھئے! شرکاءِ جنگ کا انتخاب ہو چکا ہے، مجاہدینِ اسلام کی صف بندی کا عمل بھی پورا ہو گیا ہے، اب باضابطہ جنگ کا آغاز ہوا چاہتا ہے، اتنے میں صحابیِ رسول حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ اپنے دونوں بازو ہلکی سی نگاہ ڈالتے ہیں، عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراء دو کم عمر انصاری صحابی کو اپنے بازو کھڑا پاتے ہیں، انہیں دیکھ کر حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ سوچتے ہیں کہ اگر میں طاقتور نوجوانوں کے درمیان کھڑا ہوتا تو شاید جنگ کے نازک مرحلہ پر ان سے کام لے سکتا، لیکن یہ دونوں بچے...... ابھی وہ اسی سوچ وفکر میں تھے کہ ننھے صحابی حضرت عمرو بن جموحؓ کے سوال نے حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی سوچ کے تسلسل کو توڑا، کم عمر صحابی نے پوچھا چچا جان! کیا آپ ابوجہل کو جانتے ہیں؟ ہاں! جانتا تو ہوں لیکن تمہیں اُس کی کیا ضرورت پڑی ہے؟ نہیں چچا جان! میں نے سن رکھا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو بُرا بھلا کہتا ہے، ابھی عمرو بن جموحؓ نے اپنی بات ختم ہی کی تھی کہ بائیں جانب کھڑے حضرت معاذ بن عفراء نے حضرت عبدالرحمنؓ کو حرکت دے کر کہا کہ چچا جان! آج اگر وہ مجھے نظر آ جائے تو میں اُسے زندہ نہ چھوڑوں گا، میں نے یہ عہد کر رکھا ہے کہ دنیا میں یا تو وہ رہے یا

میں رہوں، اس گفتگو کے کچھ دیر بعد دشمنانِ اسلام کے لشکر کا سپہ سالار ابو جہل میدان کا چکر لگا تا نظر آیا، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ عمرو بن جموح اور معاذ بن عفراءؓ کو اشارہ کرتے ہیں کہ دیکھو یہ تمہارا مقصود ومطلوب ہے جس کے بارے میں تم دونوں مجھ سے پوچھ رہے تھے، اس کے بعد شمعِ رسالت کے یہ دو ننھے پروانے ابو جہل پر شاہین کی طرح جھپٹ پڑتے ہیں، یہاں تک کہ اُس کو ''ادھ مرا'' کر دیتے ہیں۔

یہ دیکھئے! مدینہ منورہ اسلام کی پہلی نوخیز ریاست اور سلطنت ہے، جہاں انصار ومہاجرین باہم شیر وشکر زندگی گذار رہے ہیں، اسلام سے پہلے ان کی باہمی عداوت ضرب المثل تھی، وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، معمولی معمولی بات پر ان کے درمیان تلواریں نیام سے باہر آ جاتی تھیں، پھر ان کی نسلوں اور پشتوں میں انتقام اور خونریزی کا سلسلہ جاری رہتا، لیکن ایمان کی نعمت اور رسالت مآب ﷺ کے فیض صحبت سے وہ صحیح اور حقیقی معنوں میں ''یک جان دو قالب'' ہو گئے۔ قرآن کی زبان میں **:یؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ** (سورۃ الحشر:۹) وہ اپنی شدید ضرورت کے باوجود مہاجرین کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، دشمنانِ اسلام کا ایک گروہ منافقین کو اہلِ ایمان کا یہ باہمی خلوص اور پیار ومحبت بہت گراں گذر رہا ہے، ان کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے ہیں اور وہ مارے حسد کے جل بھن کر کباب ہوئے جا رہے ہیں، یہ بدنصیب گروہ ہمیشہ تاک میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی بہانہ سے مسلمانوں میں تفرقہ واختلاف پیدا کیا جائے، اس کے لیے طرح طرح کی چالبازی اور مکاری کی چالیں چلتے ہیں، لیکن خدائے علیم وخبیر کی تدبیر کے سامنے کس کی مکاری اور چالبازی ٹھہر سکتی ہے؟ **ومکروا ومکر اللہ واللہ خیر الماکرین۔** (سورۃ ال عمران:۵۴)

رسول اللہ ﷺ اپنے جاں نثار صحابہ کے ساتھ ایک غزوہ سے واپس ہو رہے ہیں، لشکرِ اسلام میں منافقین کا سردار عبداللہ بن ابی سلول بھی ہے، دورانِ واپسی اسلامی فوج ایک جگہ پر پڑاؤ ڈالتی ہے، جہاں پانی کے مسئلہ پر ایک انصاری اور مہاجر صحابی کے درمیان کچھ ہلکی سی نااتفاقی ہو گئی، اس نااتفاقی کو بنیاد اور بہانہ بنا کر منافقین کے سردار نے اپنی ایک مجلس میں انصار پر طنز کرتے ہوئے کہا کہ تم ہی لوگوں نے ان جلاوطن پردیسی مہاجرین کو اپنے یہاں پناہ دے کر اپنے سروں پر مسلط کیا ہے، پھر اس بدبخت عبداللہ بن ابی سلول نے رسول اللہ ﷺ اور مہاجر صحابہ کرام کی شان میں حد درجہ گستاخی اور ہرزہ

سرائی کرتے ہوئے کہتا ہے۔

"یہ تو ایسے ہی ہوا کہ تم اپنے کتے کو خوب کھلا پلا کر موٹا کرو اور پھر وہ
تم کو ہی کاٹنے لگے، اب مدینہ پہنچنے کے بعد ہم میں کا عزت والا
ذلت والے کو نکال باہر کرے گا: لیخرجن الاعز منھا الاذل"

اس مجلس میں ایک کمسن اور کم عمر ننھے وفادار صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق اس یاوہ گوئی اور توہین آمیز گفتگو کی تاب نہ لا سکے، فوراً ہی منافق سردار کے منہ پر ہی بول پڑے کہ خدا کی قسم! تو ہی ذلیل و خوار اور مبغوض ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی عزت اور مسلمانوں کی دلی محبت سے کامیاب ہیں، شمعِ رسالت کے اس ننھے پروانے کی اچانک گفتگو پر منافقین کا سردار سٹپٹا گیا اور اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا کہ برخوردار! تم خواہ مخواہ بُرا مان گئے، میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ کہا ہی نہیں۔

پھر حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عبداللہ بن ابی سلول کی گستاخانہ باتوں اور توہین آمیز جملوں کی اطلاع دی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بہت ناگوار گذری، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے پوچھا لڑکے تم جھوٹ تو نہیں بول رہے ہو یا تمہیں کچھ شبہ تو نہیں ہو گیا ہے؟ حضرت زید بن ارقم نے قسم کھا کر کہا: نہیں اللہ کے رسول! میرے ان کانوں نے یہ باتیں سنی ہیں، مجلس میں موجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں کہ اللہ کے رسول! مجھے اجازت دیجیے کہ میں منافق عبداللہ بن ابی سلول کی گردن ماردوں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اے عمر! اگر میں تمہیں اس کے قتل کا حکم دوں تو لوگوں میں مشہور کر دیا جاؤں گا محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کروا دیتے ہیں، اس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن ابی سلول کے قتل سے روک دیا، پھر اس درمیان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود عبداللہ بن ابی سلول سے بھی وضاحت طلب فرمائی کہ کیا تم نے ایسی باتیں کہی ہے؟ منافقین کا سردار جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی کہی ہوئی گستاخانہ باتوں سے بالکلیہ انکار کر گیا، حضرت زید بن ارقم چوں کہ چھوٹے تھے، اس لیے قوم کے لوگوں نے سمجھا کہ اس لڑکے کو بات سننے میں مغالطہ ہو گیا یا صحیح طور پر اُس کو سمجھ نہ پایا، پھر اس کم سنی اور کم عمری کے جرم میں انھیں اور لوگوں کی بھی باتیں بھی سنی پڑی کہ تم نے خواہ مخواہ قوم کے سردار پر تہمت

لگادی،اس رسوائی کے سبب حضرت زید بن ارقمؓ لوگوں سے چھپے چھپے رہنے لگے۔اسلامی لشکر پڑاوٴ کی منزل چھوڑ کرمدینہ منورہ کی طرف واپس رواں دواں ہے،حضرت زید بن ارقمؓ کو اپنے کانوں سنی ہوئی بات کی سچائی پر یقین تھا،انہیں معلوم تھا کہ اللہ تعالیٰ ضرور پیارے نبی ﷺ پر میری سچائی کے بارے میں قرآن اتارے گا اور عبداللہ بن ابی سلول کو ذلیل کرے گا،جس نے مجھے جھوٹا قرار دے کر قوم میں مجھے رسوا کیا ہے،اس لیے وہ دورانِ سفر بار بار رسول اللہ ﷺ کی سواری کے قریب ہو جاتے اور آپ ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھنے لگتے کہ شاید آپ ﷺ پر میری بات سے متعلق وحی اترنے والی ہو، کچھ ہی دیر گذری کہ سواری پر ہی رسول اللہ ﷺ پر وحی کی کیفیت طاری ہوتی ہے،حضرت زید بن ارقمؓ کو امید بندھتی ہے کہ شاید یہ وحی میرے بارے میں ہو، جیسے ہی وحی کی کیفیت ختم ہوتی ہے رسول اللہ ﷺ اپنی سواری پر ہی سے حضرت زید بن ارقمؓ کا کان پکڑ کر فرماتے ہیں : **یا غلام صدق اللہ حدیثک** ”اے لڑکے! اللہ نے تمہاری بات کی تصدیق کردی“۔اس طرح قیامت تک کے لیے شمعِ رسالت کے اس ننھے پروانے کی سچائی اور صداقت قرآن کے ذریعہ باقی رکھ دی گئی اور گستاخِ رسول منافقین کے سردار کی ذلت و رسوائی اور کذب بیانی پر خدا تعالیٰ نے مہر لگادی۔

رسول اللہ ﷺ سے محبت اور وفاداری کے سلسلہ میں ننھے صحابہ کرامؓ کے ان واقعات میں ہمارے لئے پیغام یہی ہے کہ ہم اپنے نونہالوں کی تربیت ان ہی خطوط پر کریں، گھروں میں حلقے بنا کر اجتماعی شکل میں اپنے بچوں کو یہ واقعات خوب سنائیں، یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کی محبت ان کی گھٹی میں پڑ جائے ،تاکہ ان بچوں کی جوانی اور پوری زندگی آقاء دو جہاں ﷺ کی غلامی میں گذرے بچپن کا پڑھایا ہوا ”عشق رسول“ اور ”محبت رسول“ کا سبق انھیں زندگی بھر یاد رہے۔

زندگی کی راہ میں پیش آئیں کانٹے یا پھول چھوٹنے پائے نہ ہرگز دامنِ عشقِ رسول

ننھے عاشق رسول کی سچائی کا اعلان ہوتا ہے!

یہ ہیں عمیر بن سعد انصاری، آقائے دو جہاں ﷺ کے ننھے جانثار او وفادار، مسجد نبوی میں علم وعرفان کی مجلس جمی ہے، آپ ﷺ علم وحکمت کے دریا بہائے جارہے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہمہ تن یکسو ہوکر آنحضرت ﷺ کے ارشاد پر "گوش برآواز" ہیں، یکسوئی اور دلجمعی کا حال یہ ہے کہ سروں پر گویا پرندے بیٹھے ہیں کہ ذراسی حرکت وجنبش سے اڑ نہ جائیں، شمعِ رسالت کے ننھے پروانے حضرت عمیر بن سعد انصاری اس مبارک مجلس میں شریک ہیں، علم ومعرفت کے خزانوں اور عبرت ونصیحت کے موتیوں سے اپنے دامن مراد بھر لیتے ہیں اور اپنے ۶۰ / سالہ "چچا جلاس بن سوید" کے یہاں چل دیتے ہیں تاکہ جو کچھ انہیں دربار رسالت سے ملا ہے اپنے چچا کو بھی اس میں شریک کریں، .... لیکن چچا کون اور کیسا ہے؟ دیکھنے اور کہلانے میں تو مسلمان، نماز روزہ اور حج وعمرہ کا پابند، مگر دل رسول اللہ ﷺ کی عقیدت ومحبت سے خالی، کیا کسی نے سوکھی اور بنجر زمین پر سرسبزی اور شادابی دیکھی ہے؟؟ مصنوعی گلاب کے گلدستوں سے خوشبو کس نے سونگھی ہے؟؟ دل کی زمین میں اگر نفاق کا بیج ہو تو اس میں ایمان ویقین کی تر وتازہ شاخیں کیسے پھوٹیں گی؟ کَلِمَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ اَصْلُهَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ کی دل نشیں تفسیر کیوں کر سمجھ میں آئے گی؟ اور اس کی عملی تصویر کہاں نظر آئے گی؟ نفاق کے درخت اور ٹہنوں پر عشقِ رسول کے پھل وپھول کیسے لگ سکتے ہیں؟ منافق اور دوغلے باز سے بوئے وفا کی امید وتوقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟

حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ اپنے چچا کے یہاں پہونچتے ہیں اور کہتے ہیں چچا جان! آج رسول اللہ ﷺ نے مجلس میں قیامت کے متعلق بیان فرمایا، بیان اتنا متاثر کن تھا کہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں قیامت کو اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں، جب چچا جلاس بن سوید اپنے نوعمر اور نوخیز بھتیجے کی اس حقیقت بیانی کو سنا تو اس کے دل کا چور باہر آگیا، وہ پیارے نبی ﷺ سے اپنی دشمنی ونفرت کو چھپا نہ سکا، اس نے اپنی گستاخانہ زبان تارق پر لگائی اور یوں گویا ہوا:

"او بچے! اللہ کی قسم اگر محمد سچا ہے تو ہم لوگ گدھوں سے گئے گذرے ہیں"

چچا کا یہ گستاخانہ جملہ ابھی ختم نہ ہو پایا، رسول اللہ ﷺ کے اس ننھے وفادار کے چہرہ کا رنگ بدل گیا، جسم میں تھرتھری سی آ گئی، اس کا ننھا اور معصوم ضمیر رسالت مآب ﷺ کی شان میں گستاخی و بے ادبی کو برداشت نہیں کرسکا، شمعِ رسالت کے اس ننھے پروانے نے اپنے تمام حواس کو یکجا کرتے ہوئے اپنے منافق چچا کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر کہہ دیا:

"چچا جان! اللہ کی قسم آپ لوگوں میں مجھے سب سے زیادہ محبوب تھے، لیکن اب میری نگاہ میں سب سے زیادہ مبغوض وناپسندیدہ ہو گئے، اب دو ہی صورت ہے کہ یا تو میں آپ کی اس گستاخانہ بات کو چھپا کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بارے میں خیانت کرنے والا بن جاؤں یا پھر اس کی اطلاع رسول اللہ ﷺ کی دیدوں، پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا"

اس گفتگو کے بعد چچا نے حضرت عمیر بن سعد انصاری رضی اللہ عنہ کو ان کے لڑکپن کا طعنہ دے کر کہا کہ تم تو ابھی بچے ہو، تمہاری بات پر کون بھروسہ کرے گا، جاؤ جو کرنا ہے کرلو، یہاں سے حضرت عمیر بن سعد رضی اللہ عنہ دربارِ رسالت میں حاضر ہوتے ہیں، اور آپ ﷺ کو چچا کی گستاخانہ بات سنا کر اس سے اپنی برأت و بیزارگی کا اظہار کرتے ہیں، پیارے نبی ﷺ ان سے دریافت فرماتے ہیں کہ یہ تو بتاؤ آخر میرے بارے میں تمہارے چچا نے کیا کہا ہے؟ حضرت عمیر رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں اس نے یوں کہا کہ:

''اللہ کی قسم اگر محمد (ﷺ) سچے ہیں تو بلاشبہ ہم گدھوں سے بھی زیادہ برے اور گئے گذرے ہیں''وَاللّٰہِ لَوْ کَانَ مُحَمَّدٌ صَادِقًا لَنَحْنُ شَرٌّ مِنَ الْحَمِیْرِ،

رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرما کر ان سے مشورہ فرمایا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی یہی عرض کیا کہ یہ چھوٹا سا لڑکا ہے، یہ خود اپنی کہی ہوئی بات کا مطلب نہیں سمجھ پاتا، جب کہ جلاس بن سوید ایک عمر رسیدہ اور ہوش مند آدمی ہے اور وہ آدمی ہمارے ساتھ نمازیں بھی پڑھتا ہے، اس طرح

شمع رسالت کے اس ننھے پروانے کی بات کو اہمیت نہیں دی گئی اور نہ اس کی بات کی تصدیق ہو پائی۔

یہ صورت حال دیکھ کر حضرت عمیرؓ کے معصوم جذبات بھر آئے، یہ جذبات آنکھوں سے آنسو بن کر نکل پڑے، اپنی بھیگی آنکھوں اور تر گالوں کے ساتھ حضرت عمیر اس ذاتِ عالی کی بارگاہ میں اپنے ننھے ہاتھ اٹھا دیئے جو نہایت سیاہ اندھیری رات میں کالی پہاڑی پر کالی چونٹی کو نہ صرف دیکھتی ہے بلکہ اس کے قدموں کی آہٹ بھی سنتی ہے، انھوں نے انتہائی رنج وغم اور حزن وملال میں اپنے پروردگار سے یوں دعا اور التجا کی:

''میرے پروردگار! اگر میں اپنی بات میں سچا ہوں تو مجھے سچا ثابت کردے''

خدا کی قسم! حضرت عمیر رضی اللہ عنہ ابھی اپنی دعا ختم بھی نہ کر پائے، وہ رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے ابھی اٹھے بھی نہ تھے کہ ساتویں آسمان سے حضرت جبریل علیہ السلام اس ننھے صحابی رسول ﷺ کی سچائی کا پروانہ لے کر دربار رسالت مآب ﷺ میں حاضر ہوئے اور اللہ تعالیٰ کا یہ پیام سنایا کہ **یحلفون باللہ ماقالوا، ولقد قالوا کلمۃ الکفر وکفروا بعد اسلامھم** (سورۃ التوبہ: ۷۴) یہ لوگ اللہ کی قسمیں کھاتے ہیں کہ انہوں نے ایسی بات نہیں کہی، جب کہ حقیقت میں وہ رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کے ذریعہ کفر کا کلمہ کہہ چکے، اور وہ اسلام لانے کے بعد کافر ہوگئے ......وحی کے نزول کے بعد آنحضرت ﷺ اپنے ان ننھے عاشق اور وفادار کو طلب فرماتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کے لیے خیر مقدمی کلمات یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ: **"مرحبا صدقہ ربّہ من فوق سبع سماوات"** اس خوش نصیب بچے کے لیے خوش آمدید ہے کہ اُس کے پروردگار نے سات آسمانوں پر سے اُس کی سچائی کا پروانہ بھیجا، ایک مرتبہ آپ ﷺ نے حضرت عمیر رضی اللہ عنہ کا کان پکڑ کر فرمایا اے بچے! تیرے کان نے ٹھیک سنا، اور تیرے پروردگار نے تیری تصدیق کی......

رسول ﷺ کے ساتھ ننھے عاشق رسول کی وفاداری کا یہ عظیم الشان واقعہ، ملت کی نئی اور نوخیز نسل کے لئے ایک سبق نامہ ہے، بچوں اور نوجوانوں کو یہ سبق جتنا زیادہ ذہن نشیں اور دل نشیں ہوگا ان کے دین اور دنیا کا مستقبل اتنا ہی زیادہ دلکش اور حسین ہوگا۔

میں نہ جاؤں گا کبھی درِ نبی کا چھوڑ کر!

رسول ﷺ آخری نبی ہیں، آخری نبی اور پیغمبر ہونے کی وجہ سے آپ ﷺ کی نبوت ورسالت زماں ومکاں کے حدود اور حد بندیوں سے ماوراء ہے، اسی طرح آپ ﷺ سے عشق ومحبت کا جذبہ اور سلسلہ بھی علاقائی سرحدوں اور سن وسال کے دائرہ سے بالاتر ہے، جب نبوت محمدی کے فیوض و برکات کو زمانہ وعلاقہ اور رنگ ونسل کے کسی خاص خول میں بند نہیں کیا جاسکتا تو پھر ''عشقِ محمدی'' کے اثرات اور واقعات کو ان دائروں میں کیوں کر اور کیسے محدود کیا جاسکتا ہے؟؟

چنانچہ عشق ومحبت اور وفاداری وجاں نثاری کے عظیم واقعات صرف زمانۂ رسالت تک مخصوص اور محدود نہیں تھے، بلکہ ہر زمانہ میں اس کے نمونے موجود ہیں، دیکھئے! یہ منظر رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانہ سے بہت بعد کا ہے، آپ ﷺ کے نام لیوا، عاشق اور غلام چاہے جس زمانہ اور علاقہ کے ہوں، ان کے اندر عشق نبی کی انگیٹھی برابر سلگتی رہتی ہے، صدیوں اور میلوں کے فاصلے اس انگیٹھی کی حرارت کو کم نہیں کر سکتے۔

یہ منظر اُس مقدس شہر کا ہے جس کو رسول اللہ ﷺ کی عالی نسبت کی وجہ سے ''مدینۃ النبی'' کہا جاتا ہے، جہاں کی خاک کو اگر آنکھ کا سرمہ بنالیا جائے اور وہاں سر کے بل چلا جائے تب بھی اس مقدس سرزمین کے ادب واحترام کا حق ادا نہیں ہوگا، یہ منظر اُس زمانہ کا ہے جب سعودی عرب کی سرزمین اپنا خزانہ ''سیّال سونا'' نہیں اگلی تھی، پٹرول کے چشمے اور ذخائر دریافت نہیں ہوئے تھے، دولت کی ریل پیل نہیں تھی، بلند وبالا فلک بوس عمارتیں اور چمچاتی کاریں نہیں تھیں، اُس زمانہ میں عرب کی تنگدستی اور غربت کا کچھ نقشہ مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے سفرنامہ حج ''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' میں کھینچا ہے، لکھتے ہیں:

''......غربت کے مارے نیم برہنہ عرب بچے اور بچیاں جن کے جسموں پر

کپڑوں کے تاراور دھجیاں تھیں، موٹرکار کا دور دور تک تعاقب کرتیں اور آخر
تھک کر رہ جاتیں، ان کی غربت دیکھ کر کلیجہ منہ کو آتا، اللہ ہی بہتر جانتا ہے
کہ ان میں کتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی اولاد اور عراق وشام کی فاتحین کی نسل میں
سے ہیں، ایمانی اور روحانی حیثیت سے اگر کوئی شہزادہ کہلانے کا مستحق ہے
تو ساری دنیا کے یہ شہزادے اور دنیائے اسلام بلکہ عالم انسانیت کے محسنوں
اور مخدوموں کی یہ اولاد ہیں......" (بحوالہ آپ حج کیسے کریں؟ص:۱۳۰)

اس زمانہ میں عرب کی غربت وافلاس کو پڑھ کر آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس منظر کا ہیرو کون ہوسکتا ہے؟ یہ ایک غریب، یتیم اور معصوم لڑکا ہے، غریبی اور یتیمی نے اس بچے کو دردر کا سوالی اور محتاج بنادیا ہے، لوگوں کی پھینکی ہوئی، بچی کچی غذا کو تلاش کرنا اور اُسی سے اپنی بھوک مٹانا اس لڑکے کا کام ہے، ہے تو یہ لڑکا بہت غریب! لیکن اس کا دل پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت وچاہت کی عظیم دولت سے مالا مال ہے، موسم حج کے موقع سے اس عظیم لڑکے کے ساتھ جو کچھ بیتی ہے اور جو واقعہ پیش آیا ہے اس کو ممتاز صاحب قلم عالمِ دین مولانا ابن الحسن عباسی نے حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بھانجے، حدیث کی معرکۃ الآراء کتاب "اعلاء السنن" کے مصنف مولانا ظفر احمد عثمانیؒ کے حوالہ سے یوں بیان کرتے ہیں:

"......مولانا ظفر احمد عثمانی ایک دن کھانے سے فارغ ہوئے، دسترخوان
کسی اونچی جگہ جھاڑا گیا، تاکہ روٹی کے بچے کچے ٹکڑے
چرند پرند کھالیں، کچھ دیر بعد مولانا نے دیکھا کہ مدینہ منورہ کا ایک آٹھ
نوسالہ معصوم بچہ وہ ٹکرے کھا رہا ہے، مولانا اُسے دیکھ کر بے چین ہوگئے
، بچے کو ساتھ لائے، کھانا کھلایا، پوچھا کہ تمہارے ابّا کیا کرتے ہیں؟
کہنے لگا کہ میں یتیم ہوں، مولانا نے کہا بیٹا! تم میرے ساتھ ہندوستان چلو
، میں تمہیں اچھے اچھے کھانے کھلاؤں گا، عمدہ کپڑے پہناؤں گا، تمہیں تعلیم
دلاؤں گا، اور جب بڑے عالم بن جاؤگے تو میں خود تمہیں مدینہ لے آؤں

گا،تم جاؤاور اپنی والدہ سے اجازت لے لو، بچہ گیا اور والدہ نے اجازت دیدی کہ وہ بے چاری تو پہلے ہی سے اس کی کفالت سے عاجز تھی، بچے نے معصومیت کے عالم میں مولانا کی انگلی پکڑ کر پوچھنا شروع کیا...... مجھے وہاں چنے ملیں گے، کھجوریں ملیں گی ......؟ مولانا نے کہا بیٹا یہ سب کچھ وہاں وافر مقدار میں ملے گا......اچانک اُس نے مسجد نبوی ﷺ کے دروازے اور روضۂ مبارک کی طرف اشارہ کر کے کہا" بابا! یہ دروازے اور یہ روضہ بھی وہاں ملے گا"......مولانا نے کہا: وہاں یہ روضہ ہوتا تو پھر ہمیں یہاں آنے کی کیوں کر ضرورت پیش آتی بیٹا! یہ دروازہ، یہ روضہ وہاں نہیں ملے گا......، بچے کا رنگ بدلا اور کہنے لگا، بابا! یہ روضہ وہاں نہیں تو اُسے چھوڑ کر میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا اور یہ کہہ کر رونے لگا، مولانا ظفر احمد عثمانی بھی بچے کا جواب سن کر اور اس کا یہ جذبہ دیکھ کر آبدیدہ ہو گئے......۔(کتاب "کرنیں" ص:۱۷۵۔۱۷۶)

اندازہ لگائیے کہ یہ معصوم اور کمسن بچہ غریبی اور یتیمی کی ہر مصیبت و پریشانی کو جھیلنے اور سہنے کو تیار ہے لیکن ......یتیموں کے والی، دریتیم محمد رسول اللہ ﷺ کے روضۂ مبارک کی جالی سے جدائی اور دوری اس بچے کے لیے گوارہ نہیں۔

شمع رسالت کے ان ننھے پروانوں کے یہ روشن اور تابندہ نقوش ہیں، ان کا درس اور پیغام یہی ہے کہ ہم ان ہی نقوش اور خطوط پر اپنے نونہالوں کا مستقبل طے کریں، یہ چیز ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے اور ہماری نئی اور نوخیز نسل کا المیہ اور سانحہ ہے کہ اُس کو فاسقوں، فاجروں اور اللہ تعالیٰ کے باغیوں کے "ڈائیلاگس" اور "ایکشنس" تو خوب یاد ہیں، لیکن انسانیت کے عظیم اور کامل ترین "نمونہ" محمد رسول اللہ ﷺ کی سنتیں اور احادیث ہمارے بچوں کو یاد ہونا تو دور کی بات اس کے سیکھنے اور جاننے میں انہیں دلچسپی بھی نہیں، یہ اس لیے ہوا کہ صحیح دینی نہج اور طریقہ پر اُن کی تربیت نہیں کی گئی، پہلے زمانہ میں گھر اور خاندان کے بڑے بزرگ اپنے بچوں کو ہلکے پھلکے عام فہم نعتیہ کلام یاد کروا کر آپ ﷺ کی مبارک زندگی کے واقعات اور آپ ﷺ عظمت و محبت ان دلوں میں بٹھاتے تھے، جب بچے اپنی ننھی

زبان اور معصوم انداز میں پڑھتے تو ایک عجیب اور خوشگوار سماں بندھ جاتا خود رسول اکرم ﷺ کا فرمان ہے، تین باتوں پر اپنی اولاد کی پرورش کرو ایک اپنے نبی کی محبت پر دوسرے اہل بیت رضی اللہ عنہم کی محبت پر اور تیسرے قرآن مجید کی تلاوت پر۔ (طبرانی عن علی رضی اللہ عنہ) اپنے گھر کے ذمہ دار اور سرپرست ہونے کی ناطے ہمیں اپنے بچوں کو تو رسول اللہ ﷺ کی سیرت کی تعلیم دینا ہی ہے، لیکن اس کے علاوہ آقا دو جہاں ﷺ کے ایک امتی ہونے کی حیثیت سے ہمیں ملت کے نونہالوں کی بھی فکر کرنا ہے جنہیں جھوٹے اور فریبی نبی مرزا غلام احمد قادیانی **لعنۃ اللہ علیہ** کا کلمہ پڑھایا جا رہا ہے اور یہ کہہ کر معصوم ذہنوں کو گندہ کیا جا رہا ہے کہ ؎

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں
آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شاں میں
محمد دیکھنے ہو جس نے اکمل
غلام احمد کو دیکھئے قادیاں میں

اللہ تعالیٰ ملت کے شاہین بچوں کو ایسے فتنوں سے محفوظ رکھے۔

اسوۂ نبویؐ اور ہماری زندگی

زندگی، اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم نعمت ہے، اس نعمت کی حفاظت اور قدر دانی صرف یہ نہیں ہے کہ ''حفظانِ صحت'' کے اصولوں اور ضابطوں کا پورا پورا اہتمام کیا جائے، سختی سے ان کی پابندی کی جائے، بلکہ زندگی کی اصل قدر دانی یہ ہے کہ یہ ''الٰہی اصولوں'' اور ''خدائی ضابطوں'' کے مطابق گذاری جائے، زندگی پوری اللہ تعالیٰ کی شکر گذاری اور اُس کی اطاعت وفرمانبرداری میں بسر ہو، زندگی گذارنے کے ان ''خدائی ضابطوں'' کو زبانی طور پر بھی اور عملی طور پر بھی سمجھانے اور بتانے کے لئے انبیاءِ کرام کی تشریف آوری ہوئی، انبیاءِ کرام نے اپنی آسمانی تعلیمات اور ہدایات میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور گوشوں کا احاطہ کیا، افکار ونظریات سے لے کر خیالات وجذبات، احساسات اور نفسیات تمام چیزوں کو خدائی تعلیمات کا پابند بنایا ہے، زندگی کے تمام نشیب وفراز، خوشی، غمی، امیری، فقیری، تندرستی، بیماری، دوستی، دشمنی، غصہ وناراضگی، ہمدردی وغم خواری، غرض یہ کہ زندگی کے تمام مراحل میں انسان کو اپنے پروردگار اور پالنہار کی رضاء وخوشنودی کا پابند کیا، اسی لئے قرآن مجید میں میں فرمایا گیا کہ تمہارے لیے زندگی گذارنے کا بہترین اسوہ اور نمونہ رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی میں ہے، (الاحزاب:۲۱)

رسول اللہ ﷺ آخری نبی ہیں اور نبوتِ محمدی ﷺ چوں کہ تا قیامت پوری انسانیت کے لیے باقی اور کافی ہے، اس لیے ضروری تھا کہ آپ ﷺ کی سیرتِ مبارکہ زندگی کے ہر گوشہ اور پہلو سے کامل اور مکمل ہو، تاکہ دنیا میں جہاں کہیں انسان رہتے اور بستے ہیں ان سب کے لیے آپ ﷺ کی ذات لائقِ تقلید اور قابلِ عمل بن سکے، سیرتِ طیبہ ﷺ کا تعلق لکھنے پڑھنے اور سننے سنانے سے زیادہ ہماری عملی زندگی سے ہے کہ ہم نے کہاں تک اسوۂ نبوی ﷺ کو اپنی زندگی میں برتا اور اپنایا ہے؟ ایک مسلمان زندگی کے کسی پہلو پر جب کچھ سوچتا ہے یا کسی شعبہ میں قدم رکھتا ہے تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہے کہ اس بارے میں اسوۂ نبوی ﷺ کیا ہے؟ پھر وہ اپنا قدم آگے بڑھاتا ہے اور یہی حقیقت ہے آپ ﷺ کو

اپنی زندگی کا بہترین آئیڈیل اورنمونہ ماننے کی۔

یوں تو سیرتِ مبارکہ کے بہت سے گوشے اور پہلو ہمارے لیے مشعل راہ ہیں ،تاہم غصہ اورناراضگی ، یہ بھی انسانی زندگی کا ایک پہلو ہے، اس پہلو کے لحاظ سے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس بارے میں اسوۂ نبوی ﷺ کیا ہے اور نبی ﷺ ناراضگی اور غصہ کا اظہار کب فرماتے تھے؟ حضرت حسنؓ بن علیؓ اپنے والد حضرت علیؓ کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ کی سیرت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: **مَا رَأَيْتُهُ مُنْتَصِراً فِيْ مَظْلَمَةٍ ظَلَمَهَا قَطّ مَا لَمْ يَنْتَهِكْ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ تَعَالٰى شَيْئٌ فَإِذَا انْتُهِكَ مِنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ كَانَ مِنْ اَشَدِّهِمْ غَضْباً۔** (شمائل ترمذی) اس روایت میں فرمایا گیا کہ آپ ﷺ نے اپنے اوپر زیادتی کا کبھی بدلہ نہیں لیا،مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ امور کی پامالی ہونے لگے، جب اللہ کے حکموں کی پامالی ہوتی تو آپ ﷺ سب سے زیادہ غضبناک اور ناراض ہوتے ـــــــ اس روایت کو سامنے رکھتے ہوئے دومثالوں پرغور کیجئے۔

پہلی مثال یہ کہ ایک مرتبہ آپ ﷺ ایک غزوہ سے واپسی کے دوران ببول کے درخت کے سایہ میں آرام فرمانے کے مقصد سے لیٹ گئے ،ایک مشرک نے دیکھا کہ آپ ﷺ تنہا آرام فرمارہے ہیں ،وہ اپنا بُراارادہ (قتل) لے کرآپ ﷺ کے قریب آیااور ببول کے درخت سے لگی آپ ﷺ کی تلوارنکال لی ،اتنے میں نبی ﷺ بیدار ہوگئے ،مشرک نے پوچھا:اے محمد! بتاؤ آج تم کو مجھ سے کون بچاسکتا ہے؟ **مَنْ يَّمْنَعُكَ مِنِّيْ؟** آپ ﷺ نے پورے اطمینان وسکون کے ساتھ فرمایا:''اللہ'' اس لفظ کو سنتے ہی وہ تھر تھر کانپنے اورلرزنے لگا،تلوار ہاتھ سے چھوٹ گئی، نبی ﷺ نے تلوار ہاتھ میں لے کر پوچھا بتا!اب تجھ کو مجھ سے کون بچاسکتا ہے؟ مشرک نے جواب دیا: آپ مہربان ہیں، معاف کرنے والے ہیں، اس پر آپ ﷺ نے اس کومعاف کردیا اور چھوڑ دیا۔ (ریاض الصالحین،ص:۵۱ باب فی الیقین والتوکل)

دوسری مثال یہ کہ ایک مرتبہ مکہ میں اونچے اوراعلیٰ خاندان کی خاتون فاطمہ بنتِ اسد چوری کے الزام میں گرفتار ہوئیں اورسب ہی کومعلوم تھا کہ اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے،قبیلہ کے ذمہ داروں نے سوچا چوری کے جرم میں خاتون کا ہاتھ تو کیا کٹے گا مگر خاندان کی ناک ضرور کٹ جائے گی اورمکہ میں ہماری نیک نامی اورعزت وجاہت خاک میں مل جائے گی، پھران لوگوں نے خاتون کے

سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کے چہیتے غلام حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کو سفارش کے لیے تیار کیا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کی خدمت میں جب سفارش کی بات رکھی تو آپ ﷺ کا چہرۂ انور سرخ ہوگیا اور آپ ﷺ نے شدید ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

''اسامہ! کیا تم اللہ کے حدود کے بارے میں مجھ سے سفارش چاہتے ہو؟ پھر آپ ﷺ نے لوگوں کو جمع کر کے فرمایا: اے لوگو! تم سے پہلے لوگ اس وجہ سے ہلاک ہوگئے کہ اگر ان میں کا طاقتور مالدار شخص جرم کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی غریب کمزور جرم کرتا تو اس کو سزا دیتے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم! اگر چوری کرنے والی خاتون فاطمہ بنتِ اسد کے بجائے فاطمہ بنتِ محمد بھی ہوتی تو میں اس پر بھی سزا نافذ کرتا''۔ (ریاض الصالحین: ۶۱۷ باب تحریم الشفاعۃ فی الحدود)

سیرتِ مبارکہ کی یہ دو مثالیں ہیں، جن میں غصہ و ناراضگی کا موقع و محل واضح ہے، وہ یہ کہ اگر اپنی ذات یا حیثیت تک کوئی ناگواری، تکلیف یا ایذا رسانی کی بات ہوتی تو آپ ﷺ اس کو برداشت کر لیتے اور اس کا انتقام و بدلہ نہیں لیتے، البتہ دین و شریعت کی پامالی، بے حرمتی یا بے احترامی کی اگر بات ہوتی تو آپ ﷺ کو ذرّہ برابر برداشت و گوارہ نہیں ہوتا اور آپ ﷺ ذرا بھی رعایت نہیں فرماتے۔

یہاں رُک کر ہمیں اپنی حالت اور طبیعت کا جائزہ لینا چاہیے اور اپنا احتساب کرنا چاہیے کہ ہم نے دین و شریعت کے معاملہ میں اس اسوۂ نبوی ﷺ کو اپنی زندگی میں کہاں تک اپنایا ہے؟ ؟ اپنی ذات پر کوئی حرف آئے یا اپنے مقام و مرتبہ پر کوئی آنچ آئے تو ہم مرنے مارنے پر تل جاتے ہیں اور اگر ہماری نگاہوں اور نظروں کے سامنے اسلامی تعلیمات اور احکامات کی پامالی و بے حرمتی ہو تو ہم خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں، بچہ اگر کسی دن ٹیوشن ناغہ کردے تو اس کی تنبیہ کی جاتی ہے، اسکول کا ہوم ورک کسی دن نہ کرنے پر ڈانٹ ڈپٹ ہوتی ہے، شرارت کرنے پر بعض دفعہ مار پیٹ ہوتی ہے ،قیمتی زیور یا ذاتی استعمال کی چیز کے ٹوٹ جانے یا گم ہونے پر غم و غصہ اور ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے، لیکن کیا کبھی بھول کر اور انجانے میں ہی سہی، ایسا بھی ہوا کہ بچہ یا ماتحت فرد کے نماز نہ پڑھنے پر تنبیہ کی گئی

ہو،کسی دن قرآن مجید کی تلاوت نہ کرنے پر ڈانٹ پڑی ہو، نبی ﷺ کی سنت کی خلاف ورزی پر غم وغصہ کا اظہار ہوا ہو، معاشرہ اور سماج میں تو شرعی احکام کی پامالی ہو ہی رہی ہے، مگر خود اپنے گھروں سے بھی تو اسلامی تعلیمات کا جنازہ نکلا جا رہا ہے، ہم ہی اس کو کاندھا دیتے ہیں اور بعض دفعہ ''جلوسِ جنازہ'' کے امیر اور قائد بھی ہم ہوتے ہیں، مگر کانوں پر جوں نہیں رینگتی اور یوں سمجھتے ہیں کہ ناک پر مکھی بیٹھی اور اڑ گئی ، اسوۂ نبویؐ کا پیغام یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی اس کے مطابق ڈھالیں اور سنواریں ،خدا کرے یہ پیغام ہمارے دل کے دروازہ پر دستک دے اور بجائے اس کے کہ طبیعت ہماری شریعت بن جائے ماضی قریب کے خدا مست بزرگ ومجاہد مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے بقول شریعت ہماری طبیعت بن جائے۔آمین

............روزنامہ منصف، ۲۲/اپریل ۲۰۰۵ء............
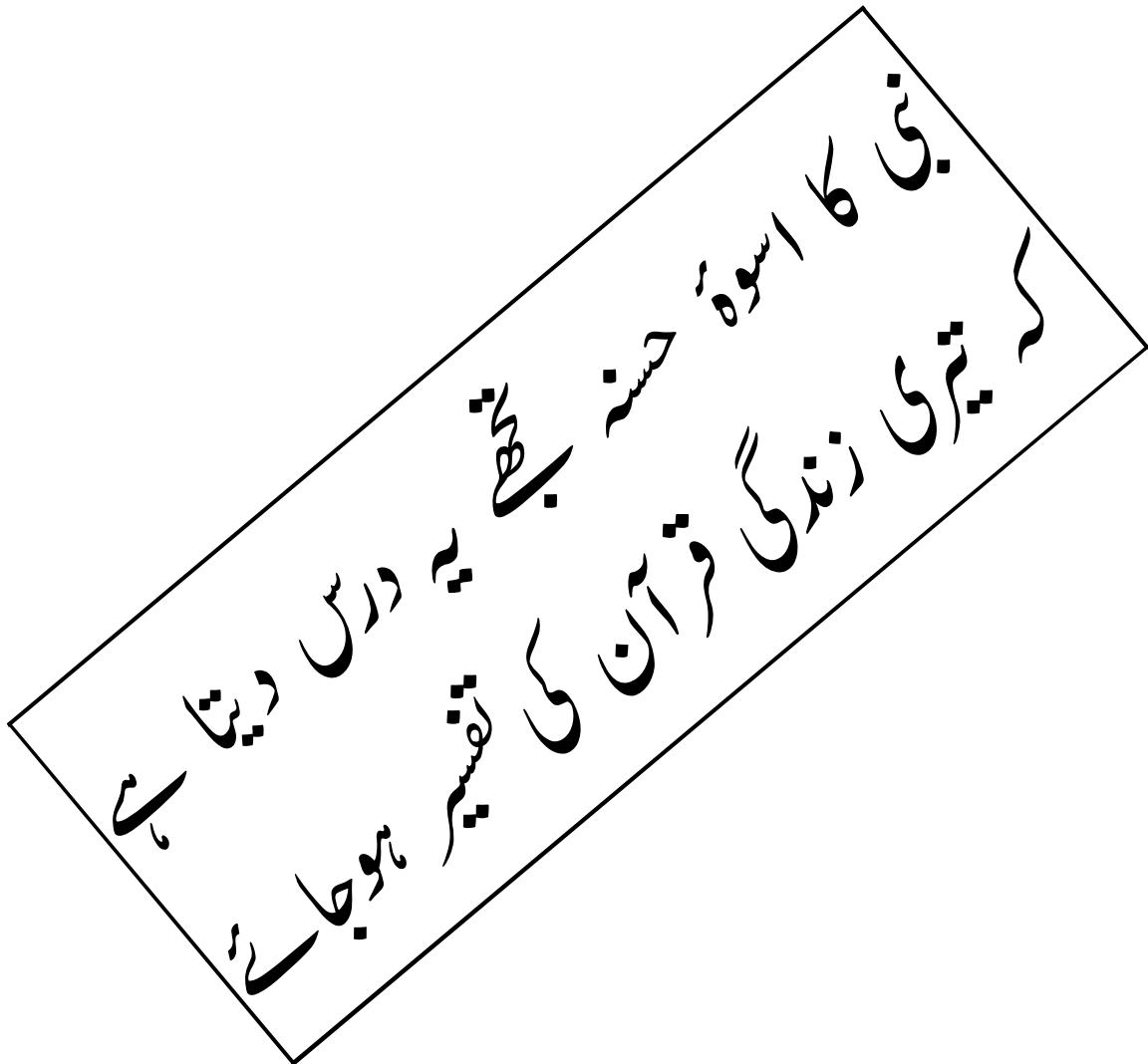
عاشقانِ مصطفیؐ کے نام

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بہت ساری نعمتوں ،نوازشوں ،راحتوں اورسہولتوں سے نوازا ہے،انسان کا پورا وجود اللہ تعالیٰ کے انعامات کا مجموعہ ہے، مثلاً آنکھ ایک بہت بڑی نعمت ہے،اس کے ذریعہ انسان اپنے چھوٹے چھوٹے بال بچوں کو دیکھ کرخوش ہوتا ہے،اپنی دل بہلائی کا سامان پیدا کرتا ہے،اسی آنکھ کے ذریعہ انسان کائنات میں موجود خوشنما قدرتی مناظر کو دیکھ کر لطف اندوز ہوتا ہے، یہ آنکھ اگر نہ ہوتو دنیا انسان کے لیے تاریک ہے، وہ سب کچھ آرام وآسائش کا سامان رکھتے ہوئے اپنے اندراندھیرا محسوس کرتا ہے، جولوگ بینائی سے محروم ہیں انہیں اس نعمت کی اہمیت اوراس کی قدر قیمت کا احساس زیادہ ہوتا ہے،اسی لیے آنکھ سے محروم مالدار سے مالدارترین شخص اگرکسی غریب سے آنکھ کا سودا کرنا چاہےتو وہ کسی قیمت پراپنی آنکھ اس کو دینے کے لیے تیارنہیں ہوتا ،اسی طرح زبان،کان اوردیگر جتنے انسانی اعضاء ہیں سب کے نعمت ہونے کو سمجھا جاسکتا ہے۔

ان ظاہری اعضاء وجوارح کے علاوہ عقل ودانائی بھی ایک عظیم نعمت ہے،اس کے ذریعہ انسان کے اندر بھلے اور برے کی تمیز پیدا ہوتی ہے، وہ صحیح اورغلط کا فیصلہ کرسکتا ہے،لیکن یہ صلاحیت اورخوبی اسی وقت ہوتی ہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت وتوفیق کی نعمت اس کو میسر ہو،اللہ تعالیٰ کے انعامات میں یہ ایسی بنیادی اورمرکزی نعمت ہے کہ اس کے رہنے پر دیگر تمام نعمتوں کا صحیح استعمال ہوتا ہے، انسان کی تمام ظاہری نعمتوں اور پوشیدہ صلاحیتوں کے استعمال کا مقصد خالق کائنات کی رضاوخوشنودی کو پانا ہوتا ہے، دنیا میں بڑے بڑے ذہین وفطین لوگ گذرے، بڑے سے بڑے عقل منداورفلاسفہ نے ایجادات اوراختراعات میں اپنا نام اورمقام پیدا کیا،لیکن ہدایت وتوفیق کی نعمت انہیں میسر نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنی صلاحیت وقابلیت کا صحیح استعمال نہ کرسکے اوراپنی دنیا ایسی سدھار گئے کہ انہیں خالق وپروردگار کی معرفت وپہچان نصیب نہیں ہوئی ،اللہ تعالیٰ نے جتنی ساری

نعمتوں سے اپنے بندوں کو نوازا ہے اس میں کہیں بھی اپنا احسان نہیں جتلایا ہے،صرف ”ہدایت وتوفیق“ ہی ایسی نعمت ہے جس میں واضح طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنا احسان جتلایا ہے، ہدایت وتوفیق کی نعمت چوں کہ آقائے دوجہاں حضرت محمد ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے صدقہ وطفیل میں ہمیں ملی ہے، اس لیے آپ ﷺ کی بعثت کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ اپنا احسان یوں بیان فرماتے ہیں:

”اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا جب کہ ان ہی میں سے ایک رسول ان میں بھیجا“ **لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلاً مِّنْ اَنْفُسِھِمْ** ‘‘(سورۃ آل عمران: ۱۶۴)

ماہِ ربیع الاوّل میں رسولِ اکرم ﷺ کی ولادتِ باسعادت ہوئی ہے، اس ماہ کے موقع اور مناسبت سے مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ذکرِ خیر اور آپ ﷺ کی روشن وپاکیزہ تعلیمات کے تذکرہ کے لیے اجتماعات اور جلسے منعقد کرتے ہیں، تاکہ عام مسلمان بالخصوص نئی اور نوجوان نسل رسول اللہ ﷺ کی سیرت اور تاریخ سے واقف ہو اور ہمارے اندر اپنی روزمرہ کی زندگی کو اسوۂ نبوی ﷺ کے سانچے میں ڈھالنے کا جذبہ اور حوصلہ پیدا ہو، نیز سیرت النبی ﷺ کے اجتماعات اور میلاد کی محفلیں ہمارے جذبۂ عقیدت و محبت کی ”تشہیر“ کے بجائے ہمارے اندر نبی ﷺ کی اطاعت وفرماں برداری کی ”تحریک“ کا ذریعہ بن جائیں۔

رسول اللہ ﷺ ”**رحمة للعالمین**“ ہیں، آپ ﷺ کی ہر تعلیم اور تلقین میں صفت ”رحمت“ کی جھلک موجود ہے، آپ ﷺ کی رحمت وشفقت بلا امتیازِ رنگ ونسل اور بلالحاظِ دین ومذہب تمام انسانوں کے واسطے ہے، اسی لیے آپ ﷺ نے ہر ایسے عمل اور ایسے کام سے منع فرمایا جس سے عام لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہو، آپ ﷺ کی تعلیمات کا اصول اور نچوڑ ہے یہ ہے کہ نہ کسی کو تکلیف واذیت دی جائے اور نہ کسی کو تکلیف دینے کا واسطہ اور ذریعہ بنے، **لاَ ضَرَرَ وَلاَ ضِرَارَ**، ایذا رسانی سے روکنے کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی ہدایات زبانی بھی ہیں اور عملی بھی، آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی ایذاء سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، (بخاری ومسلم بحوالہ ریاض الصالحین، باب النھی عن الایذاء) حدیث میں ہاتھ اور زبان کا تذکرہ خصوصیت کے ساتھ اس لیے کیا گیا کہ عام طور پر ایذاء

رسانی میں ان دو اعضاء کا استعمال زیادہ ہوتا ہے، ہاتھ سے تکلیف پہنچانا یہ ہے کہ کسی مسلمان سے ''ہاتھا پائی'' کی جائے اور زبان سے تکلیف پہنچانا یہ ہے کہ کسی مسلمان پر تہمت لگائے، اس کی غیبت کرے، برے القاب اور ناموں سے اس کو پکارے، ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں گفتگو کرے، ان دنوں عوامی اجتماعات اور جلسوں میں لوڈ اسپیکر کا جو بے تحاشا اور ظالمانہ استعمال ہو رہا ہے وہ بھی زبان سے ایذاء رسانی کے مفہوم میں داخل ہے، دوسری جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مؤمن وہ ہے جس کی تکلیف دہ حرکتوں میں سے دوسرے انسان امن میں رہیں، تکلیف دہ حرکت ایک یہ بھی ہے کہ راستوں اور چوراہوں پر محفلیں اور مجلسیں جمائی جائیں، اس کی وجہ سے راہ گیروں کو تکلیف ہوتی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ راستوں میں بیٹھنے سے بچو: اِیَّاکُمْ وَالْجُلُوْسَ فِي الطُّرُقَاتِ، اگر کسی شدید اور اہم ضرورت کی وجہ سے راستوں میں بیٹھنا پڑے تو اس کی اجازت دی گئی اور اس وقت بھی حکم دیا گیا کہ راستے کے حقوق ادا کرو، یعنی سلام کرو، راستہ سے تکلیف دہ چیزوں کو ہٹاؤ۔ (مشکوۃ، ص: ۳۹۸) آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں، ایمان کا سب سے کم تر درجہ یہ ہے کہ راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کیا جائے، (ریاض الصالحین، ص: ۷۲ باب في بیان کثرۃ طرق الخیر) مثلاً پتھر، کانٹے وغیرہ۔

لوگوں کی راحت اور آرام کا خیال رسول اللہ ﷺ کو اتنا زیادہ تھا کہ نماز جیسی عظیم الشان عبادت میں بھی آپ ﷺ اس کا اہتمام فرماتے تھے کہ لوگ تکلیف اور مشقت میں نہ پڑ جائیں، اس لیے حدیث میں حکم دیا گیا کہ جب تم امامت کرو تو نماز مختصر پڑھاؤ، اس لیے کہ مقتدیوں میں ضعیف بھی ہوتے ہیں، بیمار بھی اور تھکے ماندے بھی، البتہ اگر تم تنہا نماز پڑھو تو جتنی لمبی چاہے پڑھو، اسی طرح رسول اللہ ﷺ نماز کے دوران کسی بچہ کے رونے کی آواز پر نماز کو مختصر فرما دیتے تھے، (ریاض الصالحین، ص: ۱۲ باب تعظیم حرمات المسلمین) مسجد میں پیاز، لہسن کھا کر جانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس کی بو سے دوسرے لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ (ریاض الصالحین: ۵۹۹ باب نھی من اکل ثوماً) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ لعنت وملامت کرنے والوں سے ڈرو! صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ لعنت وملامت کرنے والے کون ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ شخص ہے جو لوگوں کے راستہ میں یا ان کے سایہ دار جگہ میں گندگی کرتا ہے۔ (ریاض الصالحین، باب النھی عن التغوط فی الطریق) کیوں کہ یہ بالواسطہ

لوگوں کو تکلیف پہنچانا ہے، جس کی وجہ سے لوگ لعنت وملامت کرنے لگتے ہیں، اس لیے آپ ﷺ نے اس عمل سے منع فرمایا، یہ واقعہ ہے کہ کسی بھی عنوان سے جب راستہ میں رکاوٹ کھڑی کردی جائے اور راستہ بند کردیا جائے تو راستہ سے گذرنے والوں کو سخت کوفت ہوتی ہے اور وہ رکاوٹ کھڑی کرنے والوں کو کوسے بغیر نہیں گذرتے ،قرآن مجید میں بھی اللہ تعالیٰ کا واضح فرمان ہے کہ جو لوگ مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو بلا وجہ ایذاء وتکلیف دیتے ہیں ان لوگوں نے بہت بڑا الزام اور کھلا ہوا گناہ اپنے سر لیا ہے۔(سورۃ الاحزاب:۵۸)

اسلام کی ان تعلیمات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ لوگوں کے لیے راحت رسانی کا خیال رکھنا اور انہیں ایذاء رسانی سے بچانا ایک مسلمان کے لیے کتنا ضروری اور اہم ہے؟ ایذاء رسانی سے متعلق اسلام کی جو کچھ تعلیمات اور ہدایات ذکر کی گئی ان میں کسی مسلک ومشرب کا اختلاف نہیں، مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر کے یہاں ان تعلیمات پر عمل کرنا ضروری ہے، اہل اسلام میں سے کسی فرد کو ان تعلیمات کی پابندی اور پیروی سے انکار اور فرار نہیں ،لیکن ہم اپنا احتساب کریں کہ ہمارے معاشرہ میں منعقدہ عوامی اجتماعات اور جلسے ان اسلامی تعلیمات سے کتنے ہم آہنگ ہیں ؟ اور ان اجتماعات کے منتظمین ،مقررین اور سامعین کہاں تک نبی ﷺ کی ہدایات کو ملحوظ رکھتے ہیں؟

روزنامہ منصف حیدرآباد ۱۳/اپریل ۲۰۰۷ء

یہی ہے عبادت ، یہی دین وایمان
کہ کام آئے دنیا میں انسان کے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف!!

رسول اللہ ﷺ کی ختمِ نبوت کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں کی حیثیت ایک ''امتِ واحدہ'' کی ہے، علاقائی، تہذیبی وثقافتی اور لسانی ہر طرح اختلافات کے باوجود ایمان کی دولت اور رسول اللہ ﷺ کی محبت نے تمام مسلمانوں کو ایک عالمی اسلامی برادری میں باندھ رکھا ہے، پھر چوں کہ سلسلہ نبوت ورسالت ختم ہونے کی بناء پر نبوت ورسالت کا مقدس مشن اور کار بھی اسی امت کو سنبھالنا ہے، اس لیے مسلمانوں کے درمیان ''اسلامیت'' کا رشتہ جتنا زیادہ مضبوط و مستحکم ہوگا اتنا ہی زیادہ صحیح اور بہتر انداز میں یہ امت کارِ نبوت اور دعوت وتبلیغ کے فریضہ کو انجام دے گی، رسول اللہ ﷺ نے جیسے ایمان ویقین اور ایمان کی پختگی اور اعمال کی پاکیزگی کی تعلیم دی ہے اسی طرح دلوں کے جوڑ اور شیرازہ بندی کی تاکید بھی فرمائی ہے، اس لیے کہ اگر خود مسلمانوں میں اتحاد ویکجہتی اور اخوت و بھائی چارگی نہ ہو اور وہ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوں تو دعوتِ دین کی ذمہ داری کسی بھی طرح ادا نہیں کی جاسکتی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے، اس لیے نہ خود اس پر ظلم و زیادتی کرے، نہ دوسروں کا مظلوم بننے کے لیے اس کو بے یارومددگار چھوڑ دے، نہ اس کو رسوا کرے، نہ اس کی تحقیر کرے، آپ ﷺ نے مزید فرمایا کہ کسی شخص کے برے ہونے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنے کسی مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے اور اس کی تحقیر کرے، ہر مسلمان کے لیے حرام ہے کہ وہ دوسرے مسلمان کا خون بہائے، اس کا مال لوٹے اور اس کو بے آبرو کرے، (مسلم بحوالہ ریاض الصالحین، ص:۱۲۱، باب تعظیم حرمات المسلمین) ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے کسی بددین منافق کے شر سے کسی بندۂ مؤمن کی حمایت (حفاظت) کی (مثلاً کسی شریر بددین نے کسی مؤمن بندے پر کوئی الزام لگایا اور کوئی باتوفیق مسلمان نے اس کی مدافعت کی) تو اللہ تعالیٰ اس مدافعت کرنے والے باتوفیق مسلمان کے لیے قیامت کے دن ایک فرشتہ مقرر فرمائے گا، جو اس کے جسم کو

دوزخ کی آگ سے بچائے گا اور جس کسی نے کسی مسلمان کو بدنام کرنے، گرانے اور نیچا دکھانے کے لیے اس پر کوئی الزام لگایا تو اللہ تعالیٰ اس الزام لگانے والے کو جہنم کے پل پر قید کردے گا جب تک کہ یہ شخص اپنے الزام کی گندگی سے پاک صاف نہ ہوجائے۔ (سنن ابی داؤد بحوالہ معارف الحدیث ۱۳۵/۶ کتاب المعاشرہ المعاملات) مطلب یہ کہ کسی بندۂ مؤمن پر الزام لگا کر اس کو بدنام اور رسوا کرنا، اس کے خلاف غلط پروپیگنڈہ کرنا اتنا سنگین اور سخت گناہ ہے کہ اس کا ارتکاب کرنے والا اگرچہ مسلمان ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی جہنم کے ایک حصہ میں قید کردیا جائے گا، جب تک کہ وہ جل بھن کر اس گناہ سے پاک وصاف نہ ہوجائے، جس طرح کہ سونا اس وقت تک آگ پر رکھا جاتا ہے جب تک کہ اس کا میل کچیل ختم نہ ہوجائے اسی طرح گنہ گار مسلمان دوزخ کی آگ میں اُس وقت تک رہتے ہیں جب تک کہ وہ گناہوں سے پاک صاف نہ ہوجائیں، ان احادیث کے علاوہ خود قرآن مجید میں واضح طور پر فرمایا گیا کہ اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورۃ الحجرات: ۱۰ تا ۱۱) آگے مزید فرمایا گیا کہ نہ مؤمن مرد ایک دوسرے کا مذاق اڑائیں اور نہ مؤمن عورتیں ایک دوسرے کا تمسخر کریں اور یہ بھی کہا گیا کہ ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارا کرو۔

ان تعلیمات کی روشنی میں مسلمانوں کے درمیان اخوت و بھائی چارگی اور اتحاد و یکجہتی کو باقی رکھنے کی ضرورت آج پہلے سے زیادہ ہے، اس لیے کہ اَلْكُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ کے طرز پر اسلام دشمن طاقتیں مسلمانوں کے خلاف متحد ہیں، ان اسلامی اور انسانی تعلیمات کے پس منظر میں یہ بھی غور کرنا ضروری ہے کہ کیا معاشرہ میں ہونے والے سیرت اور میلاد النبی کے جلسوں میں ان تعلیمات کی پابندی اور پیروی کی جاتی ہے؟؟ کیا ان اجتماعات سے برادرانِ وطن اسلام سے قریب ہوتے ہیں یا دور؟ حقیقت یہ ہے کہ سیرت اور میلاد النبی کے نام پر ہونے والے ان عوامی جلسوں میں کئی ایک پہلو قابل اصلاح ہیں، مثلاً:

ایک یہ کہ ان جلسوں میں حد سے زیادہ فضول خرچی ہوتی ہے، جس قوم وملت میں دولت خرچ کرنے کا سلیقہ نہ ہو اس کے کنگال ہونے میں دیر نہیں لگتی، حالات کے نشیب وفراز سے آگاہ اور باخبر ذہنوں میں کئی ایسی تصویریں موجود ہیں کہ جن کی ''شاہ خرچی'' اور شاہانہ ٹھاٹ باٹ ضرب المثل تھی

، پھر حالات کچھ ایسا پلٹا کھائے کہ وہ خود اوران کی نسلیں نانِ شبینہ کے محتاج ہو گئے، عام طور پر اس طرح کی عبرت ناک صورتِ حال خرچ کرنے کے معاملہ میں اعتدال اورتوازن نہ ہونے کی وجہ سے پیش آتی ہے، اسراف صرف یہ نہیں ہے کہ فضول اور بے کار جگہوں پر خرچ کیا جائے بلکہ اسلامی تعلیمات کی رو سے یہ بھی اسراف میں داخل ہے کہ ضروری کاموں میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے ،قرآن مجید میں اسراف اور فضول خرچی کرنے والوں کو شیطان کا بھائی کہا گیا ہے: اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْا اِخْوَانَ الشَّیَاطِیْنَ۔ (بنی اسرائیل: ۲۷) ایک دوسری جگہ ارشادِ ربانی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا :اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ (الانعام: ۱۴) اسراف اورفضول خرچی کے بیان کے سلسلہ میں قرآن مجید میں دولفظ آئے ہیں ،ایک: تبذیر، دوسرے: اسراف ،تبذیر یہ ہے کہ بے جااور بے موقع خرچ کیا جائے ،! جیسے حد سے زیادہ روشنی کا اہتمام، آتش بازی، گانے بجانے اوراپنی تشہیر کے لیے خرچ کرنے کیا جائے، اسراف یہ ہے کہ جن امور میں خرچ کرنے کی ضرورت ہے،ان میں ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے ،مثلاً کھانا پینا اورلباس وپوشاک انسان کی ایک ضرورت ہے،لیکن ان میں حد سے زیادہ خرچ کیا جائے ،جیسے شادی بیاہ اوردیگر تقریبات کے موقع پر انواع واقسام کے کھانے رکھے جائیں، چنانچہ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ جو کچھ طبیعت چاہے اس کو کھالینا اسراف میں داخل ہے۔(ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۳۳۹۶) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: کھاؤ پیو، صدقہ کرو اور پہنو، البتہ فضول خرچی نہ ہو اور تکبر نہ ہو۔(ابن ماجہ: ۳۶۰۵)ان روایات سے معلوم ہوا کہ اسراف اورفضول خرچی کی کتنی سخت ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔

دوسرے یہ کہ جلسے اوراجتماعات چوراہوں اورگلی کوچوں میں رکھے جاتے ہیں،اس کے لیے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی کردی جاتی ہیں،جس کی بنا پر راہ چلنے والوں کوسخت پریشانی اوردشواری ہوتی ہے، بالخصوص اجنبی مسافرین کو جنہیں دوسرا متبادل راستہ معلوم نہیں رہتا ،تیسرے یہ کہ لوڈاسپیکر کا استعمال اتنا بے تحاشا اورظالمانہ ہوتا ہے کہ مریض اور معمر حضرات کی حالت وطبیعت داؤ پر لگ جاتی

ہے، نیز برادرانِ وطن اس کا غلط تأثر لیتے ہیں، چوتھے یہ کہ مقامِ جلسہ کو بجلی کے قمقموں اور روشنی کے تاروں کے ذریعہ حددرجہ خوبصورت اور بارونق بنایا جاتا ہے، نیز اسٹیج کی بناوٹ اور سجاوٹ پر کثیر سرمایہ صرف ہوتا ہے، حالاں کہ جس آبادی اور محلہ میں یہ جلسہ ہوتا ہے، اس میں ملت کے کتنے ہی غریب مسلمان گھرانے ہوتے ہیں جن کے یہاں صحیح معنوں میں دووقت چولہا نہیں جلتا، یہ اسراف وفضول خرچی ہے اور غرباء ومساکین کی حق تلفی بھی، پانچویں یہ کہ ان جلسوں میں بعض واعظین ومقررین مسلکی اختلافات کو موضوعِ بحث بناکر عام مسلمانوں کو انتشار واختلاف کی بے رحم آندھیوں کے حوالہ کردیتے ہیں، شرکائے جلسہ باہمی اخوت ومحبت کے سوغات لے کر لوٹنے کے بجائے اپنے دلوں میں نفرت وحقارت کے جذبات لے کر واپس ہوتے ہیں، مسئلہ یہ نہیں ہے کہ ماہ ربیع الاول کی مناسبت سے ہمیں میلاد کی محفلیں اور سیرت کے جلسے منعقد کرنا چاہیے یا نہ کرنا چاہیے؟ سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ان محفلوں اور جلسوں میں محبتِ رسول کے جذبات کے اظہار کے لئے اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی پیروی اور پابندی ہم کہاں تک کرتے ہیں؟؟ اللہ تعالیٰ ہمیں دین کی صحیح سمجھ اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت عطا فرمائے۔

رکھیو غالب !مجھے اس تلخ نوائی میں معاف
آج کچھ درد میرے سینہ میں سوا ہوتا ہے

......روزنامہ مصنف ۱۳/اپریل ۲۰۰۷ء......

واعظ کا ہر اک ارشاد بجا، تقریر بہت دلچسپ مگر آنکھوں میں سرورِ عشق نہیں ، چہرے پہ یقین کا نور نہیں

ہم کو مٹا سکے یہ زمانہ میں دَم نہیں
ہم سے زمانہ خود ہے زمانہ سے ہم نہیں

۞۞۞

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن
گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان

حالاتِ حاضرہ واصلاح معاشرہ!

بچوں کی دینی تعلیم وتربیت اور ہماری ذمہ داری

بچے، خدا تعالیٰ کی جانب سے انمول تحفہ اور بیش بہا عطیہ ہے، ان کی صحیح تعلیم وتربیت اگر کی گئی ہوتو وہ باغِ جنت کے لہلہاتے پھول ہیں اور دنیا میں اپنے والدین کی شرافت ونیک نامی کا ذریعہ بھی، اور اگر بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت پر توجہ نہ دی گئی ہوتو یہی جنت کے پھول دوزخ کی آگ کا ایندھن ہے اور دنیا میں والدین کی بدنامی اور رسوائی کا ذریعہ بھی ،قرآن مجید میں بچوں کو" آنکھوں کی ٹھنڈک" قرار دیا گیا ہے۔(سورۃ الفرقان:۷۴)واقعہ یہ ہے کہ آج کے بچے جو کل کے بڑے ہیں اگر اپنی زندگی میں اپنے بوڑھے والدین کے کام آئیں، ان کا نام دنیا میں روشن کریں ،ان کے دست وبازو بنیں تو وہ "نورِ نظر"، "لختِ جگر" اور "جگر گوشہ" سب کچھ ہیں ، ورنہ پھر یہی آنکھوں کا نور اور دل کا سرور والدین کے لیے "عذابِ جاں" اور "سوہانِ روح" ہے۔

قرآن وحدیث میں بڑے بزرگوں اور سرپرستوں کو پابند بنایا گیا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے صحیح تعلیم وتربیت کا انتظام واہتمام کریں، اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ۔(سورۃ التحریم :٦)اس آیت کے نزول کے بعد حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ! اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی فکر تو سمجھ میں آ گئی کہ ہم گناہوں سے بچیں اور احکامِ الٰہی کی پابندی کریں، مگر اہل وعیال کو کس طرح ہم جہنم سے بچائیں؟ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم کو جن کاموں سے منع فرمایا ہے ان کاموں سے ان سب کو منع کردو اور جن کاموں کے کرنے کا تمھیں حکم دیا ہے تم بھی ان کے کرنے کا اپنے اہل وعیال کو پابند بناؤ، تب تمہارا یہ عمل ان کو جہنم کی آگ سے بچا سکے گا۔

بچوں کو کن باتوں کی تعلیم دینا چاہیے اور کیسے ان کی تربیت کرنی چاہیے؟ اس کی بہترین مثال حضرت لقمان کی وہ نصیحتیں ہیں جو انھوں نے اپنے بیٹے کو فرمائی تھی ،قرآن مجید کے سورۂ لقمان میں اس

کی تفصیل موجود ہے، حضرت لقمان کی یہ مبارک نصیحتیں زندگی کے تقریباً تمام گوشوں کو شامل ہیں، مثلاً:

آپ نے فرمایا اے میرے بیٹے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہرا، یہ بھی بتایا کہ اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے اور ہر چیز پر قادر ہے، کوئی چیز اس سے چھپ کر نہیں رہ سکتی، حضرت لقمان فرماتے ہیں: اے میرے بیٹے! اگر کوئی چیز رائی کے دانہ کے برابر ہو پھر وہ کسی پتھر یا زمین و آسمان کی کسی بھی جگہ میں پوشیدہ ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کر دیتا ہے، اسی طرح بیٹے کو اپنے اعمال کی درستگی اور مخلوق کی اصلاح کے بارے میں نصیحت فرماتے ہیں کہ نماز کا اہتمام کرو، لوگوں کو نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو، طرزِ معاشرت اور آدابِ زندگی کے بارے میں نصیحت فرماتے ہیں کہ اے میرے بیٹے! فخر اور غرور کی وجہ سے لوگوں سے انجان مت بنو اور نہ زمین پر اکڑ کر چلو، زمین پر جب چلو تو درمیانی رفتار سے چلو اور جب بات کرو تو اپنی آواز کو پست رکھو۔ (مفہومِ آیات: ۱۳ تا ۱۹ سورۃ لقمان) حضرت لقمانِ حکیم کے علاوہ قرآن مجید میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ اہل وعیال کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیتے تھے: وَکَانَ یَأْمُرُ اَھْلَہٗ بِالصَّلَاۃِ وَالزَّکوٰۃِ۔ (سورۃ مریم: ۵۵) خود آنحضرت ﷺ کو حکم دیا گیا کہ اے نبی! اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کیجئے اور خود بھی اس پر جم جائیے۔ (سورۃ طٰہٰ: ۱۳۲) اس کے علاوہ انسان جب جوان ہو جائے یا ۴۰/ سال کی عمر کو پہونچ جائے تو اس کو یہ دعا سکھائی گئی کہ اے میرے پروردگار! میری اصلاح فرما اور میری اولاد و نسل کی بھی۔ (سورۃ الاحقاف: ۵)

اندازہ لگائیے! وقت کے پیغمبر اور خدا تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اپنی اولاد کی اصلاح و تربیت کے بارے میں اتنے فکرمند ہیں تو ہم اور آپ کس شمار و قطار میں کہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کو نظر انداز کر دیں یا اس سے بے نیاز و بے پروا ہو جائیں، حضراتِ انبیاءِ کرام کا یہ اسوہ ہمارے لیے نمونہ ہے کہ انسان اپنی جگہ کتنا ہی صالح، نیک، متقی پرہیزگار اور نیکوکار کیوں نہ ہو وہ اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت سے چشم پوشی نہیں کر سکتا، ورنہ اگر شریف اور بزرگ گھرانوں میں شریر اولاد پلی بڑھی ہو تو یہی سمجھا جائے گا کہ: ''سارے جہاں سے باخبر اور اپنے جہاں سے بے خبر'' یا پھر کہا جائے گا: ''چراغ تلے اندھیرا''

بچوں کی اصلاح، ان کی صحیح دیکھ بھال و نگرانی اور ان کی تعلیم و تربیت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی ہدایات جا بجا ملتی ہیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اولاد کے لیے والدین کا سب سے بہترین تحفہ

اور عطیہ ان کی صحیح تعلیم و تربیت کا انتظام کرنا ہے۔(ترمذی باب ما جاء فی ادب الوالد) آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو نماز کی عادت ڈالو اور جب دس برس کی عمر کو پہنچ جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اس کی تنبیہ کرو، (ترمذی: ۱/ ۳۹) ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اپنی اولاد کو تین باتوں کی تربیت دو، ایک اپنے نبی (ﷺ) سے محبت، دوسرے نبی (ﷺ) کے گھر والوں سے محبت، تیسرے قرآن مجید کی تلاوت۔(طبرانی عن علیؓ) آنحضرت ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں صحابہ کرامؓ کا معمول تھا کہ اپنے بچوں کی دینی و اسلامی تربیت کے ساتھ ساتھ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اور سیرتِ مبارکہ کی بھی تعلیم دیتے تھے۔ حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے انہوں نے فرمایا کہ ہم جس طرح اپنے بچوں کو قرآن کی تعلیم دیا کرتے ہیں، اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے غزوات کی بھی تعلیم دیا کرتے تھے۔(تربیتِ اولاد فی الاسلام: ۱/ ۱۵۰ بحوالہ حلال وحرام) آپ ﷺ نے یہ بھی تعلیم فرمایا کہ آدمی اپنے اہل وعیال کا ذمہ دار اور نگران ہے اور روزِ قیامت میں اہل وعیال سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کے بارے میں وہ اللہ کے حضور جوابدہ ہوگا۔(بخاری، باب العبد راع فی مال سیّدہ)

اولاد کی تربیت و اصلاح کے لیے اپنے بس میں جو کچھ ہے وہ سب کیا جائے، لیکن اس کے ساتھ ان کے حق میں دعائیں بھی ہوتی رہیں، قرآن مجید میں اللہ کے نیک بندوں کی یہ دعاء بیان ہوئی ہے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَاما (سورۃ الفرقان: ۷۴) اے ہمارے پروردگار ہمیں اپنی بیویوں سے آنکھوں کی ٹھنڈک (والی اولاد) عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا، ایک جگہ حضرت ابراھیم علیہ السلام کی دعاء کا ذکر ہے: رَبِّ اجْعَلْنِيْ مُقِيْمَ الصَّلاَةِ وَمِن ذُرِّيَّتِيْ (سورۃ ابرھیم: ۴۰) اے میرے رب مجھے اور میری نسل کو نماز کا پابند بنا، قرآن مجید کی یہ جامع اور پرمغز دعائیں اولاد کی تربیت و اصلاح کے تمام گوشوں اور پہلوؤں کو شامل ہیں، غرض یہ کہ گمراہی و بے دینی اور مادہ پرستی کے اس نازک دور میں اپنے بچوں کی دینی تعلیم و تربیت ہماری اولین ذمہ داری ہے، اس ذمہ داری کی بحسن بخوبی ادائیگی میں ہماری اپنی سرخروئی و سرفرازی بھی ہے اور اپنی آئندہ نسل کی کامیابی و کامرانی بھی اسی سے وابستہ ہے۔

اے میرے بچو!

میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟؟

مضمون کا عنوان قرآن مجید کی ایک آیت کے ٹکرے کا ترجمہ ہے: ''**ماتعبدون من بعدی**'' یہ آیت دراصل جلیل القدر پیغمبر حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقولہ ہے، حضرت یعقوب علیہ السلام کے انتقال کا وقت جب قریب ہوا تو آپ علیہ السلام نے اپنے بچوں سے یہ بات دریافت فرمائی کہ اے میرے بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ انتقال کے موقع پر جب کوئی بات کہی جائے تو وہ بات زندگی میں موقع بہ موقع بہ طورِ نصیحت کی جانے والی عام باتوں کی طرح نہیں ہوتی، یہ بات صرف نصیحت ہی نہیں بلکہ وصیت کا درجہ رکھتی ہے، اور نصیحت کے مقابلہ میں وصیت کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے۔

زندگی کے آخری وقت میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی اولاد سے یہ سوال کرنا، حقیقت میں اپنے گذر جانے کے بعد بچوں کی دینداری، دین سے گہری وابستگی اور ایمان پر ثابت قدمی کے تعلق سے اُن کی فکرمندی کو ظاہر کرتا ہے کہ بحیثیت نبی و پیغمبر توحید کی دعوت میری زندگی کا مقصد و مشن رہا، کیا میرے انتقال کر جانے کے بعد میرے بچے اس مقصد و مشن کے علمبردار رہیں گے یا اس سے دست بردار ہو جائیں گے، حضرت یعقوب علیہ السلام کی اس فکرمندی سے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت کی اہمیت وضرورت معلوم ہوتی ہے، اس لئے کہ بچوں کی مثال ''سادہ سلیٹ'' کی سی ہے، اس پر جو لکھا جائے گا وہی آخر تک باقی رہے گا، جیسا کہ محاورہ ہے کہ: **اَلْعِلْمُ فِی الصِّغْرِ کَالنَّقْشِ فِی الْحَجَرِ** بچپن میں جو باتیں سکھائی اور بتائی جاتی ہیں ''وہ پتھر کی لکیر'' ہوتی ہیں، تعلیم و تربیت کے عنوان سے جو چیزیں ان کے ذہنوں میں بٹھائی جائیں گی اس کے اثرات آخر عمر تک محسوس کئے جاتے ہیں، بچہ کی زندگی کا دھارا اگر صحیح رخ پر چلانا ہے تو اس کی اصلاح و تربیت کا انتظام والدین کی پہلی ذمہ داری ہے۔

اس کو سامراجی طاقتوں اور مذہب بیزار تحریکوں کا کرشمہ کہیے یا ہماری سوچ وفکر کا المیہ کہ تعلیم کو دو خانوں میں تقسیم کر دیا گیا، مذہبی وعصری تعلیم، دینی اور دنیاوی تعلیم، یہ تقسیم ان لوگوں کے لیے کارگر اور کارآمد ہے جو اس نظریہ اور نعرہ کے علمبردار، پیروکار اور پیداوار ہیں کہ "قیصر کا حق قیصر کو دو اور کلیسا کا حق کلیسا کو دو" ایک مسلمان اور بندۂ مؤمن کے واسطے یہ تقسیم فائدہ مند نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ وہ جیسے نماز کے مصلّی پر اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری کا پابند ہے بالکل اسی طرح دوکان کے کاؤنٹر پر، ملازمت کی کرسی پر اور کلاس روم کی بینچ پر بھی وہ احکامِ الٰہی کا پابند وتابع ہے، مسلمان زندگی کے ہر گوشہ وشعبہ میں خدا تعالیٰ کی فرمانبرداری اور اس کی فرمانروائی کا قائل ہے۔

بچوں کی صحیح تعلیم وتربیت کے اس پس منظر میں دو باتیں ہمارے لیے قابلِ غور اور لائقِ توجہ ہیں، ایک یہ کہ ہمارا ملک چوں کہ سیکولر اور جمہوری ہے، اس لیے یہاں کا نصابِ تعلیم بھی سیکولر ولا دینی ہے اور عصری درسگاہیں چاہے وہ مسلم انتظامیہ کے تحت ہوں یا غیر مسلم انتظامیہ کے، اسی لا دینی نصابِ تعلیم کو پڑھانے کے پابند ہیں، اس نصابِ تعلیم میں چاہتے ہوئے بھی کوئی بہتری نہیں لائی جاسکتی، البتہ جو مسلمان اساتذہ ہیں وہ دورانِ تدریس مسلمان طلبہ وطالبات کی صحیح ذہن سازی کر سکتے ہیں، دوسرے یہ کہ "نظامِ تعلیم" ہمارے قابو اور اختیار میں ہے، اس میں حکومت کی طرف سے کوئی پابندیاں اور حد بندیاں نہیں ہوا کرتیں، نظامِ تعلیم کے عنوان سے اپنے نونہالوں، طلبہ وطالبات کو اسلامی ماحول اور دینی تربیت فراہم کرتے ہوئے انہیں اعلیٰ وعصری تعلیم سے آراستہ کیا جاسکتا ہے، مقررہ لا دینی نصابِ تعلیم سے ہٹ کر اسلامیات ودینیات کی تعلیم کا خصوصی انتظام کیا جاسکتا ہے۔ مقامِ شکر ہے کہ اس طرف ذمہ دار علماءِ کرام اور قوم وملت کے لیے "کچھ کر گذر جانے" کے جذبہ سے سرشار دردمند احباب کی توجہات ہورہی ہیں، اس کے علاوہ خود طلبہ اور ان کے اولیاء میں دینی شعور واحساس قابلِ تحسین ہے کہ انہوں نے تعلیم کے میدان میں مشہور مشنری اسکولس اور کالجس کو محض اس وجہ سے چھوڑ دیا کہ ان میں نمازِ جمعہ اور ظہر کی نماز کے لیے وقت نہیں دیا گیا، اسی دینی بیداری وشعور کو دیکھ کر بعض پرائمری اسکولس کے انتظامیہ نے نعرہ دیا کہ: "اپنے نونہالوں کو عصری علوم کے ساتھ ساتھ حافظِ قرآن بنائیے" تجربہ اور مشاہدہ یہ ہے کہ اس طرح کے نعروں میں معقولیت اور حقیقت پسندی سے زیادہ مسلمانوں کے مذہبی جذبا

ت کا استحصال ہوتا ہے اور ملت کے نونہالوں کے مستقبل سے کھلواڑ بھی! نہ اُن کو صحیح دینی تعلیم ملتی ہے اور نہ وہ عصری تعلیم میں پختہ ہوتے ہیں بقول شخصے ؎

نہ خدا ہی ملا، نہ وصالِ صنم
نہ اِدھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

صحیح بات یہ ہے کہ دینی تربیت و اسلامی ماحول میں عصری تعلیم کی اہمیت کا یہ مقصد نہیں کہ طلبہ کو حافظِ قرآن مجید یا عالمِ دین بنایا جائے، اس کے لیے مستقل اعلیٰ دینی درسگاہیں بڑی تعداد میں پہلے سے موجود ہیں، اس کوشش وجدوجہد کا واحد مقصد یہ ہے کہ ہمارے طلبہ اعلیٰ عصری تعلیم کے بعد اپنے دین و مذہب پر پوری خود اعتمادی و احساسِ برتری کے ساتھ قائم رہیں، اپنی روشن تہذیب و ثقافت سے وابستہ رہیں اور اپنے اعلیٰ اقدار و روایات کے پابند رہیں، اب جب کہ تعطیلات کا مہینہ چل رہا ہے اور آئندہ کچھ دنوں میں نئے تعلیمی ادارے کھل جائیں گے اور داخلوں کی کاروائیاں شروع ہو جائیں گی، اولیاءِ طلبہ و سرپرستان کا سخت امتحان اور کڑی آزمائش ہوگی، انہیں دوٹوک فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ صرف اعلیٰ تعلیم کے لیے لادینی تربیت اور غیر اسلامی ماحول میں اپنی نوخیز اور نئی نسل کو الحاد و ارتداد کی تباہ کن موجوں کے حوالہ کردیں گے یا پھر اپنی اس نئی پود کو اعلیٰ عصری تعلیم کے ساتھ ساتھ دینِ اسلام کا پیرو کار اور علمبردار اور رسول اللہ ﷺ کا غلام بنا کر رکھیں گے؟ یاد رکھیے! صرف اعلیٰ عصری تعلیم سے آپ کا بچہ نام کا مسلمان ہوگا، عقیدہ و ایمان سے بالکل کھوکھلا اور تاریخِ اسلامی سے بالکل کورا ہوگا، وہ ایسا ''عرفان'' ہوگا جس کو اپنے نبی ﷺ کے والدِ ماجد کی صحیح طور پر پہچان نہیں ہوگی، یا پھر آپ کی دختر ایسی ''فاطمہ'' ہوگی جو اپنی عصری تعلیم میں ''رینک'' حاصل کرنے کے بعد نبی ﷺ کے والدۂ ماجدہ کا نام ''بی بی فاطمہ'' بتائے گی۔

ایک مسلمان کے لیے دنیا و آخرت میں سب سے بڑا سرمایہ اس کا عقیدہ و ایمان ہے، اس کی وجہ سے دنیا میں اس کی پہچان و شناخت ہے اور آخرت میں نجات، انسان اشرف المخلوقات ہے اور انسانوں میں سب سے زیادہ برگزیدہ ومقدس جماعت حضراتِ انبیاء علیہم السلام کی ہے، قرآن مجید میں حضرت ابرہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام کی وصیت موجود ہے، اس میں ان دونوں برگزیدہ پیغمبروں نے اپنے فرزندوں کو یہ نصیحت اور وصیت کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ تعالیٰ نے تمہیں دینِ اسلام کے لیے چن لیا اور حالتِ اسلام

ہی میں تمہاری موت ہونی چاہیے، پوری زندگی دین وایمان پر باقی رہے اور حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میرے بچو! میرے بعد تم کس کی بندگی کرو گے؟ سب نے جواب دیا کہ ہم ایک خدا کی عبادت کریں گے......اور ہم مسلمان رہیں گے۔(سورۃ البقرۃ:۱۲۳)

یہاں پر تھوڑی دیر رک کر، اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر اور اپنے ذہن پر زور دے کر ہر مسلمان سوچ سکتا ہے کہ میں نے اپنے لختِ جگر کو اعلیٰ عصری تعلیم دلوادی تا کہ وہ باوقار طریقہ پر معیاری زندگی گزار سکے، میں نے اس کو بہترین روزگار سے لگوادیا، تا کہ وہ میرے بعد کسی کا دست نگر ومحتاج نہ رہے، میں نے اس کے نام پر کئی بینک بیالنس چھوڑے اور قیمتی جائیدادیں اس کے نام پر کردی تا کہ میرے بعد اس کی زندگی میں آڑے وقت کام آسکے،لیکن کیا میں نے اپنی اولاد کے لیے دینی تعلیم وتربیت اور اسلامی ماحول کا ایسا کوئی انتظام کیا کہ میرے مرنے کے بعد میرے بچے دین وایمان پر باقی رہیں،عقیدۂ وایمان کو مضبوطی سے تھامے رہیں اور زندگی کی آخری سانس تک رسول اللہ ﷺ کی غلامی کا طوق اپنی گردن میں ڈالے رہیں؟ خدانخواستہ اگر یہ انتظام نہیں ہوا ہے تو پھر ہمیں یہ بات محض اندیشہ وخطرہ نہیں بلکہ واقعہ کے طور پر ماننا چاہیے کہ اس نری عصری تعلیم کی وجہ سے اسریٰ نعمانی وڈاکٹر وددو جیسے ''اسکالر'' اور ''پروفیسر'' ہماری نسل میں پیدا ہوں گے جو مسلم سماج کے لیے بدنما داغ اور اہل اسلام کے لیے ننگ وعار ہیں۔

پس جب بھی اپنے نونہالوں کا مستقبل ہمارے سامنے ہو، ان کی اعلیٰ تعلیم کا منصوبہ ہمارے ذہن میں ہو تو اپنے دل ودماغ پر قرآن مجید کی اس آیت کو نقش کرنا ہوگا کہ: وَلاَ تَمُوْتُنَّ اِلاَّ وَ اَنْتُمْ مُسْلِمُوْنَ ایمان پر ہی تمہاری موت ہو اور آخر میں اکبرالہ آبادی مرحوم کا یہ پیغام خود بھی پڑھیں اور اپنے نونہالوں کو بھی سنائیں۔

تم شوق سے کالج میں پڑھو، پارک میں گھومو
جائز ہے غباروں میں اُڑو، چرخ پر جھولو
بس ایک سخن بندۂ عاجز کا رہے یاد
اللہ کو اور اپنی حقیقت کو نہ بھولو

روزنامہ منصف: ۱۳/مئی ۲۰۰۵ء

اسلام میں نکاح بہت آسان ہے......!

عورت ہر انسان کی فطری اور طبعی ضرورت ہے،اس کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نامکمل اورادھورا ہے،اس لیے جب حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق مکمل ہوئی تو آپ اپنے لیے ایک رفیقِ زندگی اورشریکِ حیات کی ضرورت محسوس کرنے لگے تا کہ دلجوئی اوردلچسپی کا کچھ سامان ہوسکے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے حضرت آدم علیہ السلام کی دائیں پسلی سے حضرت بی بی حوا رضی اللہ عنہا کو پیدا فرمایا، اس طرح عورت مرد کے بدن کا ایک لازمی اوراٹوٹ حصہ قرار پائی۔

اس طبعی اورفطری ضرورت کی تکمیل کے لیے مختلف مذاہب اورمعاشروں نے الگ الگ طریقے ایجاد کیے،کسی مذہب اورسماج میں اس ضرورت سے استفادہ بالکل ممنوع قراردیا گیا،تجرداور برھما چاری کی زندگی کو پسند کیا گیا، یہ پابندی چوں کہ فطرت کے خلاف بغاوت تھی،اس لیے اس ممانعت کی وجہ سے نت نئی بیماریاں اور برائیاں اس سماج اوراس مذہب کے پیروکاروں میں پیدا ہونے لگیں، پھروہ لوگ چوردروازوں سے اپنی اس طبعی وفطری ضرورت کو پورا کرنے لگےاور یہ سب کچھ مذہب کے لبادہ میں مقدس مذہبی شخصیات سے ہونے لگا،کسی مذہب اورسماج میں عورت سے استفادہ کے سلسلہ میں اتنی چھوٹ اورآزادی دے دی گئی کہ عورت ازخود بے قیمت اور بے حیثیت ہوکررہ گئی،سامان کی شکل میں اس کی خرید وفروخت ہونے لگی،مالِ وراثت کی طرح وہ افرادِ خاندان میں تقسیم ہونے لگی،عورت سے استفادہ کی اس غیر مشروط اورلامحدود اجازت کی بناء جوسماجی نقصانات اورتباہ کاریاں ہوسکتی ہیں اس کا بہت کچھ اندازہ یورپ ومغرب کے آزدانہ ماحول ومعاشرہ سے لگایا جاسکتا ہے، جہاں مردوعورت کے آزادنہ اختلاط کی وجہ سے نکاح کا مقدس رشتہ اورازدواجی بندھن محض ایک ضابطہ کا عمل اوررسمی کاروائی ہوکررہ گیا، ماں، بہن، اور بیٹی کا تقدس بری طرح پامال ہوگیا،عفت وعصمت کی چادر تارتار ہوگئی،مردوزن کے اس آزادانہ اختلاط نے بے حیائی،فحاشی اورعریانیت کے طوفان بدتمیزی

کا بند کھول دیا، جنسی انارکی پھیل گئی، ایسی ایسی برائیاں اور بیماریاں پھیلنے اور پنپنے لگیں جو کسی کے خیال وتصور میں بھی نہیں تھیں، "مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی" کے مصداق یہ بیماریاں بجائے کم ہونے کے ان کا فیصد برابر بڑھتا جارہا ہے۔

اسلام ایک فطری مذہب ہے، عورت سے استفادہ کے معاملہ میں اس نے انسان کو فطرت کا باغی نہیں بنایا، بلکہ اس کے متعلق انسان کے جو فطری تقاضے اور ضرورتیں ہیں اس کی تکمیل کی طرف توجہ دلائی اور اس کی حوصلہ افزائی بھی فرمائی، البتہ اس کے لیے اسلام نے افراط وتفریط سے ہٹ کر عدل واعتدال کا راستہ اختیار کیا، اسلام میں عورت سے استفادہ نہ بالکل ممنوع قرار دیا گیا کہ اس کے لیے چور دروازوں سے آنا پڑے، اور نہ اس بارے میں اتنی کھلی آزادی اور چھوٹ دیدی گئی کہ تہذیب وشرافت منہ چھپانے لگے اور انسانی عظمت وفضیلت سر پیٹنے لگے، اسلام میں ایک اجنبی عورت کے ساتھ قانونی وشرعی طور پر تعلقات قائم کرنے اور ایک ساتھ زندگی کا سفر طے کرنے کو "نکاح" کا نام اور عنوان دیا گیا ہے، نکاح سماج کی رسم وروایت نہیں بلکہ ایک شرعی عبادت ہے، جس طرح اور عبادتوں میں خدا تعالیٰ کی حمد وثنا ہوتی ہے اور قرآن مجید کی آیات پڑھی جاتی ہیں اسی طرح نکاح میں بھی یہ سب چیزیں ہوتی ہیں، اسلام میں نکاح کو عبادت کہہ کر اس کو بہت ہی آسان اور سہل کر دیا گیا، جیسے نماز کی ادائیگی کے وقت پاک صاف حالت میں تھوڑی دیر وضو کر لینے کے بعد مختصر سے وقت میں نماز کا عمل پورا ہو جاتا ہے، اسی طرح مرد وعورت کے دو بول اور دو گواہوں کی حاضری سے نکاح کا عمل تکمیل پاتا ہے، جیسے عبادات کے موقع پر کوئی شور شرابہ اور ہنگامہ نہیں کیا جاتا اور نہ کسی چیز کو اپنی ناک کا مسئلہ اور معیار کا پیمانہ بنایا جاتا ہے، اسی طرح نکاح کے موقع پر بھی شور وشرابہ، ہنگامے، اور کسی چیز کو اپنی ناک اور معیار کا مسئلہ بنانے کی ضرورت نہیں۔

اسلام میں نکاح کتنا آسان ہے؟ اس کی عملی مثالیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہیں، مثلاً صحابیٔ رسول حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے کپڑوں پر ایک خاص طرح کا رنگ لگا ہوا تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ کیسا رنگ ہے؟ صحابیٔ رسول نے مسکرا کر عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! میرا نکاح ہو گیا، اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ولیمہ کرو، اندازہ لگائیے کہ آج ہم معمولی سی معمولی اور چھوٹی سی چھوٹی تقریب کیوں نہ ہو، ہم اپنے پیرومرشد یا جن سے ہمارا عقیدت ومحبت کا تعلق ہے اس کی تشریف آوری ضروری سمجھتے ہیں، ان کے بغیر ہماری تقاریب ادھوری رہتی ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے شیدائی اور فدائی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اشارۂ ابرو پر اپنی جان، اپنی آل اور اپنا مال سب کچھ قربان کرتے تھے، کسی دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کا دیدار نہ ہوتو دوسرے دن بے چین و بے قرار ہوکر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوجاتے، اس بے انتہاء شدید محبت وعقیدت اور گہرے تعلق کے باوجود صحابی رسول حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنے نکاح میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو شرکت کی زحمت نہیں دی اور نہ اس کو ضروری سمجھا، بلکہ روزمرہ کی عبادت کی طرح نکاح کی عبادت کو بھی بجالایا، پھر یہ کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بتانے پر اپنی خفگی وناراضگی کا اظہار بھی نہیں فرمایا، صرف ولیمہ کرنے کا حکم دیا، ایک دوسرے صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں منقول ہے کہ وہ اپنے لیے رشتہ کی تلاش میں اپنے دوست کے ساتھ صحابیؓ کے گھر پہونچے، صاحبِ خانہ نے اس صحابی کے بجائے ان کے دوست سے اپنی لڑکی کی نسبت طے کرانے پر رضامندی ظاہر کی، چنانچہ اسی وقت صحابیٔ رسول کے دوست کا نکاح کردیا گیا، یعنی "چٹ منگنی پٹ بیاہ" کی عملی تصویر، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ سب سے زیادہ خیر وبرکت والا نکاح وہ ہے جس میں سب سے کم خرچ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ نکاح کو اتنا آسان کرو کہ زنا کرنا مشکل ہوجائے۔

غرض یہ کہ نکاح کو آسان بنانے سے متعلق اسلامی تعلیمات پر عمل آوری کی وجہ سے مسلم معاشرہ ایک مثالی معاشرہ تھا، جس میں خواتین کی عفت وعصمت باقی تھی، حیاء و پاکدامنی کا دور دورہ تھا، بیٹیوں کی پیدائش اور پرورش کوئی مسئلہ نہ تھی، آج چوں کہ نکاح کے موقع پر اسلامی تعلیمات سے زیادہ سماجی رسوم وروایات کو اہمیت دی جانے لگی اس لیے مسلم معاشرہ کی تباہی وبربادی ہم سرکی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

اس وقت مسلم سماج جس تباہی کے دہانہ پر کھڑا ہے، اس کی اہم وجہ نکاح کو مشکل بنانا ہے، نکاح اس لیے مشکل بن گیا کہ اس کو عبادت کے بجائے زمانہ اور سماج کی رسم وروایت کا درجہ دیا گیا ہے، ظاہر ہے کہ جو چیز اپنی اصل حقیقت وحیثیت سے الگ ہوکر رسم ورواج کی شکل اختیار کرلیتی ہے تو

رسم ورواج کی تمام خرابیاں اورتباہ کاریاں اس میں پیدا ہوتی ہیں، چنانچہ نکاح رسم ورواج کا درجہ پانے کے بعد"جہیز" جیسی لعنت کواس میں اہم اورمرکزی حیثیت حاصل ہوگئی، مسلم معاشرہ میں یہ لعنت داخل ہونے کی بناء پر نکاح کا جائز اورآسان راستہ انتہائی مشکل بن گیا، علماء اسلام نے"جہیز" کو رشوت قرار دیا جس کے لینے اور دینے والے دونوں جہنمی ہیں۔ اسلام نے نکاح کو جتنا آسان اورسادہ بنایا تھا سماج کے رسوم ورواج نے اس کواتنا ہی مشکل اور پیچیدہ بنادیا، آج ایک معمولی اورمتوسط درجہ کا آدمی بھی اگراپنی بیٹی کی شادی کرنا چاہے تو لاکھوں کے بجٹ کے ساتھ وہ قدم اٹھا سکتا ہے، فرسودہ اورغیراسلامی رسوم کی بناء پر نکاح کا آسان طریقہ مشکل ہونے سے جنسی خواہشات کی تکمیل کے لیے بدکاری اور بے حیائی کا راستہ اختیار کیا جارہا ہے، بین مذہبی شادیاں ہونے لگیں، لومیاریج اورکوٹ میاریج کے شرمناک واقعات رونما ہونے لگے، جنسی تسکین کے لیے عیاشی اورجسم فروشی کے اڈّوں پر ملت کی بہو بیٹیاں نظر آنے لگیں، ملت اسلامیہ کی عزت وآبرو کواس طرح سرِ بازار نیلام ہوتے ہوئے شاید آسمان نے کبھی دیکھا ہو؟ اس افسوس ناک صورتحال کے لیے صرف ایک فرد اورخاندان ہی نہیں بلکہ پورا سماج ذمہ دار ہے۔

اس وقت جہیز کی لعنت ملت اسلامیہ کے لیے رستا ہوا ناسور بنی ہوئی ہے، یہ نحوست مسلم معاشرہ میں اسلامی اقدار اوراخلاقی تعلیمات کوگھن کی طرح کھارہی ہے، نبی ﷺ کی تعلیمات سے بغاوت کرکے مسلمان بہنوں کی عزت وآبرو سے کھیلا جارہا ہے، امت مسلمہ کی کتنی ایسی دوشیزائیں ہیں جہیز کے اس ناسور کی وجہ سے جن کا کنوارہ پن اور بانکپن ختم ہوگیا، ان کے ہاتھ تو پیلے نہیں ہوسکے لیکن سر کے بالوں میں سفیدی چمکنے لگی، کتنی ایسی سہاگن ہیں جہیز کے حریص اورلالچی افراد نے ان سے ان کا سہاگ چھن لیا، ملت کی کتنی مائیں ہیں جو سامان جہیز نہ ہونے پر راتوں کوتکیوں میں منہ چھپا کر رتی ہیں کتنے ایسے باپ ہیں جواپنی جوان لڑکیوں کی شادی کی فکر میں اپنی نیند بے چین و بے قرار کروٹوں کی نذر کردیتے ہیں۔

غور کیجئے! جہیز، لین دین، اورگھوڑے جوڑے کی رقم جیسے بے جااور بے رحم رسومات نے کتنی دوشیزاؤں کی تمناؤں کا خون کردیا، کتنے والدین کی آرزوؤں اورامیدوں کا گلا گھونٹ دیا، ہزاروں

نوجوان بن بیاہی لڑکیاں آج بھی گھروں میں بیٹھی اپنے مقدر کے جوڑے کو تک رہی اور ترس رہی ہیں، نئی نویلی دلہنوں کو زندہ جلانے کے دسیوں واقعات روزانہ پیش آتے ہیں، کیا فرق رہ گیا زمانہ جاہلیت کی دختر کشی اور آج کے جدید دور جاہلیت کی ''دختر کشی'' میں؟؟ صرف اتنا ہی تو ہے کہ اس وقت لڑکیاں زندہ درگور کی جاتی تھیں، آج زندہ جلائی جاتی ہیں!

ضرورت ہے کہ ملت کے بااثر، باحمیت اور دردمند و خیر خواہ اصحاب واحباب آگے آئیں اور جہیز کی لعنت کو جڑ پیڑ سے ختم کرنے اور نکاح کو آسان بنانے کے لیے فیصلہ کن اقدام کریں، اس کے لیے حسب ذیل تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں:

۱) نکاح میں کھانے کے رواج کو ختم کیا جائے۔

۲) مساجد میں نکاح کی تقاریب منعقد کی جائیں۔

۳) مساجد ہی سے رخصتی عمل میں لائی جائے۔

۴) جہیز کا مطالبہ کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کی جائے۔

۵) شادی سے پہلے اور بعد کی تمام رسموں سے اجتناب کیا جائے۔

۶) ولیمہ بھی بالکل سادہ ہو کہ ایک ڈش رکھی جائے۔

۷) شادی کے رقعے ایک دم بھڑکیلے اور دیدہ زیب نہ رکھے جائیں۔

۸) اسکولس، کالجس اور مساجد میں جمعہ کے اجتماعات کے موقع سے نوجوانوں سے جہیز نہ لینے کا عہد لیا جائے۔

............روزنامہ منصف: ۲۴؍اگست ۲۰۰۷ء............

خاندان کی اجتماعیت

باہمی حقوق کی ادائیگی میں سہولت کا ذریعہ

نیکی اور بھلائی کے بہت سے کام دنیا میں کیے جاتے ہیں، یہ کام کچھ لوگ انفرادی طور پر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اجتماعی شکل میں، خیر وبھلائی کا ہر کام چاہے وہ انفرادی ہو کہ اجتماعی، بہرحال اجروثواب کا باعث ہے، لیکن اثرات وثمرات اور نتائج کے اعتبار سے اجتماعی کام زیادہ دیرپا اور مستحکم ہوتا ہے، اس لیے کہ اجتماعیت میں قوت اور برکت ہے، اس میں کسی ایک فرد کا معاملہ نہیں کہ چند سال تک کام کرے پھر حالات ومسائل کی وجہ سے وہ حوصلہ وہمت ہار جائے اور کام ختم اور ٹھپ ہو جائے، اجتماعی کام میں فرد کے مسائل اور حالات اس کے کام پر اثر انداز نہیں ہوتے، بلکہ دوسرے شرکاء کا جذبہ اور حوصلہ اجتماعی مقصد اور مشن کو جاری اور باقی رکھتا ہے، اس لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: **يَدُاللهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ** اجتماعی کام میں اللہ کی مدد ونصرت ہے۔

اجتماعی کام یوں تو معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ بھی کیے جاتے ہیں، لیکن جب خاندان اور افرادِ خاندان میں کسی کام کی اجتماعی شکل ہو تو اس کے دوہرے فائدے ہیں، ایک تو خود اجتماعی کام کی برکت، دوسرے اس اجتماعیت کی وجہ سے افرادِ خاندان میں رابطہ رہتا ہے، اہلِ خاندان ایک دوسرے کے حقوق وذمہ داریوں سے واقف ہوتے ہیں، رابطہ کی وجہ سے ایک دوسرے کے مسائل ومشکلات سے باخبر ہو کر ان سے ہمدردی، غمخواری اور غمگساری کا موقع ملتا ہے، خاندان اور رشتہ داروں کی عظمت خود قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: **وَاتَّقُوا اللهَ الَّذِىْ تَسَاءَ لُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ** (سورۃ النساء:۱)۔ اُس اللہ سے ڈرو جس کا نام لے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ داری کا حوالہ دے کر حقوق مانگتے ہو۔

قرابت داروں اور رشتہ داروں کے کیا حقوق ہیں اور قرابت داری کے تعلقات کو کیسے نبھانا چاہیے؟ اس کا نمونہ واسوہ نبی آخر الزماں ﷺ کی مبارک زندگی میں ملتا ہے، آنحضرت ﷺ کے چچا

ابوطالب کثیر العیال تھے، آمدنی کم تھی، تنگی سے گذارہ ہوتا تھا، ایک مرتبہ اپنے دوسرے چچا حضرت عباسؓ سے ابوطالب کی معاشی پریشانی کا ذکر فرمایا اور کہا کہ کیوں نہ ہم چچا ابوطالب کے دو فرزندوں کی کفالت قبول کرلیں، اس سے ان کا کچھ بوجھ ہلکا ہوگا، حضرت عباسؓ نے رسول اللہ ﷺ کے اس مشورہ کو قبول کیا، انھوں نے ابوطالب کے ایک فرزند حضرت جعفرؓ بن ابی طالب کو اپنی کفالت میں لیا اور آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ بن ابی طالب کی پرورش قبول فرمائی، رسول اللہ ﷺ کی پہلی زوجہ مطہرہ اُم المؤمنین حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ ہیں، آپؓ کی وفات کے بعد آنحضرت ﷺ حضرت خدیجہ کے رشتہ داروں کا پورا خیال فرماتے تھے، ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہؓ فرماتی ہیں مجھے اپنی سوکنوں پر اتنا رشک نہیں ہوتا جتنا کہ حضرت خدیجۃ الکبریٰ پر، اس لیے کہ گھر میں جب بھی کوئی اچھی چیز بنتی یا کوئی تحفہ وہدیہ آتا تو آپ ﷺ ضرور اُس میں سے حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی سہلیوں کے یہاں بھجواتے۔

ایک غزوہ کے موقع پر قیدیوں کے ساتھ آنحضرت ﷺ کی رضاعی بہن ''شیما'' بھی تھیں، آپ ﷺ نے ان کے اعزاز واکرام میں اپنی چادرِ مبارک بچھا کر انہیں بٹھایا، پھر روانگی کے وقت بہت سارا مال واسباب دے کر انہیں رخصت فرمایا، اسی قرابت داری کے طفیل تمام قیدی آزاد کردیے گئے، ایک طرف خود آنحضرت ﷺ نے رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور قرابت داری کے تعلقات کو پورا کرنے کا عملی نمونہ پیش کیا، وہیں زبانِ رسالت سے اس کی تعلیم وتاکید بھی فرمائی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اپنے رزق میں فراخی وکشادگی اور عمر میں زیادتی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ وہ قرابت داروں کے ساتھ صلہ رحمی کرے۔

رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اور ان کے حقوق کی ادائیگی کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اپنی کمائی اور آمدنی میں سے کچھ ان کی مالی مدد کرے، دوسرے یہ کہ اپنے وقت اور زندگی کا کچھ حصہ ان کی خدمت میں لگائے، پھر یہ کہ صلہ رحمی اور حسنِ سلوک کوئی "تبادلہ" کی چیز نہیں ہے، یہ ایسا عمل نہیں ہے کہ اس میں "جیسے کو تیسا" رویہ اختیار کیا جائے، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ بدلہ کے طور پر حسنِ سلوک کرنے سے صلہ رحمی کا حق ادا نہیں ہوتا، صلہ رحمی کرنے والا وہ ہے کہ اگر کوئی رشتہ دار اُس کی حق تلفی

کرے تب بھی وہ اُس کے ساتھ حسنِ سلوک کرے، یہ بھی حقیقت ہے کہ تمام افرادِ خاندان کی معاشی حالت ایک جیسی نہیں ہوتی، اپنی اپنی قسمت اور تقدیر کے لحاظ سے ہر ایک کے معاش وروزگار کے پیمانے الگ ہوتے ہیں، باری تعالیٰ کا فرمان ہے :**نَحۡنُ قَسَمۡنَا بَيۡنَهُمۡ مَّعِيۡشَتَهُمۡ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا** (سورۃ الزخرف:۴۳:۳۲) اس لیے ہر خاندان میں غریب بھی ہوتے ہیں، بیوہ اور یتیم بھی، خاندان کے اہلِ ثروت حضرات کی ذمہ داری ہے کہ وہ خاندان کے غریب اور کمزور افراد کی مدد کریں، ان کی دیکھ بھال اور خبر گیری کریں، ان کے زخموں پر مرہم رکھیں، ان کے لیے آسرا اور سہارا بنیں۔

یتیمی کے داغ کو دریتیم ﷺ سے بڑھ کر کون جانتا ہے؟ آپ ﷺ نے درمیانی انگلی اور شہادت کی انگلی کو ملا کر ارشاد فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں اس طرح ہوں گے :**اَنَا وَ كَافِلُ الۡيَتِيۡمِ كَهَاتَيۡنِ**۔آپ ﷺ نے فرمایا جس نے یتیم کے سر پر شفقت ومحبت کے ساتھ اس کی مدد وکفالت کے لیے اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے خاطر ہاتھ پھیرے تو سر کے تمام بالوں کے بدلے اس کے لیے نیکیاں ہیں، غزوۂ احد میں رسول اللہ ﷺ کے چچا حضرت امیر حمزہؓ کی المناک شہادت ہوئی، مدینہ واپسی ہونے پر آپؓ کی چھوٹی بیٹی استقبال کے لیے موجود تھیں، آپ ﷺ کو دیکھ کر معصومیت سے پوچھنے لگیں کہ ابا جان کہاں ہے؟ آنحضرت ﷺ کا دل پسیج گیا فوراً انہیں گود میں لے کر فرمایا بیٹی! آج سے میں تیرا باپ ہوں، اسی طرح عید کے دن ایک یتیم بچے کو جو کھیل کود میں مشغول اپنے ہم عمر لڑکوں سے الگ تھلگ ہوکر مجسم غم وحسرت بنا کھڑا تھا، آپ ﷺ اس کے قریب تشریف لے گئے، رنج وغم کی داستان سن کر فرمایا بیٹا! کیا تمہیں پسند نہیں کہ محمد تمہارے باپ ہوں، عائشہ تمہاری ماں ہو، فاطمہ حسن وحسین تمہارے بھائی بہن ہوں؟ یہ سن کر یتیم بچہ مارے خوشی کے اچھل پڑا، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ اس لڑکے کو گھر لے گئے، حضرت عائشہؓ نے نہلا دھلا کر کپڑے پہنائے، پھر یتیم لڑکے نے اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ عید منائی۔

قرآن مجید میں کمزور لوگوں کے ساتھ نرمی ورحم دلی کرنے کو خاص انداز میں بیان کیا گیا کہ جو لوگ تنگدست اور کمزور کو جھڑکتے اور دھتکارتے ہیں، انہیں ڈرنا چاہیئے ہیں اس بات سے کہ وہ بھی آج نہیں تو کل اپنے پیچھے اپنی کمزور نسل کو چھوڑ کر جانے والے ہیں، اس نسل کے بارے میں وہ اندیشے رکھتے ہیں کہ

میری اولاد میرے بعد کسی کے دست نگر اور محتاج نہ بن جائے: **وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافاً خَافُوْا عَلَيْهِمْ** (سورۃ النساء:۹)۔

اسی طرح خاندان کی بیوہ عورتوں کی کفالت و سرپرستی خاندان کے مالداروں کی ذمہ داری ہے، بیوہ کا غم کیا اور کیسا ہوتا ہے؟ یہ سرکارِ دو عالم ﷺ نے ہمیں سمجھایا اور بتایا ہے، ام المؤمنین حضرت ام سلمہؓ سے آپ ﷺ کے نکاح کی وجہ یہ تھی کہ ان کے بچوں کی خبر گیری اور کفالت ہو سکے، حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کسی بیوہ یا مسکین حاجت مند کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا بندہ (اللہ کے نزدیک اجر وثواب میں) راہِ خدا میں جہاد کرنے والے کی طرح ہے، حضرت ابو ہریرہؓ اپنے گمان کے مطابق کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ایسا شخص رات رات بھر عبادت کرنے والے اور ہمیشہ روزہ رکھنے والے کی طرح ہے، ایک جگہ رسول اللہ ﷺ کا عام ارشاد ہے کہ جو کوئی اپنے بھائی کی مدد و نصرت میں لگا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی برابر اس کی مدد و اعانت فرماتے رہتے ہیں: **وَاللهُ فِيْ عَوْنِ الْعَبْدِ مَا كَانَ الْعَبْدُ فِيْ عَوْنِ اَخِيْهِ**۔ پھر یہ بھی نہ ہو کہ کمزور ولا چار لوگوں کی مدد کرنے کو اپنے لیے بوجھ خیال کیا جائے یا ان پر احسان جتایا جائے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ ان پر خرچ کرنے کی برکت سے ہمیں رزق دیا جاتا اور ہمارے مال میں ترقی ہوتی ہے، نبی ﷺ کا فرمان ہے: **اِنَّكُمْ تُنْصَرُوْنَ وَتُرْزَقُوْنَ بِضُعَفَائِكُمْ** تمہارے کمزوروں کی بدولت تمہیں رزق دیا جاتا ہے اور تمہاری مدد کی جاتی ہے، غرض یہ کہ خاندان کا فرد ہونے کے ناطے ہماری دوہری ذمہ داری ہے، ایک یہ کہ مسلمان ہونے کی حیثیت سے کمزوروں کی مدد کریں، دوسرے یہ کہ رشتہ داری کا حق پورا کریں، اجر وثواب بھی دوہرا، ایک مسلمان کی مدد کرنے کا دوسرا صلہ رحمی کا۔

یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ خاندان کے ضرورت مندوں اور حاجت مندوں کو بھی اپنی معاشی حالت پر صبر کرتے ہوئے قناعت پسندی اور کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے، یہ بات اچھی نہیں لگتی کہ ہر چھوٹی پریشانی اور معمولی مصیبت میں بھی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا جائے، اس میں آدمی کی غیرت اور خودداری کا امتحان ہوتا ہے اور اس کا وقار متأثر ہوتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مسکین وہ نہیں جو ایک کھجور دو کھجور، ایک لقمہ دو لقمہ کے واسطے مارا مارا پھرے، حقیقی ضرورت مند وہ ہے جو فقر و فاقہ

اور تنگی کے باوجود لوگوں سے سوال نہ کرے، آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ (دینے والا) نیچے والے (لینے والے) ہاتھ سے بہتر ہے۔ **اَلْیَدُ الْعُلْیٰ خَیْرٌ مِّنَ الْیَدِ السُّفْلٰی۔**

غرض یہ کہ خاندان کی اجتماعیت سے رشتہ داروں اور قرابت داروں کے حقوق ادا کرنے میں سہولت ہوتی ہے، اس لیے جن خاندانوں اور گھرانوں میں خاندانی اور خوانگی مسائل کو حل کرنے کا اجتماعی نظام ہے اس میں شریک ہونا اور اس کو مستحکم کرنا ہر فرد کی ذمہ داری ہے اس لئے کہ یہی عبادت ہے اور یہی انسانیت بھی، بقول شاعر ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کر و بیاں

عالمِ ربانی جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی کی

علمی مجالس میں نیازمندانہ حاضری

عالم اسلام کی نامور، قدآور، ممتاز، مایۂ ناز علمی وعبقری شخصیت، عالمِ ربانی، مرشدِ روحانی جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کی ذات وخدمات کسی کے لیے محتاجِ تعارف نہیں ہے، گذشتہ دنوں چنائی اور بنگلور میں آپ کی تشریف آوری ہوئی، اس موقع پر آپ اپنی جائے پیدائش اور تعلیم وتربیت کے آبائی مقام عالمِ اسلام کی مشہور ومعروف دینی درسگاہ ازہر ہند دارالعلوم دیوبند بھی تشریف لے گئے، ۱۵/دن کے طویل دورے میں آپ کے بصیرت افروز خطابات سے بھرپور استفادہ کے لیے آپ کے معزز میزبانوں نے اجتماعات رکھے، اس موقع پر آپ کو دیکھنے اور سننے کے لیے ملک کی مختلف ریاستوں سے علماءِ کرام پروانوں کی طرح ٹوٹ پڑے اور اُمڈ پڑے۔

ان ہی اجتماعات کا ایک سلسلہ شہر گلستانِ بنگلور میں بھی رہا، مورخہ ۱۷/۱۸/ جولائی ۲۰۱۰ء کو یہاں منعقدہ اجتماعات میں شرکت واستفادہ کے لیے راقم سطور نے نیازمندانہ اور طالبِ علمانہ حاضری دی، ان اجتماعات میں حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی مدظلہٗ العالی نے جو پیغام دیا اور جو بھولا ہوا سبق یاد دلایا وہی سبق میں اپنے ان دینی بھائیوں کے سامنے دہرانا چاہتا ہوں جو اپنی مجبوریوں اور ناگہانی مصروفیتوں کی بنا ان اجتماعات میں شریک نہ ہوسکے، سبق سنانے اور دہرانے سے پہلے کچھ ضروری وضاحتیں پیش خدمت ہیں:

۱) بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِهٖ بَصِیْرَةٌ (انسان خود اپنے نفس کا نگران ونگہبان ہے) کے تحت مجھ جیسے گنہگار اور ریاکار کو اپنے نفس کی پاکدامنی، اور اپنے جذبات وخیالات کی پاکیزگی کے متعلق کوئی خوش فہمی نہیں ہے، دلوں اور نیتوں کا حال صرف اور صرف اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے، ولا ازکی علی اللّٰہ احداً، اس لیے نیت کی تصحیح وتجدید ضروری ہے، اس تحریر کو پیش کرنے کا مقصد رسول

اللہ ﷺ کے ارشاد گرامی: بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَةً کی تعمیل ہے کہ اگر دین کی ایک بات بھی معلوم ہوتو اس کو دوسروں تک پہونچانا ہے، اس ارشاد میں صحابہ کرامؓ کی وہ مقدس جماعت داخل ہے جنھوں نے براہِ راست رسول اللہ ﷺ سے دین کی بات سنی اور سیکھی ہے اور بالواسطہ وہ لوگ بھی اس میں شامل ہیں جو وارثین انبیاء علماءِ کرام سے دین کی بات سنی اور سیکھی اور یہ بھی کہ اَلدِّیْنُ اَلنَّصِیْحَةُ دین سراسر خیر خواہی کا نام ہے۔

۲) بڑوں کی بات کو سننے اور اس کو سمونے کے لیے بھی ظرف اور پیمانہ بھی بڑا ہونا چاہیے، علم وعرفان کے دریا پر اگر کوئی جائے اور شومیِ قسمتی سے اس کے پاس بڑا پیالہ نہیں ہے صرف ایک چھوٹا سا کشکول ہے، تو وہ اتنا ہی حاصل کرنے پر مجبور ہے جتنا اس کے کشکول میں آسکتا ہے، اس لیے معزز قارئین اس کو ضرور پیشِ نظر رکھیں کہ اگر حضرت مولانا کے بصیرت افروز خطابات میں سے کوئی بات آنے سے رہ گئی تو وہ یقین کریں کہ اس میں حضرت مولانا کے دریائے علم وعرفان کا قصور نہیں بلکہ قصور اس کم ظرف اور کم سواد (راقم سطور) کے تنگ کشکول کا ہے ؎

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا
ورنہ گلشن میں علاجِ تنگیِ داماں بھی ہے

۳) اس تحریر کی بنیاد نوٹس پر ہے، حضرت مولانا کے بصیرت افروز خطابات کے نوٹس لینے میں الفاظ وجملوں کی ترتیب میں اونچ نیچ (ہیر پھیر نہیں) یقینی ہے، اس لیے کوشش تو رہی کہ ہوبہو حضرت مولانا کی تقریر قلم بند ہوجائے، لیکن زیادہ تر مفہوم وخلاصہ سے کام لیا گیا، پس اس تحریر میں اگر کوئی غیر غلط بات آجائے تو وہ سراسر اس حقیر کے سر ہے، حضرت مولانا کی ذات اس غلطی سے مکمل بری ہے۔

پہلا خطاب دارالعلوم شاہ ولی اللہ میں علماءِ کرام کے کثیر اجتماع سے ہوا، اس خطاب کا آغاز حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی زید مجدہٗ نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن مجید کی آیت اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمَاءُ سے فرمایا، باضابطہ خطاب شروع کرنے سے پہلے آپ نے چند باتیں ارشاد فرمائیں:

۱) سب سے پہلے آپ نے اللہ تعالیٰ کی توفیق وعنایت کا ذکر فرمایا کہ مسلسل ۱۱؍دنوں سے ہندوستان کے مختلف شہروں میں جانا ہورہا ہے، ان شہروں میں علماءِ کرام اور مسلمان بھائیوں کی زیارت

نصیب ہورہی ہے، ان اجتماعات اور ملاقاتوں میں عام مسلمانوں اور علماءِ کرام کی طرف سے جس خلوص ومحبت کا مظاہرہ اور برتاؤ میں نے دیکھا ہے وہ حد درجہ جذباتی اور متأثر کن ہے، اس کا شکریہ میں ادانہیں کرسکتا، اس کے شکریہ کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، میں نے ان محبت کرنے والوں کوکیا دیا ہے اور کیا دے سکتا ہوں؟ بس بزرگوں سے نسبت کی وجہ سے ان کا یہ اظہارِ محبت ہے، اورسب سے بڑھ کر یہ سب **الحبّ فی اللّٰہ** (اللہ کے واسطے محبت کرنا) کی علامت ونشانی ہے، **الحبّ فی اللّٰہ** کے انوار وبرکات سے اللہ تعالیٰ ہم سب کو مستفید فرمائے۔

۲) دوسری بات آپ نے اپنی آمد پر استقبالیہ کلمات اور منظوم سپاس نامہ پیش کیے جانے کے پس منظر میں یہ فرمائی کہ ذاتی نقطۂ نظر کے خلاف **الحب فی اللّٰہ** کے اظہار میں مبالغہ کیا گیا، ہندوستان اور پاکستان میں لوگ مجھے ''شیخ الاسلام'' لکھنے لگے، میرے نزدیک یہ اس لقب کی توہین ہے، یہ لقب تو حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور حضرت حسین احمد مدنیؒ جیسے اکابر وبزرگوں کے لیے جچتا ہے، اس طرح مجھے بعض مرتبہ ''چیف جسٹس'' کہہ دیا جاتا ہے، حالانکہ یہ میرا عہدہ نہیں ہے، اسی لیے عربی زبان کا مقولہ ہے کہ **حبک الشیی یعمی ویصم** (کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے) بہرحال میرے بارے میں جو کچھ لکھا اور کہا گیا وہ آپ حضرات کا حسنِ ظن ہے، اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

۳) ذاتی تعریف اور مدح سرائی کے تعلق سے آپ نے امام زہریؒ کے قول کا حوالہ دیا جس میں امام زہری فرماتے ہیں کہ جب کوئی اللہ کا بندہ میری تعریف کرتا ہے تو میں فوراً دل میں اپنے آپ سے کہتا ہوں کہ اے اللہ! میں اپنی ذات سے زیادہ واقف ہوں، ان تعریف کرنے والے صاحب کو میرے عیوب کا پتہ نہیں اور آپ میرے بارے میں مجھ سے زیادہ واقف ہیں، پس اے اللہ! مجھے ان تعریف کرنے والے صاحب کے دھوکہ سے بچایئے اور عجب سے حفاظت فرمایئے۔——

آپ نے فرمایا کہ ذاتی تعریف اور مدح سرائی کی وجہ سے آدمی دھوکہ میں پڑ جاتا ہے، حضرت (مولانا اشرف علی) تھانویؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہم لوگ بعض اوقات اشعب طماع بن جاتے ہیں، اشعب طماع انتہائی لالچی اور حریص آدمی تھا، اور یہ شخص حرص ولالچ میں ضرب المثل ہے، خطیب

بغدادیؒ نے اس کے حرص وطمع کے دلچسپ واقعات نقل کیے ہیں، ایک مرتبہ اشعب طماع بازار سے گذر رہا تھا، تھالی (مشقاب) بنانے والے کو دیکھ کر کہا تھالا (مشقاب) بڑے سائز کا بناؤ، تھالی بنانے والے نے کہا میں تھالی چھوٹی یا بڑی بناؤ تمہیں اس سے کیا کام؟ اشعب طماع نے جواب دیا تمہیں نہیں معلوم، ہوسکتا ہے لوگ ان تھالیوں میں میرے لیے ہدایا وتحائف لائیں، اگر تھالی چھوٹی ہوتو ہدایا وتحائف کم ہوجائیں گے، اسی طرح یہ شخص راستہ سے جارہا تھا، دیکھا کہ کچھ لڑکے کھیل میں مصروف ہیں، انہیں ستانے کے لیے اس نے ایسے ہی کہہ دیا کہ اے لڑکو! فلاں جگہ مٹھائی تقسیم ہورہی ہے، یہ سنتے ہی لڑکے اپنا کھیل چھوڑ کر مٹھائی کے لیے دوڑ پڑے، اشعب طماع نے جب دیکھا کہ تمام لڑکے مٹھائی لینے کے لیے چل دیئے تو یہ بھی ان کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا، لوگوں نے اس کو طعنہ دیا کہ تم نے تو صرف ان لڑکوں کو ستانے کے لیے مذاق میں کہہ دیا اور پھر خود ہی ان کے پیچھے بھاگے چلے جارہے ہو، اشعب طماع نے جواب دیا کہ میں نے مذاق ہی کیا تھا لیکن جب اتنی ساری خلقت دوڑ پڑی تو مجھے بھی یقین سا ہونے لگا کہ ہوسکتا ہے کہ حقیقت میں وہاں مٹھائی تقسیم ہورہی ہے، ایسے ہی ہمارا حال ہے، ہم لوگ کچھ دینی کام انجام دیتے ہیں، لوگ اس سے متأثر ہوکر تعریف کرنے لگتے ہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جب اتنے سارے لوگ مجھے اچھا سمجھ رہے ہیں اور کہہ رہے ہیں تو یقینا مجھ میں کچھ نہ کچھ خوبیاں تو ہوں گی، اس طرح لوگوں کی تعریف سے اپنے بارے میں دھوکہ کھا جاتے ہیں، اس لیے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: افشوا المداحین التراب تعریف کرنے والوں کے منہ پر مٹی پھینک دو۔

۴) آپ نے اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا اور کہا کہ ایک بات دیکھ کر میں اتنا خوش ہوا اور میرا دل باغ باغ ہوگیا، وہ یہ کہ الحمد اللہ مسلمانوں کی یہاں جو کیفیت نظر آئی اس سے بڑا اطمینان ہوا، مسلمان یہاں اپنے دین کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور پورے جذبہ کے ساتھ اس پر عمل پیرا ہیں، مسلمانوں کو یہاں دین سے جوڑے رکھنے میں علماء اور اہل مدارس کا یقینا بڑا حصہ ہے، اور ایک بات جس سے مجھے خوشی ہوئی وہ یہ کہ الحمد للہ مجھے ہندوستان کے علماء میں علمی وتحقیقی ذوق پروان چڑھتا نظر آرہا ہے، وہ درس وتدریس تک محدود نہیں ہیں، تصنیف وتالیف کے ذریعہ بھی عالم اسلام کی ضروریات کو پورا کررہے ہیں، علماءِ کرام درحقیقت مسلم معاشرہ میں رہنما کی حیثیت رکھتے ہیں، وہ ایسی

مثال ہیں جنہیں دوسرے لوگ اپنی زندگی میں نمونہ واسوہ بناتے ہیں۔

۵) آپ نے کہا کہ لوگ ہمیں عالم کہہ دیتے ہیں، لیکن ہم سب دین کے طالبِ علم ہیں، اللہ تعالیٰ ہمیں صحیح معنوں میں طالبِ علم رہنے کی توفیق عطا فرمائے، حضرت (مولانا اشرف علی) تھانویؒ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر ساری دنیا کے عقلاء مل کر شریعت کے کسی مسئلہ پر رائے زنی کرے تو دین کا یہ طالبِ علم اس کا جواب دے سکتا ہے اور انہیں مطمئن کرسکتا ہے، ایک بڑے بزرگ کو کسی شخص نے فقیہ کہا، انہوں نے کہا کہ تمہیں معلوم ہے کہ فقیہ کس کو کہتے ہیں؟ پھر خود ہی فرمایا: **انما الفقیہ الزاھد فی الدنیا و الطالب فی الاٰخرۃ** فقیہ تو وہ ہے جس کو دنیا کی لذتوں سے کوئی سروکار نہ ہو اور وہ آخرت کا طلب گار رہو۔

ان چند تمہیدی باتوں کے بعد حضرت مولانا جسٹس تقی عثمانی مدظلۂ العالی نے اصل خطاب شروع فرمایا، آپ نے فرمایا کہ اسلام اور شریعت کے ۵ رشعبے ہیں، عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت۔ عقائد اور عبادات کی طرف تو ہماری توجہ رہتی ہے، لیکن آخری ۳ رشعبوں میں ہماری توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، معاملات میں پھر بھی کچھ نہ کچھ توجہ ہے، لوگ پوچھ لیتے ہیں کہ کونسی چیز جائز ہے اور کونسی چیز جائز نہیں؟ کونسا کاروبار حلال ہے اور کونسا کاروبار حرام ہے؟ لیکن اخلاق اور معاشرت کے سلسلہ میں یہ کہنا صحیح ہے کہ دین کے ان دو شعبوں میں توجہ نہ ہونے کے برابر ہے، اس کے بعد آپ نے نمبر وار اپنے اصل خطاب کا سلسلہ یوں جاری رکھا۔

۱) معاشرت: دین کا اہم اور افضل حصہ ہے، ہماری طرزِ زندگی کیسی ہو؟ اور دوسرے لوگوں کے ساتھ ہمارا سلوک و برتاؤ اور رکھ رکھاؤ کیسا ہو؟ اس بارے اسلامی تعلیمات کی پیروی اور پابندی اچھی معاشرت کہلاتی ہے اور اچھی معاشرت دعوتِ دین کا ذریعہ ہے، معاشرت اگر اچھی نہ ہو تو وہ نہ صرف گناہ ہے بلکہ اسلام سے دور کرنے کا ذریعہ ہے، **المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ** مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان کی ایذاء و تکلیف سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں، یہ حدیث اسلامی معاشرت کا لبِ لباب ہے، اپنی طرف سے دوسروں کو تکلیف اور اذیت نہ ہو، اسلام کی اس تعلیم کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ باجماعت نماز ادا کرنا افضل ترین عمل ہے،

رسول اللہ ﷺ نے صحابۂ کرام ؓ کے سامنے اپنا منشاء یہ ظاہر فرمایا کہ جولوگ مسجد کو آنے کی طاقت وقدرت رکھنے کے باوجود گھروں میں نماز ادا کر لیتے ہیں میرا جی چاہتا ہے کہ لکڑیوں کا گھٹا جمع کروں اوران کے گھروں کوجلا دوں، جماعت کی نماز کی اس اہمیت کے باوجود اگر کسی شخص کے بدن سے بد بو آرہی ہوتو اس کے لیے واجب ہے کہ وہ تنہا نماز پڑھ لے مسجد کی جماعت میں شریک نہ ہو، کیوں کہ جماعت میں شریک ہونے سے دوسروں کواس کی بد بو سے تکلیف ہوگی۔

ایک مرتبہ بچپن میں ہم بیت الخلاء گئے اور بھولے سے گندگی صاف کیے بغیر آ گئے، والدِ ماجد (حضرت مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ) نے فرمایا کہ تم نے صرف غلطی نہیں کی گناہِ کبیرہ کیا ہے، اس لیے اسلام میں طہارت کے تصور کے ساتھ نظافت بھی مطلوب ہے ، طہارت جسمانی گندگیوں کو دورکرنا ہے، اور نظافت ظاہری صفائی وستھرائی کا نام ہے، مغربی اقوام کے یہاں طہارت کا تصور نہیں، البتہ نظافت یعنی ظاہری صفائی وستھرائی کا اہتمام ہے، مغربی ممالک میں عوامی جگہیں صاف ستھری رہتی ہیں، مسلمانوں کے یہاں طہارت کا تصور ہے لیکن نظافت کا اہتمام نہیں، خود مغربی ملکوں کی مساجد میں اگر آپ چلے جائیں تو وہاں نظافت ،صفائی وستھرائی کا مغربی معیار اور تصور آپ کو نظر نہ آئے گا۔

آپ نے نظافت ،صفائی وستھرائی اوردوسروں کی راحت رسانی کے بارے میں اہل مغرب کے حوالہ سے اپنے کچھ تجربات بطور مثال پیش کیے، آپ نے فرمایا کہ ایک مرتبہ جہاز کا سفر کر رہا تھا، جہاز میں عملہ کی طرف سے مسافرین کواس بات کی ہدایت ہوتی ہے کہ وہ جہاز کا حمام استعمال کرتے وقت پانی زیادہ خرچ نہ کریں ، پانی اگر رہ گیا تو اس کو کاغذ سے سوکھا دیں ، میرے ساتھ جو صاحب سفر کر رہے تھے انہوں نے مجھ سے آ کر کہا کہ جہاز کا عملہ مجھے وضو کرنے سے روک دیا ہے، میں نے کہا کہ میں نے تو وضو کیا ہے، مجھے کسی نے نہیں روکا، پھر میں نے عملہ کے آدمی سے پوچھا تو اس نے کہا آپ میرے ساتھ چلیئے ! میں آپ کو بتاتا ہوں، جب میں نے چل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ میرے ہم سفر ساتھی نے اس طرح وضو کیا ہے کہ جگہ جگہ پانی کے چھینٹے رہ گئے ، اس بنا پر انہیں وضو کرنے سے روک دیا گیا ، حالانکہ وضو انہیں تھوڑے پانی سے اس طرح کرنا چاہیے تھا کہ وہ دوسروں کے لیے

تکلیف کا باعث نہ ہو۔

اسی طرح ایک دفعہ مجھے برطانیہ میں ٹرین کے سفر کا اتفاق ہوا، مجھے استنجے کا تقاضہ ہوا، جب میں گیا تو دیکھا کہ بیت الخلاء کے سامنے خاتون کھڑی ہے، میں واپس آ گیا، دوبارہ گیا دیکھا وہی خاتون موجود ہے اور بیت الخلاء کے دروازہ پر یہ عبارت بھی ہے اندر کوئی نہیں ہے، میں نے خاتون سے کہا کہ آپ اندر کیوں نہیں جاتیں؟ اس نے بتایا کہ میں جس وقت فارغ ہو رہی تھی ٹرین پلیٹ فارم پر نہیں تھی، پھر جب فارغ ہو چکی تو اسٹیشن آ گیا، ریلوے کا قانون ہے کہ جب ٹرین پلیٹ فارم پر ہو تو گندگی نہ کی جائے اور نہ بہائی جائے، اس لیے میں نے گندگی نہیں بہائی، اور میں اس لیے یہاں ٹھہری ہوں کہ کوئی دوسرا اندر نہ چلا جائے اور اس کو تکلیف ہو، یہاں اس خاتون نے ریلوے قانون کی پابندی بھی کی اور دوسروں کی راحت رسانی کا خیال بھی رکھا، ریلوے کا یہ قانون ہم لوگوں کے یہاں بھی ہے، لیکن اس قانون کی پیروی کہاں تک ہوتی ہے، اس سے ہم سب واقف ہیں۔

مغربی اقوام کی ان معاشرتی خوبیوں کے پس منظر میں حضرت مولانا نے اپنے والدِ ماجدؒ کے حوالہ سے فرمایا کہ باطل قوم باطل کی وجہ سے ترقی نہیں کرتی بلکہ کچھ حق صفات اختیار کرنے کی وجہ سے انہیں ترقی ملتی ہے، دنیا میں اچھا کام چاہے کافر کرے یا مسلمان یا اچھی صفات کسی کی بھی ہوں اس کا بدلہ دنیا میں ضرور ملتا ہے، آخرت میں بدلہ کا معیار ایمان ہوگا، مولانا نے فرمایا یورپ کے لوگ تجارت میں امانت و دیانت کا اہتمام کرتے ہیں، کسی کونٹر پر کوئی چیز لینے یا جمع کرنے میں اگر دو تین آدمی بھی جمع ہو جائیں تو فوراً لائین بنا لیتے ہیں، کیا ہمارے پاس ایسا ہوتا ہے؟ جب کہ صف بندی کا تذکرہ اور اس کی فضیلت قرآن میں ہے: وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا، اسی طرح مصافحہ کے سلسلہ میں ہمارے یہاں کا مزاج اور رواج ہے اس میں بھی دوسروں کی راحت کا خیال نہیں ہوتا، جب کہ مصافحہ نہ فرض ہے اور نہ واجب، حجر اسود کو بوسہ دینا مستحب ہے لیکن اگر اس سے دھکم پیل ہوتی ہو اور دوسروں کی ایذا رسانی ہو تو پھر بوسہ نہ دینا ہی ضروری ہے، آپ نے فرمایا اسلام کی معاشرتی تعلیمات اور آداب سے آگاہی اور ان کی پیروی کے لیے ضروری ہے کہ حضرت تھانویؒ کی کتاب ''آداب المعاشرت'' نصاب تعلیم میں داخل کی جائے۔

۲) حضرت مولانا مفتی جسٹس تقی عثمانی مدظلۂ العالی نے اپنے اصل خطاب میں دوسری بات یہ فرمائی کہ معاشرہ کی کچھ ضروریات ایسی ہوتی ہیں جن سے معاشرہ کے ہر فرد کا تعلق ہوتا ہے، کچھ زیادتیاں ہوتی ہیں جس سے معاشرہ دوچار رہتا ہے، علماء کی ذمہ داری ہے کہ معاشرہ کی ضروریات کو سامنے رکھ کر عوام کی رہنمائی کریں، معاشرہ کی زیادتیوں کا خاتمہ کریں، ہمارے اکابر و اسلاف نے معاشرہ کی ایک ایک زیادتی کو نگاہ میں رکھا اور اس کو دور کیا، حضرت نانا تویؒ (مولانا قاسم نانا تویؒ بانی دارالعلوم دیوبند) کے زمانہ میں بیوہ عورتوں سے نکاح معیوب سمجھا جاتا تھا، آپؒ نے نکاحِ بیوگان کی تحریک چلائی، لوگوں کو بیوہ عورتوں سے نکاح کی ترغیب دی، ایک مرتبہ آپ مجلس میں نکاحِ بیوہ گان کے عنوان پر ترغیبی گفتگو فرما رہے تھے، مجلس سے ایک صاحب اٹھے اور کہا کہ آپ کی بیوہ بہن گھر میں بیٹھی ہوئی ہیں، پہلے ان کا نکاح فرمایئے پھر دوسروں کو ترغیب دیجیے، حضرت نانا تویؒ اسی وقت مجلس سے اٹھے، گھر تشریف لے گئے، بہن سے منت سماجت کی کہ میں تم سے ایک بات کہنے جا رہا ہوں اگر تم مان لو تو شریعت کا ایک حکم پورا ہو جائے گا اور معاشرہ میں اس پر عمل شروع ہو جائے گا، بہن سمجھ گئیں اور کہنے لگیں میری عمر اس وقت ستر اسی سال کی ہے، اگر کوئی نکاح کے لیے راضی ہو سکتا ہے تو میں بھی تیار ہوں۔ (حضرت مولانا کو اس واقعہ کے بیان کے وقت نام کی تعیین میں شک ہوا، شہ نشین پر موجود کسی صاحب نے وضاحت کی کہ صاحبِ واقعہ حضرت مولانا سید اسماعیل شہیدؒ ہے۔ بہرحال اس سلسلہ میں تحقیق و تشفی کے خواہش مند "سوانح قاسمی" از مولانا مناظر احسن گیلانی یا "سیرت سید احمد شہیدؒ" از مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ دیکھ سکتے ہیں۔)

اس دوران عورتوں کے حقوق کا تذکرہ آیا، آپ نے فرمایا مغرب، یورپ میں حقوق نسواں کے نام پر عورتوں کو باہر نکالا گیا، اونچے عہدے اور اچھے مناصب تو انہیں کم ملے، گھٹیا اور کم تر کام زیادہ تر ان کے حوالہ کیے گئے، یہ عورتیں سڑکوں پر جھاڑو دینے لگیں، ہوٹلوں میں ویٹرس بنائی گئیں اور استقبالیہ کونٹرس پر مردوں کو رجھانے اور لبھانے کے لیے کھڑی کی گئیں، مغرب کے حوالہ سے حقوقِ نسواں یا آزادیٔ نسواں کی بات جب چھڑتی ہے تو ایک مثال اکثر میں دیا کرتا ہوں کہ ایک عورت گھر میں خود اپنے اہل خانہ کے لیے پکوان کرتی ہے تو وہ آپ کے نزدیک عیب ہے، اچھی

علامت نہیں ہے، لیکن یہی عورت جہاز میں ایر ہوسٹس بن کر اجنبی مسافرین کے لیے کھانا فراہم کرتی ہے تو یہ تمہارے نزدیک عین خوبی اور کمال ہے، آپ نے مسلم معاشرہ میں عورتوں کی حق تلفی کے سلسلہ میں کہا کہ ایک مرتبہ یورپ میں عورتوں کے حقوق کے استحصال پر تقریر کر رہا تھا، تقریر کے کچھ دنوں بعد ایک مسلمان خاتون کا خط مجھے ملا، خط کے شروع میں تقریر کی بہت تعریف کی کہ آپ نے بہت اچھی طرح بات سمجھائی ہے، لیکن مسلمان عورتوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حقوق دیئے گئے اور مسلم معاشرہ میں ان حقوق کو پورا نہیں کیا جاتا، مسلمان عورتوں کی حق تلفی ہوتی ہے، کیا آپ نے کبھی اس پر تقریر فرمائی اور اس کی طرف توجہ دلائی؟ یقین جانئے کہ اس خط کے پڑھنے پر مجھے بڑی شرمندگی ہوئی، پھر مجھے جہاں بھی موقع ملا مسلم معاشرہ میں عورتوں کی حق تلفی کی طرف توجہ دلائی، مثلاً عورتوں کو میراث کا حق نہیں دیا جاتا، یہاں کا حال مجھے نہیں معلوم لیکن پاکستان بالخصوص پنجاب اور اس کے اطراف علاقوں میں عورتیں بہت زیادہ میراث کے حق سے محروم کردی جاتی ہیں، اسی طرح عورت کے نکاح کا مسئلہ ہے، اس کی مرضی کو جانے اور سمجھے بغیر زبردستی ہونے والے شوہر کے گلے باندھی جاتی ہے، جب کہ شریعت کا واضح حکم ہے: **البکر تستامر فی نفسها** دوشیزہ عورت سے اس کی ذات کے بارے میں مشورہ کیا جائے گا، پس نکاح کے موقع سے خود عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے ــــــ آخر میں آپ نے فرمایا کہ علماء امت کے حکیم ہیں، ان کا ہاتھ امت کے نبض پر ہونا چاہیے۔

۳) حضرت مولانا مفتی جسٹس تقی عثمانی مدظلۂ العالی نے اپنے اصل خطاب میں تیسری بات اخلاق کے بارے میں فرمائی، آپ نے کہا کہ اخلاق کا لفظ ارسطو اور افلاطون کے زمانہ سے چلا آرہا ہے، اخلاق ظاہرداری کا نام نہیں ہے کہ کسی سے میٹھی اور نرم گفتگو کرلی، کسی سے مسکرا کر مل لیے اور بس، اخلاق دلوں کی صفائی، پاکیزگی، باہمی خلوص ومحبت اور بھائی چارگی کو کہتے ہیں۔ "ڈینٹل کارنکس" نے اخلاق کے موضوع پر کتاب لکھی کہ "کس طرح لوگوں کو گرویدہ بنایا جائے؟" اس میں بتایا گیا کہ کس طرح لوگوں کی توجہ حاصل کی جائے، لوگوں میں نام اور مقام بنایا جائے، اس کو خوبصورت لفظوں میں "پبلک ریلشن" کہتے ہیں، اس لحاظ سے اگر اخلاق کو دیکھا جائے تو یہ اخلاق حبِ جاہ کے حصول کا راستہ اور طریقہ ہے، جب کہ اخلاقِ نبوی حبِ جاہ کی جڑ کاٹتی ہے، اسلام میں "حبِ جاہ" کی مذمت

اور شاعت یہاں تک آئی ہے کہ اگر دو بھوکے بھیڑئے بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیے جائیں تو اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا کہ ”حبِ جاہ“ کا مرض آدمی کے دین وایمان کو نقصان پہونچاتا ہے، تصوف دراصل اسلامی اخلاق کا نام ہے، چند اوراد ووظائف، مراقبات، کشوف والہام کا نام لوگوں نے تصوف رکھ دیا، تصوف اخلاق کا نام ہے جس میں دلوں سے حسد، کینہ، بغض وعداوت، نفرت وحقارت، غرور تکبر، خودرائی وخود پسندی، حبِ جاہ اور حبِ مال جیسی بیماریوں اور برائیوں کو ختم کیا جاتا ہے، جب تک تکبر اور عجب نہ مٹے بات میں تاثیر پیدا نہیں ہوتی، آخر میں حضرت مولانا نے فرمایا اکابر کی سیرتیں، ان کے حالات اور ان کے ملفوظات کو حرزِ جان بنائیں، اکابر کے سوانحی کتب، تذکرۃ الرشید، تذکرۃ الخلیل، اشرف السوانح کا مطالعہ کریں، ماضی قریب میں حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا کاندھلویؒ کی سوانح زندگی ”آپ بیتی“ منظر عام پر آئی اس کا بھی مطالعہ کریں، اللہ تعالیٰ ہمیں طالبِ علم بننے اور اس کے حقوق ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے ـــــــ دعا اور اجازت حدیث پر حضرت مولانا کا بصیرت افروز خطاب ختم ہوا۔

اصلاحِ نفس کے لئے
صحبت صالحین کی اہمیت وضرورت

حضرت مولانا مفتی جسٹس محمد تقی عثمانی مدظلۂ العالی کا دوسرا خطاب جامعہ مسیح العلوم بنگلور میں ہوا، خطاب کے آغاز کے لیے حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن مجید کی آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ (اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ) تلاوت فرمائی، استقبالیہ کلمات پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ''من آنم کہ من دانم'' یہ ادارہ جس کی نسبت حضرت مسیح الامت (حضرت مولانا مسیح اللہ خانؒ جلال آبادیوپی) کی طرف ہے اور جیسا کہ بتایا گیا کہ اس مدرسہ کا آغاز حضرت مسیح الامت کی رہنمائی اور نگرانی میں ہوا، حضرت مسیح الامت میرے شیخ تھے، اس لحاظ سے یہاں میری حاضی میرے لیے مسرت اور سعادت کی بات ہے، یہ بھی بتایا گیا کہ یہ اجتماع علماء، عوام اور دانشور حضرات کا ہے، اس لیے ایک ایسی بات کا تذکرہ کریں جو ہم سب کی مشترک ضرورت ہے، اس کے بعد حضرت مولانا نے خطبہ مسنونہ کے بعد تلاوت کردہ آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَ کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کی تشریح وتفسیر سے متعلق تفصیلی خطاب شروع فرمایا:

آپ نے فرمایا کہ: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا...... بڑی پیار بھری تعبیر اور بڑا پیار بھرا انداز ہے، اس لیے کہ بعض مرتبہ نام لے کر بلایا جاتا ہے اور بعض دفعہ رشتہ کا حوالہ دے کر پکارا جاتا ہے، بلانے اور پکارنے کے وقت رشتہ کا حوالہ دینے میں بڑی لذت ہے، یہ لذت نام لے کر بلانے میں نہیں ہے، جیسے باپ بیٹے کو نام لے کر بلاتا ہے تو اُس کو اتنی لذت نہیں ہوتی جتنی بیٹا کہہ کر بلانے میں ہوتی ہے، حضرت علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اکثر میری دادی کے یہاں آتے جاتے تھے، میری دادی ان کی ممانی ہوتی ہیں اور میری دادای حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے بیعت تھیں، حضرت علامہ عثمانی فرماتے تھے کہ میں ان کے یہاں اس لیے بار بار آتا ہوں کہ ان کے بیٹا کہنے کی وجہ سے مجھے عجیب طرح کی لذت ومسرت

ہوتی اور مجھے احساس ہوتا ہے کہ (میرے والدین کے بعد) دنیا میں کوئی تو ہے جو مجھے بیٹا کہہ کر بلاتی ہیں ـــــ ایسے ہی اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان سب سے محبوب رشتہ ایمان کا رشتہ ہے، اسی رشتہ کا حوالہ دے کر اللہ تعالیٰ بڑی محبت اور پیار بھرے انداز میں اہلِ ایمان کو حکم دیتے ہیں کہ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ۔

آپ نے فرمایا: عربی زبان کا ترجمہ جب اردو زبان میں کیا جائے تو اردو زبان کا دامن تنگ ہو جاتا ہے، مثلاً یہی "تقویٰ" کا لفظ ہے، اس کا ترجمہ اردو زبان میں "ڈرنا" کیا جاتا ہے، اردو میں ڈرنا ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے، جب کہ عربی زبان میں "ڈرنے" کا مفہوم ادا کرنے کے لیے کئی الفاظ ہیں، مثلاً تقویٰ، خوف، خشیت، جس ڈرنے میں رعب وجلال اور عظمت واحترام کا پہلو ہو تو اُس کو "تقویٰ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے شاگرد استاذ سے ڈرتا ہے یا بیٹا باپ سے ڈرتا ہے، میں نے اپنی ساری زندگی میں والدِ ماجد کا صرف ایک ہی طمانچہ کھایا تھا، اس کے علاوہ پوری زندگی میں انہوں نے کبھی نہیں مارا، لیکن اس کے باوجود جب بھی میں والدِ ماجد کے سامنے سے گذرتا تو مجھ پر ہیبت طاری ہوتی کہ مجھ سے کوئی ایسا کام نہ ہو جائے جو والدِ ماجد کو گراں گذرے، اور ایک ڈرنا وہ ہے جو سانپ بچھو سے ڈرا جاتا ہے، اس کے لیے عربی زبان میں "خوف" کا لفظ استعمال ہوتا ہے، بہر حال تقویٰ کا حاصل یہ ہے کہ دل میں خلش پیدا ہو جائے کہ میرا کوئی کام اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف تو نہیں ہو رہا ہے۔

حضرت مولانا نے فرمایا کہ دنیا میں جرائم کی کثرت اس وقت موضوعِ بحث بنی ہوئی ہے، غربت اور جہالت جرم کے اسباب بیان کیے جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جرائم کی کثرت کے واقعات صرف غربت و جہالت زدہ ممالک اور شہروں میں پیش نہیں آ رہے ہیں اور نہ صرف غریب اور جاہل افراد ہی چوری، ڈکیتی اور قتل وغارت گری میں ملوث ہیں، انتہائی مہذب، ترقی یافتہ اور تعلیم یافتہ سمجھے جانے والے مغربی ممالک کے شہروں میں بھی جرائم کی بھرمار ہے، امریکہ کے شہر نیویارک کی مثال ہمارے سامنے ہے، تھوڑی دیر کے لیے بھی اگر بجلی چلی جائے اور اندھیرا چھا جائے تو لوٹ مار شروع ہو جاتی ہے، حالانکہ اس شہر میں نہ دولت کی کمی ہے اور نہ تعلیم کی، غربت وجہالت سے ہٹ کر اگر آپ دیکھیں تو کرپشن (رشوت خوری) جرائم کے پیش آنے کا ایک اہم اور بنیادی ذریعہ ہے، اس میں

ہمارے سماج کے نامی گرامی سفید پوش لوگ مبتلا ہوتے ہیں، جرائم کی روک تھام اور ان کے تدارک کے لیے چاہے کتنی ہی تدبیریں کرلی جائیں لیکن جب تک دلوں کی دنیا نہ بدلے، لوگوں میں اللہ تعالیٰ کا خوف اور تقویٰ نہ آئے یہ تدبیریں ناکام ہی رہیں گی، اس لیے جرائم پر قابو پانے والی چیز صرف تقویٰ ہے، یہ چیز جنگل کی تنہائی میں اور رات کی تاریکی میں انسان کے عمل پر پہرہ بٹھاتی ہے۔

آپ نے فرمایا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی بندوں پر شفقت کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ آیت کے پہلے ٹکڑے میں تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا گیا اور دوسرے ٹکڑے میں تقویٰ کے حصول کا طریقہ بتایا گیا، حکم دیا گیا کہ تقویٰ اختیار کرو، لیکن تقویٰ کیسے حاصل ہوتا ہے؟ اُس کو پانے کا طریقہ کیا ہے؟ اس کے لیے حکم دیا کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ سچوں کے ساتھ ہوجاؤ، سچوں کی صحبت اختیار کرو، پھر سچے ''صادقین'' کون ہیں؟ صادقین وہی ہیں جو متقین (اللہ سے ڈرنے والے) ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: اُولٰئِکَ ھُمُ الصَّادِقُوْنَ وَاُولٰئِکَ ھُمُ الْمُتَّقُوْن، متقین کی (اللہ والوں کی) صحبت سے تقویٰ کی شمع روشن ہوتی ہے۔ حضرت تھانویؒ کے ''منہ چڑھے'' (انتہائی قریب) خلیفہ وخادم حضرت خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ نے پوچھا کہ اللہ والوں سے استفادہ کیسے کیا جائے؟ حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ ان کی جوتیوں میں جاپڑو۔

تقویٰ کے حکم اور اُس کے طریقۂ حصول کے سلسلہ میں قرآن مجید کی اس تعلیم سے معلوم ہوا کہ ہدایت کے سلسلے دو ہیں، ایک کتاب اللہ، دوسرے رجال اللہ، ہدایت کو پانے اور اُس پر باقی رہنے کے لیے ہدایت کے دونوں سلسلوں کی اہمیت ہے، مثلاً سورۃ الفاتحہ قرآن مجید کی پہلی سورت ہے، یہ سورت سارے قرآن مجید کا خلاصہ اور لبِ لباب ہے، اس سورت میں بندوں کو ''صراط مستقیم'' (سیدھے راستہ) کی پیروی کی دعاء بتائی اور سکھائی گئی، لیکن ''صراطِ مستقیم'' کیا ہے؟ اس کی وضاحت اور صراحت ''صراط الکتاب'' اور ''صراط القرآن'' کے الفاظ وجملوں سے نہیں کی گئی بلکہ یوں فرمایا گیا کہ ''صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ'' ان لوگوں کا راستہ جن پر آپ نے انعام کیا، پس اگر ہدایت پانا اور ہدایت پر چلنا ہے تو اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ کے لوگوں کے ساتھ وابستہ رہو، صراطِ مستقیم کا مثبت طریقہ اَنْعَمْتَ عَلَیْھِمْ ہے اور منفی طریقہ مَغْضُوْبِ عَلَیْھِمْ ہے، ہدایت ورہنمائی کے لیے صراطِ مستقیم

کی پیروی کے سلسلہ میں اس اسلوبِ بیان سے ہدایت کے سلسلہ رجال اللہ کی اہمیت وضرورت واضح ہوتی ہے، اس لیے دین کو سمجھنا ہے اور دین پر عمل کرنا ہے تو رجال اللہ سے اپنے آپ کو وابستہ کرنا ضروری ہے، حَسْبُنَا كِتَابُ اللہ (ہمارے لیے قرآن مجید کافی ہے) کا دعویٰ خود قرآن کو نہ سمجھنے کی دلیل ہے، کیونکہ قرآن مجید میں دوسری جگہ ارشاد ہے: وَاتَّبِعْ سَبِيْلَ مَنْ اَنَابَ اِلَیَّ (اُس شخص کی راہ پر چلو جو میری طرف رجوع کرتا ہے۔

آپ نے مزید فرمایا: ہدایت کو پانے اور اس پر چلنے کے سلسلہ میں رجال اللہ کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ہم تک دین کی صحیح تعبیر وتشریح متوارث طریقہ سے پہونچی ہے، رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابۂ کرام، صحابۂ کرام کے بعد تابعین، پھر تبع تابعین، پھر بزرگانِ دین اور علماءِ امت، اس طرح رجال اللہ کا ایک مستقل تسلسل ہے، آج ہمارے یہاں القاب کے استعمال کا مزاج ہے، کسی کو **علامة الدهر** اور کسی کو **فقيه العصر** کہا جاتا ہے، کوئی کم سے کم درجہ میں مولوی مفتی کہلاتا ہے، آداب والقاب کے بغیر ہماری علمی وعملی صلاحیت وقابلیت کا اظہار نہیں ہوتا اور نہ عام لوگ اس کو قبول کرتے ہیں، لیکن اس طرح کے القاب صحابۂ کرامؓ کے ساتھ بالکل نہیں لگائے جاتے، کیوں؟ حالانکہ علم وعمل ہر اعتبار سے یہ حضرات اپنے بعد والوں سے بڑھ کر ہے، ایسا ہی سوال حضرت عبداللہ بن مبارکؒ سے کیا گیا، آپ نے فرمایا صحابۂ کرامؓ کو "صحابی" کی نسبت کے بعد کسی لقب کی ضرورت نہیں، یہ حضرات جامع الکمالات تھے، بعد کے لوگوں کی نہ یہ خصوصیت تھی اور نہ ہی یہ خصوصیت بعد والوں کے مقدر میں تھی، غرض یہ کہ ماضی کے ملبہ میں معتزلہ، جبریہ وغیرہ جیسے فرقے موجود ہیں جو حَسْبُنَا كِتَابُ اللہ کا دعویٰ کرتے ہیں اور رجال اللہ سے قطع نظر کرتے ہیں، آج کل بھی یہ سوچ وفکر بعض نئے فرقوں کی شکل میں موجود ہے، کتاب اللہ، رجال اللہ، ہدایت کے یہ دونوں سلسلے ساتھ چلنے والے اور ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، اسی کی جامع تعبیر مَا اَنَا عَلَيْهِ وَاَصْحَابِیْ (نجات پانے والا فرقہ وہ ہے جو اُس طریقہ کی پیروی کرے جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں) ہے، اس معاملہ میں افراط وتفریط نقصان دہ ہے، رجال اللہ کی بات کرنے والے صرف رجال اللہ کو اہمیت دیتے ہیں، اس سے قطع نظر کتاب اللہ اور

سنتِ رسول کیا کہتی ہے؟ اُس کو نہیں دیکھتے۔

حضرت مولانا نے اپنے بصیرت افروز اور فکر انگیز خطاب کے آخر میں اصلاحی تعلق قائم کرنے پر زور دیا، آپ نے اکبرالٰہ آبادی مرحوم کے یہ اشعار سنائے ؎

کورس تو لفظ ہی سکھاتے ہیں
آدمی تو آدمی بناتے ہیں
نہ کتابوں سے ، نہ کالجوں سے ، نہ زر سے
علم پیدا ہوتا ہے بزرگوں کی نظر سے

آپ نے فرمایا کہ حضرت نانوتویؒ (حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ بانی دارالعلوم دیوبند) انتہائی قابل ترین ذہین انسان تھے، علم و تحقیق اور فضل وکمال میں بلند مقام رکھتے تھے، آپ کے بارے میں کہنے والے نے کہا: اگر یہ شخص زندہ قوموں میں پیدا ہوتا اُس کے نام پر اکیڈمیاں قائم ہوتی، لیکن اپنی اس اعلیٰ ترین قابلیت اور صلاحیت کے باوجود حضرت نانوتویؒ نے حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ سے اپنا اصلاحی تعلق قائم کیا، اصلاحی تعلق قائم کرنے کے سلسلہ میں صحیح سمت مخلصانہ شوق وجستجو بھی ہونا چاہیے، ورنہ بات پھر وہی ہوگی کہ ؎

خداوندا! یہ تیرے سادہ دل بندے کہاں جائیں
درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

حضرت مولانا نے شیخ کی تلاش میں ایک غلط فہمی دور کرتے ہوئے فرمایا: ہم یہ کہتے اور سمجھتے ہیں کہ صحیح اصلاح وتربیت کرنے والے نہیں ملتے، یہ سوچ ہماری غلط ہے، اس لیے کہ خود عمل کے اعتبار سے اسفل سافلین ہوتے ہیں اور شیخ کی تلاش حضرت جنید بغدادی اور حضرت عبدالقادر جیلانی کے اعتبار سے کرتے ہیں، امامِ رازیؒ نے کُوْنُوْا مَعَ الصَّادِقِیْنَ کی تفسیر میں وضاحت فرمائی کہ صادقین قیامت تک باقی رہیں گے، اسی لیے قرآن مجید میں ان کی صحبت کا حکم دیا گیا، البتہ صادقین کے معیار میں فرق ہوتا رہتا ہے، جیسے خود رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: **خیر القرون قرنی ثم الذین یلونھم ثم الذین یلونھم** بہترین زمانہ میرا زمانہ یعنی صحابہ کرامؓ کا زمانہ، پھر تابعین کا پھر تبع تابعین، آج کا دور

ملاوٹ کا ہے، لیکن کیا ہم گھانس پھونس کھالیا کریں گے؟؟ ہم صحیح اور خالص غذا حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں، اسی لیے شیخِ خالص کی تلاش وجستجو جاری رکھیں، جس سے بھی اپنی اصلاح ممکن ہو اُس سے رجوع ہونے میں شرم وعار محسوس نہ کریں۔ حضرت والدِ ماجد (مولانا مفتی شفیع عثمانیؒ) سے کسی صاحب نے اپنی اصلاح کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا اپنی مسجد کے مؤذن کے پاس جا بیٹھو ـــــــ دعاء پر حضرت مولانا کا بصیرت افروز خطاب ختم ہوا۔

صحافت کا بگاڑ ـــــــ باعثِ ننگ و عار

زبان وقلم خدا تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، یہ اگر نہ ہو تو انسان اپنے جذبات واحساسات کا اظہار واعلان کیوں کر اور کیسے کرسکتا ہے؟ اپنے افکار وخیالات کو بہتر اور مناسب انداز میں پیش کرنا بجائے خود ایک مستقل فن اور ہنر ہے، اپنی تمام صلاحیت وقابلیت اور خوبیوں کے باوجود تقریری وتحریری انداز میں اپنا مقصد و پیغام پیش کرنے کا طریقہ وسلیقہ نہ ہو تو استفادہ کا دائرہ محدود اور مخصوص ہوتا ہے، گویا زبان وقلم انسانی صلاحیت وقابلیت کے ایسے دو بازو اور پَر ہیں جو انسان کو ترقی اور کامیابی کی بلندی کی طرف پرواز کرنے میں معاون اور مددگار ہوتے ہیں، جن لوگوں کو ان خداداد نعمت سے نوازا گیا انہوں نے اپنی ذہانت ومہارت کو بروئے کار لا کر اس میں نکھار پیدا کیا، یہاں تک کہ قلم کار اور مضمون نگار کی حیثیت سے معاشرہ میں ان کی شخصیت کا ڈنکا بجنے لگا اور ان کے الفاظ وبیان کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا، پھر وہ اپنی کایا پلٹ تحریروں کے ذریعہ عوام کے ذہن ودماغ سے ایسے کھیلنے لگے گویا وہ ایک کھلونا ہے، ایک موم ہے جس کو جہاں چاہے اور جیسے چاہے موڑا اور دبایا جاسکتا ہے۔

زبان وقلم کی صلاحیت وقابلیت کی آخری ترقی یافتہ شکل وہ ہے جو ہمارے درمیان صحافت، میڈیا اور ذرائع ابلاغ مختلف ناموں سے مشہور ومعروف ہے، زمانہ شناس اور حالات سے آگاہ شاید ہی کوئی فرد ہو جس کو صحافت اور میڈیا کی اہمیت کا احساس نہ ہو، صحافت کو جمہوریت کے بنیادی ستونوں میں سے ایک ستون قرار دیا گیا اور اس کو اظہارِ رائے کی آزادی کا ایک اہم ذریعہ تسلیم کیا گیا، موجودہ دور میں صحافت ایک علم ہی نہیں بلکہ ایک کامیاب اور بہترین صنعت کا درجہ اختیار کر گئی، یہی وجہ ہے کہ اہم اور مشہور اخبارات کے مالک بڑے بڑے صنعت کار اور سرمایہ دار ہیں، پھر جیسے سماج کے ہر شعبے کے لیے کچھ اخلاقی ضابطے ہوا کرتے ہیں صحافت ومیڈیا کا بھی ایک ''ضابطۂ اخلاق'' ہے، اس ضابطۂ اخلاق کی بھی چند شقیں ملاحظہ ہوں:

۱) کسی بھی معیاری اخبار کی کسوٹی یہ ہے کہ وہ راست گوئی سے کام لے .... ہر اخبار کے لیے سچ کی اشاعت ایک نصب العین ہونی چاہیے۔

۲) بہت ضروری ہے کہ ہر اخباری روداد کسی بھی نوعیت کی رائے یا تعصب سے بالکل پاک ہو۔

۳) کوئی بھی اخبار کسی بھی شخص کے بارے میں ہتک آمیز الفاظ استعمال نہ کرے اور کسی کے ذاتی اخلاق پر حملہ نہ کرے اور کسی پر اعتراض کیا گیا ہے تو متعلقہ شخص کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا پورا موقع دیا جائے۔

۴) جرائم اور سماجی برائیوں کی خبروں کو زیادہ نمایاں کر کے مخربِ اخلاق مصروفیات کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اخبار عوامی فلاح کی سرپرستی کا دعویٰ نہیں کرسکتا، اخبار کا عین مقصد معاشرہ کی خیر خواہی ہو، اس سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جس سے اس مقصد کی نفی ہوتی ہے۔

یہ اور اس طرح کی بہت ساری شقیں ہیں جن میں صحافیوں کے لیے اخلاقی حد بندیاں اور قانونی پابندیاں متعین کی گئیں، ضابطۂ اخلاق کی ان شقوں میں خبروں کی اشاعت کے لیے جس چیز کو بنیاد اور اساس بنایا گیا وہ راست بازی، عدل وانصاف کی پاسداری اور سماج کی خیر خواہی ہے۔(تفصیل کے لیے دیکھئے ''من شاہِ جہانم؟'' مؤلفہ مفتی اعجاز ارشد قاسمی)

لیکن سوال یہ ہے کہ ''ضابطۂ اخلاق'' کی یہ حد بندیاں کیا موجودہ صحافت میں ملحوظ رکھی جاتی ہیں؟؟ موجودہ دور میں صحافت چوں کہ ایک صنعت کا درجہ اختیار کر گئی، اس لیے اس میں صحافت کے اعلیٰ اقدار سے زیادہ اخبار کے مالکان کے سیاسی مصالح، تجارتی مفادات اور مذہبی وشخصی رجحانات کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، گویا صحافتی ضابطۂ اخلاق کی وہی حیثیت ہوئی جو ہمارے ملک میں سیاست دانوں کے لیے الیکشن کے موقع پر ''انتخابی ضابطۂ اخلاق'' کی ہوتی ہے۔

یوں تو موجودہ صحافت اور ذرائع ابلاغ کی بہت ساری برائیاں اور بیماریاں ہیں، مثلاً یہ کہ ''رائی کا پربت بنانا'' اور پہاڑ کو رائی بنا کر پیش کرنا، کسی معمولی اور چھوٹی سی خبر کو شہ سرخی بنانا اور بڑے سے

بڑے واقعہ کوایک دوسطری خبر بنا کر شائع کرنا،غرض یہ کہ اہم کوغیر اہم اور غیر اہم کو اہم بنانا اور بتلانا صحافت کے "بائیں ہاتھ کا کھیل" ہے ،تاہم ان خرابیوں میں سب سے اہم خرابی جس کو آج صحافت ومیڈیا کی خوبی سمجھا گیا ہے وہ بے حیائی اور عریانیت کی اشاعت ہے،ذرائع ابلاغ جن میں پرنٹ میڈیا اور الکٹرانک میڈیا دونوں شامل ہے،ان کے ذریعہ معاشرہ میں آنے والی فحاشی اور عریانیت کے سیلاب نے تہذیب وثقافت کی دھاکو صورتِ حال اور اخلاق وشرافت کا زبردست بھونچال پیدا کردیا ہے،سماج کا عمومی مزاج یہ ہوگیا کہ ایسے اخبارات ورسائل جن میں کسی کے عشق ومحبت کی داستان کا ذکر ہو اور اپنے جنسی جذبات کی "تسکین" اور شہوانی خیالات کی "تشکیل" ہو یہ اخبارات پابندی سے پڑھے اور خریدے جاتے ہیں،ان کی فروخت لاکھوں میں ہیں ،فحاشی اور عریانیت کے اس طوفانِ بلاخیز کا اندازہ حسب ذیل اشتہار سے لگایا جاسکتا ہے:

> "میرا نام رویندر موہن ہے،عمر ۲۵ سال ہے،تعلیم ایم اے اور بیوی کا نام سنیتا ہے،اس کی عمر ۲۰ سال ہے،ہم لوگ نہایت "وسیع النظر" ہیں،ہمیں ننگی فلمیں اور رسائل دیکھنے کا شوق ہے،میاں بیوی ہونے کے ناطے ہم ایک دوسرے کو جنسی اسرار ورموز سے واقف اور لطف اندوز کراسکتے ہیں،اگر آپ اپنی بیوی کا تبادلہ ہماری بیوی سے کرنا چاہتے ہوں تو اس پتہ پر رابطہ کریں"۔(مغربی میڈیا اور اس کے اثرات ،ص:۲۴۰ مصنف مولانا نذر الحفیظ ندوی)

کتاب کے بلند پایہ مصنف مولانا نذر الحفیظ ندوی استاذ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنو اس اشتہار کے حوالے کے بعد لکھتے ہیں:

> "فینسی"(ایک رسالے کا نام ہے)کے صرف ایک شمارے میں ایسے ۵۲/اشتہارات قلمی دوستی کے کالم میں شائع ہوئے ہیں۔"ایڈیٹر وکی بھارگوا" کے مطابق ہر اشتہار کے جواب میں ۱۰/جوابی خطوط ضرور ملتے ہیں"(حوالہ سابق)

بعض مرتبہ شخصی تعلقات کی رپورٹنگ،جنسی روابط کی تجزیہ نگاری اور نجی ازدواجی رشتوں کی خبریں

اخبارات میں اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ صحافت و پریس کے حدود اور دائرۂ کار پر سوالیہ نشان کھڑا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ صحافت ایک ایسا شعبہ ہے جس میں سماج کے مذہبی، سیاسی، فلمی وغیرہ ہر طبقے و حلقے کے بارے میں غلط بیانی سے کام لیا جاتا ہے، اس کو بدنام کیا جاتا ہے، ممکن ہے کہ سیاسی قائدین اور فلمی اداکاروں کا یہ گلہ شکوہ کسی حد تک بے جا اور غیر ضروری ہو، لیکن مذہبی حلقوں خصوصاً مسلمانوں کی میڈیا سے یہ شکایت بالکل بجا اور درست ہے کہ ان کے ساتھ میڈیا کا رویہ اور برتاؤ غیر منصفانہ ہے، اس طرح پر کہ مسلم سماج کے بنیادی مسائل و مشکلات کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے البتہ اگر برائی رونما ہو جائے تو اس کو بہانہ بنا کر پوری اسلامی شریعت کو نشانہ پر رکھ دیا جاتا ہے، اس سلسلہ میں مظفر نگر یوپی کی عمرانہ خاتون اور دہشت گردی کے حالیہ واقعات کی رپورٹنگ اس غیر منصفانہ برتاؤ کی واضح اور روشن مثال ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ محض شکوہ شکایت کیا کسی بھی بنیادی مسئلہ اور اہم معاملے کا حل ہوسکتا ہے؟ کیا آپ اس کی امید اور توقع رکھ سکتے ہیں کہ صحافت آپ کے گلے شکوؤں کو دور کرے گی؟ نہیں تو پھر آخر اس مرض کی دوا کیا ہے؟ آخر ہم کب تک میڈیا کی جانبداری اور صحافت کی تخریب کاری کا رونا روتے رہیں گے؟؟ اس کے لیے ہمیں کچھ عملی اقدامات کرنے ہوں گے، الحمدللہ مسلم معاشرہ میں صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کی کمی نہیں، اگر یہ چاہیں تو شخصی طور پر ایک مکمل اخبار نکال سکتے ہیں، ایک مستقل ٹی وی چینل چلا سکتے ہیں، ضرورت صرف دینی و ملی جذبہ کی ہے، صحافت کا موجودہ بگاڑ دستک دے رہا ہے کہ ذرائع ابلاغ ہماری دسترس میں ہوتا کہ انسانی دنیا کو معلوم ہو صحافتی دیانتداری اور غیر جانب داری کس کو کہتے ہیں؟ اور صحافت کے ذریعہ انسانیت کی خدمت کیسے کی جاسکتی ہے؟

شکوۂ	ظلمتِ	شب	سے	کہیں	بہتر تھا
اپنے	حصہ	کی	کوئی	شمع	جلاتے

میڈیا کی اسلام دشمنی کا مقابلہ کیوں اور کیسے؟؟

کسی بھی فکر اور نظریہ کے تعلق سے ماحول اور معاشرہ کو موافق یا مخالف بنانے میں ذرائع ابلاغ میڈیا کا رول انتہائی اہم اور مؤثر ہوتا ہے، پھر یہ کہ ماحول بنانے اور بگاڑنے میں کہاں تک انصاف پسندی اور دیانت داری سے کام لیا جاتا ہے؟ اس کا انحصار خود میڈیا سے وابستہ افراد کی ذہنیت پر ہے، ان کی ذہنیت صحیح یا غلط؟ جس سوچ وفکر کے سانچہ میں ڈھلی ہے، اُسی سوچ وفکر سے میڈیا کا تعمیری یا تخریبی، اصلاحی، یا فسادی رول طے ہوتا ہے، موجودہ دور میں اسلام کے خلاف میڈیا کے رول سے کوئی باخبر بے خبر نہیں ہے، اسلام اور مسلمانوں سے متعلق خبروں کی اشاعت میں میڈیا کا تعصب بھرا اور جانبدارانہ رویہ میڈیا کی اسلام دشمنی اور مسلم مخالف امیج کا ایک کھلا ثبوت ہے، لیکن مسئلہ کا حل صرف شکوہ وشکایت اور حسرت وافسوس نہیں ہے، اس کے حل کے لئے مناسب اور ٹھوس اقدام ضروری ہے۔

متعصب اور جانبدارانہ صحافت کا مؤثر ازالہ اور علاج یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اسلامی صحافت کے نقطۂ نظر کو عملی شکل دی جائے، اس لیے کہ موجودہ حالات اور حالیہ واقعات کے حوالے سے میڈیا میں اسلامی تعلیمات کو مسخ کرنے اور مسلمانوں کی شبیہ کو بگاڑنے کی جو بدترین کوشش اور سنگین سازش ہورہی ہے، اس پس منظر میں اسلامی صحافت کی اہمیت، ضرورت اور افادیت دوچند ہوجاتی ہے۔

حالات وزمانے کے تقاضوں کے مطابق اسلامی نظریات کو کس طرح بروئے کار لانا چاہیے؟ اور اسلامی احکام وتعلیمات کو کیسے پیش کرنا چاہیے؟ اس کو سیرت النبی ﷺ کے ایک مشہور واقعہ سے بہ خوبی سمجھا جاسکتا ہے، جب اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو اس کا حکم فرمایا کہ اب آپ کھلے عام تبلیغِ حق کا فریضہ انجام دیجئے: فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (سورۃ النحل: ۹۴) اس حکم کے بعد آنحضرت ﷺ صفا پہاڑی پر تشریف لے گئے اور بلند آواز میں اعلان کے ذریعہ مکہ کے تمام قبائل کو جمع فرمایا، پھر کھلے اور واضح الفاظ میں اپنی رسالت کو تسلیم کرنے اور اللہ کو ایک ماننے کی دعوت دی، یہیں پر

ابولہب نے آپ ﷺ سے شدید نفرت وعداوت کا اظہار کیا، اس واقعہ میں لائق توجہ اور قابل غور بات یہ ہے کہ مکہ کا شہر تقریباً پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے، دوسرے پہاڑوں کو چھوڑ کر آپ ﷺ نے صرف ''صفا'' پہاڑی کا انتخاب کیوں فرمایا؟ وجہ یہ ہے کہ یہ پہاڑی سب سے اونچی اور بلند تھی اور یہاں سے جو آواز لگائی جاتی ہے مکہ کے تمام قبائل بآسانی اس کو سن سکتے تھے، موجودہ دور میں ذرائع ابلاغ ایسی بلند اور اونچی چوٹی ہے جہاں سے کوئی بھی پیغام اور دعوت صرف چند لمحوں میں دنیا کے ہر خطے اور گوشے میں پہونچ جاتی ہے، اس دور میں انٹرنیٹ، سیٹلائیٹ اور سوشیل میڈیا کے ذریعہ اسلام کی نشر واشاعت اور اس کی حفاظت کا فریضہ انجام دینا گویا صفا پہاڑی کی چوٹی پر سے توحید ورسالت کا اعلان کرنا ہے۔

پھر یہ کہ حضراتِ انبیاء علیہم السلام کو معجزات عطا کرنے کے سلسلے میں خود اللہ تعالیٰ کی سنت یہ تھی کہ جس زمانے میں جس چیز کا چلن اور چرچہ زیادہ رہا پیغمبروں کو اسی کا معجزہ دیا گیا، مثلاً: حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں سحر وجادو کا غلبہ تھا، اللہ نے اسی نوعیت کا معجزہ آپؑ کو عطا فرمایا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں طب وعلاج کا زور تھا اور یہی معجزہ آپ علیہ السلام کو یا گیا، رسول اللہ ﷺ کے عہد میں فصاحت وبلاغت اور ادب ہر گلی کا نعرہ اور ہر شہر کا شہرہ تھا، اس لیے آپ ﷺ کو فصاحت وبلاغت کا اعلیٰ ترین شاہکار قرآن مجید جیسا زندہ جاوید معجزہ دیا گیا، موجودہ دور صحافت ومیڈیا کا دور ہے، اس دور میں اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے فضا کو سازگار بنانے میں اور حالات کو خوش گوار بنانے میں ترقی اور کامیابی کی راہوں کو ہموار کرنے میں وہ جدوجہد زیادہ مفید اور کارگر ہوسکتی ہے جو صحافت پر مضبوط گرفت رکھتی ہو، ذرائع ابلاغ سے جس کا تعلق گہرا اور پختہ ہو، اسلامی صحافت کو عملی شکل دینے کے بنیادی خدوخال کیا ہونے چاہیے اور کیا ہوسکتے ہیں؟ یہ ایک طویل اور مستقل موضوع ہے، تاہم اس سلسلہ میں کتاب وسنت میں مذکور تصریحات اور سیرت النبی ﷺ کے واقعات سے چند امور کی واضح راہ نمائی ملتی ہے:

خبروں کی ترسیل میں صحت وسچائی کا اہتمام: اسلامی میڈیا کی بنیادی خصوصیت اور خوبی یہ ہے کہ وہ بے بنیاد، جھوٹ اور کذب بیانی پر مبنی خبروں کی اشاعت نہیں کرتا، اس میں کوئی بھی خبر یا واقعہ کی اشاعت صحت وسچائی کے تمام مراحل سے گذرتی ہے اور گذاری جاتی ہے، قرآن مجید میں اہل ایمان کو واضح انداز میں حکم ہے: ''تمہارے پاس اگر کوئی شریر آدمی خبر لائے تو تم اس پر فوری یقین کرنے کے

بجائے اس خبر کی خوب تحقیق کرلیا کرو۔"يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا إِن جَاءَ كُمْ فَاسِقٌ بِنَبَإٍ فَتَبَيَّنُوا (سورة الحجرات: آیت ٦) اس سے معلوم ہوا کہ محض کسی خبر کا حصول کافی نہیں ہے بلکہ خبر کے حصول کے ساتھ اس کا ثبوت بھی ضروری اور لازم ہے۔

خبر کی سچائی اور صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ جن ذرائع سے خبر موصول ہوئی ہووہ ذرائع معتبر اور صحیح ہوں، موجودہ صحافت میں قارئین کی دلچسپی کی خاطر فرضی خبریں بھی ڈال دی جاتی ہے اور ابتداء میں اس طرح کے جملے ہوتے ہیں کہ:" نامعلوم اور غیر مصدقہ ذرائع کے مطابق ......" اسلامی صحافت میں اس طرح کی خبروں کی کوئی گنجائش اور جگہ نہیں ہے، اس لیے کہ ایسی خبروں کی اشاعت دراصل جھوٹ کو پھیلانا اور اس کو رواج دینا ہے، اسلام جھوٹ اور جھوٹی خبروں کی اشاعت کا کھلا مخالف ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جس نے کوئی ایسی بات کہی جس کے بارے میں وہ جانتا ہے کہ وہ جھوٹ ہے، ایسا شخص دو جھوٹ بولنے والوں میں سے ایک خود جھوٹا ہے۔ (مشکوٰۃ) حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ شیطان آدمی کی شکل و شباہت میں لوگوں کے پاس آتا ہے اور جھوٹ بات ان کے سامنے نقل کرتا ہے، یہاں تک کہ ان میں تفرقہ واختلاف ہوجاتا ہے، پھر ان ہی میں کا ایک آدمی کہتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو یہ بات کہتے ہوئے سنا، میں اس کے چہرہ سے تو واقف ہوں لیکن اس کا نام مجھے نہیں معلوم۔ (مشکوٰۃ: باب حفظ اللسان) پھر یہ کہ سنی سنائی ہوئی باتوں کو مشہور کردینا اور خبر کے انداز میں اس کو پھیلا دینا یہ بھی جھوٹ کی ترویج واشاعت کا ایک عمل ہے، سنی سنائی بات کو اخبارات کی اصطلاح میں ''افواہ'' کہتے ہیں، حالات کو کشیدہ اور صورتِ حال کو پیچیدہ بنانے میں اس کا اہم رول ہوتا ہے، اسلامی میڈیا میں اس کی اشاعت جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے آدمی کے جھوٹے ہونے کے لیے یہ کافی ہے کہ ہر سنی سنائی بات بیان کردے۔ (حوالۂ سابق)

حقائق ومعلومات سے باخبری: موجودہ صحافت میں خبروں اور اطلاعات کی اشاعت " کچھ کہنا قبل از وقت ہوگا" یا " دیکھو اور انتظار کرو" کی پالیسی کے تحت ہوتی ہے، اہم اور نازک معاملات میں یہ پالیسی یقیناً ضروری ہے، لیکن وہ واقعات جن سے سماج کا امن وامان وابستہ ہے اور عوام اصل حقیقت کا پتہ لگا کر سکون واطمینان حاصل کرنا چاہتی ہے ایسے مواقع پر حقائق سے بے خبر رکھنا صحافت کی صحت

مندانہ روایت نہیں۔

اسلامی میڈیا کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر حقائق و معلومات سے آگاہی کا فوری انتظام کرتا ہے اور سماج میں امن وامان کو بحال کرتا ہے، مثلاً ایک مرتبہ مدینہ طیبہ میں ایک خوف ناک آواز سے مسلمان خوف زدہ ہوگئے، منافقین شور مچانے اور افواہ سازی میں لگ گئے کہ مدینہ پرزبردست حملہ ہونے والا ہے، یہ صورتِ حال دیکھ کر آنحضرت ﷺ بنفسِ نفیس گھوڑے کی ننگی پیٹھ پر سوار ہوئے اور مدینہ کی مضافات کی طرف نکل گئے تاکہ معلوم فرماسکے کہ خوف وگھبراہٹ کا مرکز کدھر ہے، تھوڑی دیر بعد رسول اللہ ﷺ تشریف لائے اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ خوف وگھبراہٹ اور پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے، اسلامی میڈیا کی یہ خوبی تیسری دنیا کے میڈیا کی اس روش کے بالکل متضاد ہے، جس میں نازک حالات اور کشیدہ ماحول کے وقت غیر مصدقہ خبروں اور واقعات کو خوب اشاعت ہوتی ہے، حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ سچ کی عدمِ موجودگی میں جھوٹ کی فرمانروائی اور بادشاہت ہوتی ہے۔

بے حیائی اور عریانیت کی ممانعت: اسلامی صحافت کا مقصد سماج کی فلاح و بہبودی اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کی پاسبانی، بازیابی اور بحالی ہے، اسلامی میڈیا کسی ایسی چیز کا ذریعہ نہیں بنتا جس سے اخلاقی زوال اور معاشرتی بگاڑ پیدا ہوتا ہو، اس وقت فحاشی اور عریانیت کی اشاعت، فساد وبگاڑ کا اہم ذریعہ اور سرچشمہ ہے، گذشتہ زمانے میں جو خرافات اور خرابیاں سننے کو نہیں ملتی تھیں، آج بلو فلموں کی ریلیز اور ننگی تصاویر کی اشاعت کی بدولت دیکھنے کو مل رہے ہیں، موجودہ صحافت کا امتیاز اور کمال بھی اسی میں سمجھا گیا کہ فحاشی اور عریانیت کی نشر واشاعت اور ہیجان خیز عشقیہ داستانوں کی طباعت زیادہ سے زیادہ ہو، اگر معلوم ہوجائے کہ فلاں دو اہم شخصیتوں کے درمیان پیار ومحبت کی پھلجھڑیاں چھوڑی جارہی ہیں تو اخباری رپورٹرس اور فوٹو گرافرس ان دونوں کا سایہ بن جاتے ہیں اور ان دونوں کے "کارنامہ ہائے عشق" کو تحریر کا جامہ پہنانے کے لیے دن رات ایک کرتے ہیں، پھر جب یہ کوشش مطبوعہ شکل میں منظرِ عام پر آتے ہی اس کی لاکھوں کاپیاں ہاتھوں ہاتھ نکل جاتی ہیں، برطانوی شہزادی مس ڈائنا اور سابق امریکی صدر بل کلنٹن کی داستانیں اس کی واضح مثال ہیں، اسلامی میڈیا اس طرح کی خرافات اور خرابیوں کا بالکل روادار نہیں ہے، معصیت اور گناہ یقیناً انسانی معاشرہ کا ایک حصہ ہے، اس کو

اگر منظر عام پر لانا ہی ہوتو اس کا مقصد تنبیہ ہو نہ یہ کہ ترغیب اور دلچسپی کا سامان اس میں پیدا کیا جائے۔

برائی کی اشاعت کے مسئلہ پر دو باتیں اسلامی میڈیا کے پیش نظر ہیں: ایک یہ کہ ایسی خبریں پختہ اور ٹھوس ثبوت ہی کے بعد شائع ہوں، دوسرے یہ کہ ایسی خبریں شائع ہونے کے بعد اس کی روک تھام اور انسداد کے عملی اقدام کو بھی نمایاں اہمیت دی جائے، اس بارے میں جو سخت سے سخت شرعی سزائیں ہیں، ان کو اتنا زیادہ بتایا اور پھیلایا جائے کہ معاشرہ کے کسی فرد کو جنسی جرائم کے قریب جانے کا حوصلہ نہ ہو، موجودہ صحافت میں جنسی جرائم تو شائع کر دیئے جاتے ہیں لیکن چونکہ ان کے انسداد کے عملی اقدامات کا کوئی ذکر نہیں ہوتا، اس لیے معاشرے میں جنسی جرائم بجائے کم ہونے کے جڑ پکڑتے ہیں اور شریر قسم کے لوگ ان کی ہمت کر بیٹھتے ہیں، برائی اور گندگی کی اشاعت کے تعلق سے باری تعالیٰ کا یہ واضح فرمان ہے کہ: ''جو لوگ برائی ومعصیت کے اشاعت کو پسند کرتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔'' (سورۃ النور:) سماج کے کسی فرد میں اگر کوئی نقص وعیب اور کمزوری کا پتہ چل جائے تو اس کو اچھالنے کے بجائے اس کی پردہ پوشی کرنی چاہیے، الّا یہ کہ سماج کے عمومی مفاد میں یہ نقص وعیب نقصان دہ ہو اور وہ فرد اپنی زندگی میں جواب دہی کی حیثیت رکھتا ہو، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے یہاں ایک شخص لایا گیا اور اس کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ ایسا آدمی ہے جس کی داڑھی شراب میں شرابور رہتی ہے۔ آپؓ نے فرمایا: ہمیں کسی کی ٹوہ میں لگے رہنے سے منع کیا گیا ہے، ہاں اگر کوئی بات از خود ظاہر ہو جائے تو ہم اس کو قبول کریں گے اور اس کے مطابق فیصلہ لیں گے۔

خلاصہ یہ کہ بلند اخلاقی روایات سے خالی اور اعلیٰ صحافتی اقدار سے عاری موجودہ متعصب اور جانبدارانہ صحافت کے مقابلہ میں اسلامی صحافت ومیڈیا کا عملی اقدام وقت کی اہم ترین ضرورت ہے، اسلام مخالف فضا کا اہم ترین تقاضہ ہے، دینی محنت وجدوجہد کے علمبرداران کا بنیادی فریضہ اور پیغامِ حق کو عام کرنے کا ذریعہ بھی ہے، ضرورت ہے کہ اس سلسلہ میں جو مواقع وامکانات معلوم اور موجود ہیں ان پر عمل کیا جائے اور ان سے بھرپور استفادہ کیا جائے، وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (سورۃ العنکبوت: ۲۹) جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ان کے لیے ہم راہیں ہموار کرتے ہیں۔

..................روزنامہ منصف ۲۹ / جولائی ۲۰۰۵..................

امریکہ میں مسلمانوں کے حالات اور مسائل

ممتاز عالمِ دین مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی سے ایک ملاقات

استاذِ محترم مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی مدظلۂ العالی ایک دینی خانوادہ اور علمی گھرانے کے چشم و چراغ ہیں، آپ کے والدِ محترم حافظ قرآن مجید ہیں اور تمام برادران بھی حافظ و عالم اور مفتی ہیں، سب اپنی جگہ دینی و علمی خدمات سے وابستہ ہیں ؎ ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است''

آپ کی ابتدائی تعلیم مدرسہ فیض العلوم سعید آباد اور دارالعلوم سبیل السلام میں ہوئی، اس کے بعد ایشیاء کی دو عظیم مرکزی دینی درسگاہوں دارالعلوم دیوبند اور دارالعلوم ندوۃ العلماء میں اعلیٰ دینی تعلیم کی تکمیل کی اور ان دونوں اداروں سے سندِ فضیلت حاصل کی، زمانۂ طالبِ علمی ہی سے آپ اپنے اساتذۂ کرام کے منظورِ نظر رہے، آپ کی صلاحیت اور صالحیت پر انہیں اعتماد ہے، یہی وجہ ہے کہ استاذِ محترم جب کبھی اپنے اساتذۂ کرام کی خدمت میں حاضری دیتے تو وہ اپنے اس تلمیذِ رشید کے ساتھ محبت و شفقت کا خصوصی معاملہ فرماتے۔

بلند کردار اور اعلیٰ اخلاق کی حامل استاذ محترم کی شخصیت کا ایک امتیازی پہلو آپ کی حسن تربیت ہے، اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے ساتھ محبت و شفقت اور اپنائیت وانسیت سے بھر پور برتاؤ آپ کا خاص وصف ہے، استاذِ محترم کو ایک لگن اور تڑپ رہتی کہ طلبہ کچھ بنیں اور آگے بڑھیں اور مستقبل میں اپنی صلاحیت و قابلیت کے جوہر دکھائیں، اس لیے مدرسہ کے اوقاتِ تعلیم کے علاوہ خارجی اوقات میں بھی آپ طلبہ کو عربی و اردو کی مشق و تمرین کا کام دیتے اور مضمون نگاری کی خصوصی تربیت فرماتے، آپ کے جن شاگردوں بشمول راقم سطور کے دارالعلوم دیوبند، دارالعلوم ندوۃ العلماء اور مظاہر العلوم سہارنپور جیسی مرکزی دینی درسگاہوں سے سندِ فضیلت حاصل کی ہے انہیں بجاطور پر اس کا احساس واعتراف ہے کہ اگر حضرت الاستاذ کی رہنمائی اور آپ کی حوصلہ افزائی و ہمت افزائی نہ ہوتی تو علم

وعرفاں کے ان بڑے سمندروں سے سیرابی ممکن نہیں تھی۔

استاذِ محترم اپنے معاصر علمی وادبی حلقوں میں بھی قدر کی نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں، عربی زبان وادب پر آپ کو گہرا عبور حاصل ہے، آپ اپنے بڑوں کے علمی و تحقیقی کاموں میں ان کے معاون اوردستِ راست ہوتے ہیں، آپ بہترین انشاء پرداز اور مضمون نگار ہیں اور کہنہ مشق ماہر مقرر بھی، زبان کی روانی اورقلم کی جولانی یہ آپ کی صلاحیت وقابلیت کا طرۂ امتیاز ہے، تقریر میں متانت وسنجیدگی اورشائستگی ہوتی ہے، جب کہ تحریر ادب کی حلاوت و چاشنی لیے شستہ اورشگفتہ ہوتی ہے، آپ سمینار اور کانفرنس کی کارروائی بھی سلیقہ اور ہنرمندی کے ساتھ چلانے کا امتیاز رکھتے ہیں۔

باصلاحیت قابل اور ہنرمند شخصیت کا دائرۂ فیض کسی ایک علاقے تک محدود اور مخصوص نہیں ہوا کرتا، ایسا ہی کچھ معاملہ استاذِ محترم کا ہے، آپ ایک عرصے تک اپنے شہر اور اپنے ملک میں فیض پہنچاتے رہے، تعلیم وتربیت کے اعتبار سے یہاں کے طلبہ کے لیے سیرابی کا سامان کرتے رہے، پھر قدرت کو منظور ہوا کہ دیارِ مغرب میں بھی لوگ آپ سے فائدہ اٹھائیں، وہاں دین وایمان اور تہذیب واخلاق سے محروم اورکمزورعوام کے لیے آپ کا وجود بارانِ رحمت ہو، چنانچہ گذشتہ چند سالوں سے آپ امریکہ میں مقیم ہیں، بلند پایہ دینی، اصلاحی اوردعوتی خدمات سے وابستہ ہیں، درسِ نظامی جو برصغیر کے مدارس وجامعات میں رائج عالمیت وفضیلت کا معروف نصابِ تعلیم ہے اس کی تعلیم کے علاوہ علمی سرگرمیوں کے فروغ کے لیے آپ نے ایک ادارہ بہ نام "معہد العلوم الاسلامیۃ" قائم کیا، اس کے آپ ناظم اوراستاذ ہیں، انگریزی زبان سے واقفیت وہاں دینی اوردعوتی خدمات کو کامیاب اورکارآمد بنانے کے سلسلے میں ایک مفید اورمؤثر ذریعہ ہے، مولانا محترم نے وہاں باضابطہ اس زبان کو سیکھا ہے۔

موجودہ دور میں یوروپی ممالک کی اسلام دشمن پالیسیوں اورکارروائیوں سے ہر کوئی باخبر اورآگاہ ہے، یہ کارروائیاں اور پالیسیاں دراصل مغرب میں قبولِ اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان کو روکنے کی کوشش ہیں۔ لیکن مغرب میں اسلام کا سیل رواں نہ تھما ہے اور نہ تھمے گا انشاء اللہ، علامہ اقبالؒ نے بہت پہلے ہی فرمایا تھا کہ ؎

مغرب کی وادیوں میں گونجی اذاں ہماری
تھمتا نہ تھا کسی سے سیل رواں ہمارا

استاذِ محترم بھی اسی سیل رواں کا ایک حصہ ہے، علمی فیض اور دینی خدمات کے ذریعہ اس سیل رواں کو آگے بڑھانے اور منزلِ مقصود تک پہنچانے میں آپ متحرک اور سرگرم ہیں، یوں آپ اور آپ جیسے اصحابِ علم اور اہل فضل وکمال کی سرگرمیاں دیارِ مغرب میں علوم اسلامیہ کی خدمات کے تھکے ماندے فرزندوں کو جھنجھوڑ کر انہیں یہ پیغام دے رہی ہیں کہ ؎

تو شاہین ہے ، پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روزوشب میں الجھ کہ نہ رہ جا
کہ ترے لئے زماں و مکاں اور بھی ہیں

راقم الحروف نے مغربی دنیا خصوصاً امریکہ میں مسلمانوں کے حالات کے موضوع پر استاذِ محترم کے ساتھ کچھ گفتگو کی ہے اس کے بعض پہلو پیش خدمت ہیں:

امریکہ میں (۹/۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء) کے بعد پائی جانے والی صورتِ حال پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا نے کہا: گیارہ ستمبر کے واقعہ نے صرف امریکہ ہی نہیں پوری دنیا میں مسلمانوں کو کسی نہ کسی اعتبار سے متأثر کیا ہے، اس کے بعد دنیا کی سیاست اور ملکی و عالمی حالات میں جس تیزی کے ساتھ تغیر ہوا ہے اس سے تمام اہل نظر باخبر ہیں، تاہم وقتی طور پر انتشار واضطراب کی جو کیفیت سامنے آئی تھی وہ بھی ختم ہو چکی ہے، مسلمان وہاں پورے اطمینان کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل پیرا ہیں، اسلامی مراکز اور مساجد کا نظام نہایت مستحکم ہے، ائمہ کرام اور علمائے دین مسلمانوں کو دین ومذہب اور اخلاق و انسانیت کی راہ پر گامزن رکھنے کی بھر پور سعی کرتے ہیں، ان کے لیے جمعہ کے خطبات کے علاوہ مختلف موضوعات پر محاضرات اور قرآن وحدیث کے درس کا نظم بھی کیا جاتا ہے، مساجد میں طلبہ ونوجوانوں کی دینی تعلیم وتربیت کے لیے سنڈے اسکول کا ایک نظام ہے، جس سے مغرب کے مخصوص ماحول میں نوجوانوں اور بچوں کو دین سے قریب رکھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، جو خواتین صحیح دینی فکر وشعور کی حامل

ہوتی ہیں وہ پوری آزادی کے ساتھ حجاب کا اہتمام کرتی ہیں۔

امریکہ میں قبولِ اسلام کے بڑھتے ہوئے رجحان کے بارے میں استاذِ محترم نے بتایا کہ: وہاں اسلام تیزی کے ساتھ پھیل رہا ہے اور لوگ دلچسپی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں، جس وسعتِ قلبی اور کشادہ نظری کے ساتھ وہاں کے لوگ اسلام کے بارے میں پڑھتے اور سنتے ہیں اس کی مثال کسی اور ملک میں ملنی مشکل ہے، روحانی سکون اور طمانیتِ قلبی آج کی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے، ہر کوئی اس کی تلاش میں سرگرداں ہے، اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات میں ہی روح و دل کی تسکین کا سامان ہے، جو لوگ بصیرت و تدبر کے ساتھ اس حقیقت کا ادراک کر لیتے ہیں وہ اسلام کے دامن میں گوہرِ مراد کو پا لیتے ہیں، انھوں نے بتایا کہ امریکی عوام نہایت خلیق، ملنسار اور نرم خو ہوتے ہیں، ان کا برتاؤ، طرزِ عمل اور سلوک ہر ایک کے ساتھ شفقت و محبت کا ہوتا ہے، سوائے ایمان کے اسلام کی تمام اخلاقی تعلیمات اور خوبیاں ان میں موجود ہیں، اگر انہیں اسلام کی حقیقت سمجھا دی جائے اور نصح و اخلاص کے ساتھ ان پر محنت کی جائے تو ان کے دل کی زمین یقین و ایمان کی تخم ریزی سے لہلہا اٹھے اور وہ اسلام کا ایک سچا نمونہ بن جائے۔

امریکہ میں مقیم مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے لیے دینی تعلیم کی ضرورت و اہمیت پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے استاذِ محترم نے کہا: مشرقی ممالک سے جو مسلمان اپنے ملکوں اور علاقوں میں تعلیم و تربیت پا کر یہاں آئے ہوئے ہیں ان کو اپنے دین سے لگاؤ ہے، دینی و اخلاقی نظام پر انہیں مکمل اعتماد ہے، جس کی وجہ سے ان کے دین اخلاق پر کوئی خطرہ ہیں، لیکن ......نئی نسل جس نے دل و دماغ پر نقشِ اوّل بھی امریکہ جیسے بے دین اور اخلاقی قدروں سے خالی ملک میں حاصل کیا، اگر اس کو دین و اسلام سے صحیح طور پر وابستہ کرنے کی مناسب کوششیں نہیں کی گئیں تو یہ نئی نسلیں نہ صرف اسلام سے ناواقف رہیں گی بلکہ بالکل بیگانہ ثابت ہوں گی، چنانچہ یہ تجربہ اور روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ جو لوگ چالیس پچاس سال پہلے امریکہ آئے ہوئے ہیں ان میں سے اکثر اپنی اولاد کی دینی صورتِ حال پر پریشان و فکرمند نظر آتے ہیں کہ ان کی اولاد کا اسلام سے رابطہ نہیں ہے اور اگر ہے تو محض رسمی۔

مفکرِ اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے دورۂ امریکہ کے موقع پر ایک خطاب میں

فرمایا تھا کہ:

”دین کی حفاظت اور دین کے سلسلہ میں درپیش خطرات کے مقابلہ کے لیے مسلمان کچھ نظم نہیں کر سکتے تو مغرب اور اس کی تہذیب سے متأثر اور نمائندہ ملکوں میں آپ کے رہنے کو میں ناجائز سمجھتا ہوں، آپ کے ملکوں میں اگر خشک روٹی ملتی ہے تو اس کو گوارہ کرنا چاہیے، مزید آمدنی کے لیے اپنی نسلوں کو دینی وتہذیبی ارتداد کے خطرہ میں نہیں ڈالنا چاہیے“

مولانا محترم نے مزید کہا کہ جو لوگ اپنی دن بھر کی تمام مصروفیات کے باوجود دن میں اگر ایک مرتبہ بھی نماز پڑھ لیتے تو وہ تہذیبی یلغار سے محفوظ ہوتے ہیں اور جو لوگ مسجد سے بالکل بے تعلق ہوتے ہیں وہ اور ان کے خاندان دین وایمان کے سلسلہ میں آزمائش سے دوچار ہوتے ہیں۔

امریکہ میں مسلمانوں کو پیش آمدہ مسائل پر استاذِ محترم نے کہا: جدید صنعتی اور سائنسی انقلاب کے نتیجہ میں جو مسائل سامنے آئے ہیں وہ مختلف نوعیت کے ہیں، تاہم ایک مسئلہ سماجی اور تہذیبی حیثیت سے امتِ مسلمہ کی شناخت اور تشخص کی برقراری کا ہے، اور کوئی شک نہیں کہ یہ مسئلہ اس قدر نازک اور اہم ہے کہ اس پر مناسب توجہ نہ دی جائے تو اندیشہ ہے کہ تہذیبی ارتداد کا دروازہ کھل جائے، چوں کہ اسلام ایک مذہب بھی ہے اور تہذیب بھی، اس لیے دین کی حفاظت کے ساتھ تہذیب اور معاشرت کا تحفظ اور بھی ضروری ہے، چنانچہ دعوتی حلقوں اور علمی دانش گاہوں سے وابستہ اہل علم اس سلسلہ میں پوری توجہ کے ساتھ سرگرمِ عمل ہیں اور اس کے مثبت نتائج بھی سامنے آرہے ہیں، جہاں تک فقہی مسائل کا تعلق ہے، تو اس سلسلہ میں دنیا بھر کے اہل علم واصحابِ افتاء اس علاقے کے مسائل پر قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کی روشنی میں اپنی تحریروں سے جو رہنمائی کر رہے ہیں وہ نہایت قابل قدر ہے، اور اب تو مختلف علمی ادارے قائم ہیں، جن کا کام ہی جدید پیش آمدہ مسائل پر بحث وتحقیق اور ان کا اسلامی حل پیش کرنا ہے، ”اسلامک سوسائٹی آف نارتھ امریکہ“ کے تحت ”شرعی کونسل“ بھی ہے، اور ڈاکٹر طٰہٰ جابر العلوانی کا ادارہ ”**المعهد العالمی للفکر الاسلامی**“ بھی ہے، حضرت مولانا مفتی نوال الرحمن صاحب مدظلہ نے ”شریعہ سپروائزری بورڈ“ کے نام سے جو ادارہ قائم کیا ہے وہ اپنے

نام وکام کے اعتبار سے معروف ہے، اسی طرح ایک اہم علمی ادارہ ’’مجمع فقهاء الشريعة‘‘ بھی ہے، جس کا میں بھی رکن ہوں، ممتاز فقیہ ڈاکٹر صلاح الصاوی اس کے سکریٹری جنرل ہیں اور معروف فقیہ اور مختلف انسائیکلوپیڈیائی طرز کی کتابوں کے مصنف ڈاکٹر وہبہ الزحیلی اس کے مشیر اور سرپرست ہیں، یہ ادارے دینی مسائل اور شرعی احکام میں مسلمانوں کی بھرپور رہنمائی کرتے ہیں اور وہاں کے مسلمان اپنے مسلک ومشرب کے مطابق علماء اور اداروں سے رجوع ہوکر رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

امریکہ میں متحرک اور سرگرم شخصیات وتنظیموں کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے استاذِ محترم نے کہا: امریکہ میں مختلف نظریات وافکار کی حامل تنظیمیں، جماعتیں اور ادارے بھی سرگرم عمل ہیں، ہر ایک تنظیم اپنے دائرہ عمل میں کام کررہی ہے، تاہم دین حق کی صحیح فکروترجمانی کے لیے صحیح سوچ اور صحیح فکر اور عقیدے کے حامل علماء اور اصحابِ دعوت کا باہمی تعاون نہایت ضروری ہے، فکری آزادی اور دینی ودعوتی نزاکتوں اور تقاضوں کا عدمِ احساس بعض دفعہ نئے مسائل کو جنم دیتا ہے اور عملی طور پر اس صورتِ حال کا مقابلہ نہایت دشوار ہے......استاذِ محترم نے مزید کہا کہ سیاہ فام مسلمانوں کی تنظیم ’’نیشن آف اسلام‘‘ کا اپنا دائرہ عمل ہے، مختلف دینی رجحانات کے مرحلوں سے گزرتے ہوئے یہ تنظیم اس وقت بتدریج اعتدالِ فکر کی طرف مائل ہے، تاہم سیاہ فام مسلمان مکمل طور پر اسلام سے قربت اور محبت رکھتے ہیں، عملی اعتبار سے بعض خامیوں کے باوجود ان کا دینی جذبہ بے حد قابل ستائش ہے۔ جیلوں میں اسلام کے تعارف کی اہم ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہیں، اسی طرح ISNA اور ICNA بھی تعلیمی، دعوتی اور ثقافتی اور تہذیبی میدان میں مصروف نہایت اہم تنظیمیں ہیں، جن سے مسلمان ایک طویل عرصے سے عملی طور پر وابستہ ہیں، تاہم بعض تنظیمیں اپنے مخصوص طرز وفکر کے باعث مسلمانوں کے لیے جو پروگرام اور سرگرمیوں کی دعوت دیتی ہیں وہ اسلام اور شریعت کے مزاج ومذاق سے پورے طور پر ہم آہنگ نہیں ہوتی، جب اسلام کی دعوت شرعِ محمدی ﷺ اور طریق نبوی ﷺ سے مختلف ہوتو اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوتے، مولانا نے بتایا کہ جو شخصیات امریکہ کے مسلمانوں میں کام کررہی ہیں وہ قابل لحاظ تعداد میں ہیں، ان میں شیخ حمزہ یوسف، مولانا مفتی نوال الرحمن، امام سراج وہاج، ڈاکٹر جمال بدوی، ڈاکٹر احمد صقر، ڈاکٹر عمر شاہین، امام عبد الملک جوہری، مولانا قاری عبد اللہ

سلیم وغیرہ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

استاذِ محترم نے Islameasy.org نامی ویب سائٹ تیار کی ہے، دراصل امریکہ میں جو لوگ مشرف باسلام ہوتے ہیں ان کی صحیح تربیت کا نظم نہ ہونے کی بناء پر وہ فکری بے راہ روی اور ذہنی آوارگی کا شکار ہوجاتے ہیں، اسلام کے نام پر موجود گمراہ کن ویب سائٹ دیکھنے سے ان کے ایمان کی بقا کا سوال کھڑا ہوتا ہے، اس لیے اس ویب سائٹ کے قائم کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انٹرنیٹ کی وسیع دنیا میں پھیلی ہوئی ویب سائٹس میں ایک ایسی ویب سائٹ سے نئے مسلمانوں کو متعارف کروایا جائے جس سے انہیں صحیح دینی فکر اور اسلامی معلومات بہم پہچائی جائیں، تاکہ وہ ذہنی وفکری اعتبار سے صحیح دینی راہ پر قائم رہیں اور علماء وفقہاء کے ساتھ ان کا علمی ارتباط انہیں صحیح عمل کی شاہراہ پر گامزن رکھے۔

گفتگو کے اختتام پر استاذِ محترم نے کہا کہ مغرب میں اسلام کی ترقی وکامیابی کے امکانات روشن ہیں، یہ خطہ اور علاقہ ایک نئی کروٹ لے رہا ہے اور امید کی ایک نئی کرن پیدا ہورہی ہے، بہت پہلے سے اس خطہ میں اسلام کی روشنی پھیلنے کا نظم ہوتا اور اس کے لیے کوششیں کی جاتیں تو علاقہ اس جاہلیت اور مادّیت کے دلدل میں پھنستا اور نہ اس کی وجہ سے وہ قومیں ان دلدلوں میں نہ پھنستیں جو یوروپ کی مقلد ہیں، آج یہ خطہ جس طرح دین واخلاق کے نظام سے محروم نظر آتا ہے یہ دراصل ہم اہل اسلام کی کوتاہی کا نتیجہ ہے، اب جو لوگ وہاں دینی محاذ سنبھالے ہوئے ہیں ان کی اور عام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس عظیم انسانی آبادی کو محسن انسانیت سیدنا محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے روشناس کرائیں۔

............روزنامہ منصف: ۹؍مئی ۲۰۰۸ء............

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر
نیا زمانہ نئی صبح وشام پیدا کر

میرِ عرب کو ٹھنڈی ہوا آئی جہاں سے!

ہندوستان جنت نشان کی موجودہ صورتِ حال پر ہر انصاف پسند شہری فکرمند ہے، یہاں کی فاشسٹ اور فرقہ پرست طاقتیں اپنے مخصوص ایجنڈے کو یہاں پر نافذ کرنا چاہتی ہیں، وقتاً فوقتاً ملک کی اقلیتوں کو اپنی زہر افشانیوں کا نشانہ بناتی ہیں، ملک کی سب سے بڑی اقلیت پر ان کی "نظرکرم" کچھ زیادہ ہی ہوگئی ہے، کبھی ان کو بھارتیہ کرن کرنے کو کہا جاتا ہے اور کبھی ان کے دینی مدارس اور اسلامی مراکز کو دہشت گردی کے اڈے بتایا جاتا ہے، قطع نظر اس کے کہ ان سب باتوں میں حقیقت وصداقت کتنی ہے؟ یہ باتیں آزادانہ طور پر کہی جاتی ہیں اور چھاپی جاتی ہیں، اس کی کچھ پرواہ نہیں ہوتی کہ ان باتوں سے کتنوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور کتنی غلط فہمیاں اور دوریاں پیدا ہوتی ہیں؟ صحیح بات یہ ہے کہ اگر تاریخ کی روشنی میں اس ملک میں مسلمانوں کی آمد اور اس ملک سے ان کا تعلق اور اس کے سنوارنے وسدھارنے میں ان کی خدمات اور کارناموں کا غیر جانبدارانہ مطالعہ اور تجزیہ کیا جائے تو یہ غلط فہمیاں اور شرانگیزیاں ختم ہوسکتی ہیں۔

ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے تعلق سے کچھ جذباتی وجوشیلی باتیں ہیں اور کچھ تاریخی حقائق وشواہد ہیں، بعض دفعہ تاریخ کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے جذباتی وجوشیلی باتیں حقیقت کے قریب ہوجاتی ہیں یا حقائق کا درجہ لے لیتی ہیں اور خواہی نہ خواہی تردیدی یا تائیدی انداز میں وہ نوکِ قلم پر آجاتی ہیں، یہ مسئلہ مؤرخین کے درمیان بہت ہی پیچیدہ اور متنازعہ رہا ہے کہ اس ملک کے اصلی باشندے کون ہیں؟ آریہ قوم کے متعلق ان کا بیان ہے کہ وہ چند ہزار سال پہلے وسط ایشیا سے ہوکر پنجاب میں داخل ہوئے، پھر وہاں گنگا جمنا دوندیوں کے آس پاس پھیل گئے، ایسے بیانات کی بناء پر یہ لوگ یہاں کے اصلی باشندے سمجھے جاتے ہیں، اس کے برخلاف عربوں کا دعویٰ ہے کہ ہندوستان سے ان کا تعلق صرف ہزار یا چند ہزار برس کا نہیں، بلکہ ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک یہ ملک ان کا

آبائی وطن ہے،اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام آسمان سے ہندوستان پر اتارے گئے اور وہ اس دنیاءِ رنگ وبو میں سب سے پہلے مسلم فرد تھے،لہٰذا دیکھا جائے تو صرف ہندوستان ہی کیا پوری دنیا میں سب سے پہلے مسلمان آباد ہوئے ،ابن جریرؒ، ابن ابی حاتمؒ اور حاکمؒ میں ہے کہ ہندوستان کی جس سر زمین پر حضرت آدم علیہ السلام اتارے گئے ، اس جگہ کا نام ''دجفاء'' ہے، ممکن ہے کہ یہ لفظ جنوبی ہند کے ایک مقام ''دکھنا'' یا ''دکھن'' ہندی نام کا معرب ہو، چوں کہ جنوبی ہند میں پائے جانے والے انواع واقسام کے مسالے اور خوشبوئیں عرب ممالک کو جاتے تھے اور وہاں سے پوری دنیا میں پھیلتے تھے ،اس لیے ان حضرات کا یہ بیان بھی ہے کہ یہ اشیاء حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اتاری گئیں، گویا یہ بہشتی تحائف کی یادگار ہیں، ان پھلوں اور میوہ جات میں امرود، لیموں اور چھوہارے ہندوستان میں موجود ہیں، ان جذباتی روایات میں ایک روایت یہ ہے کہ جنت سے ۴/دریا نکلے: نیل، فرات، جیحون ،سیحون ، دریائے نیل پر مصری زراعت کا دارومدار ہے اور دریائے فرات عراق کی سرسبزی وشادابی کی بنیاد ہے، جیحون ترکستان کا دریا ہے، ترکستان میں اس کی وہی اہمیت ہے جو نیل وفرات کی عراق اور مصر میں ہے،لوگوں کا خیال ہے کہ سیحون نامی دریا ہندوستان کے دریا کا نام ہے، جو دریائے سندھ یا دریائے گنگا میں کوئی ایک ہوسکتا ہے۔''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' کے مصنف میر آزاد بلگرامی ہندوستان کے فضائل میں لکھتے ہیں کہ:

> جب آدم علیہ السلام سب سے پہلے ہندوستان میں آئے اور یہاں ان پر وحی آئی تو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ ملک ہے جہاں خدا کی پہلی وحی نازل ہوئی اور چوں کہ محمد رسول اللہ ﷺ کا ابتدائی ظہور اس سرزمین میں ہوا، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے ہندوستان سے خوشبو آتی ہے''

ضروری نہیں کہ یہ اور اس طرح کی دیگر روایات فنِ حدیث کے معیار پر پوری اترتی ہوں، تاہم ان سے اس عمومی غلط فہمی کا ازالہ ہوسکتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں محمود غزنوی کی فتوحات کے بعد آباد ہوئے ،حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے اس ملک کو بجائے مفتوحہ ملک سمجھنے کے اپنا آبائی وموروثی وطن سمجھا، کہنے کو تو ہم کہہ جاتے ہیں یہ سب خوش فہمیاں ہیں ،لیکن وقتِ ضرورت یہی خوش

فہمیاں تاریخی حقائق کے تعین میں ممد ومعاون ثابت ہوتی ہیں، جہاں تک مسلمانوں کی آمد کے بارے میں تاریخی حقائق کا تعلق ہے تو اس بارے میں مشہور محقق اور معروف انشاء پرداز علامہ سید سلیمان ندویؒ نے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اور ایسی دادِ تحقیق دی ہے کہ اس پر اضافہ مشکل ہے، اس تفصیل کا حاصل اور خلاصہ نمبر وار کچھ اس طرح ہے:

۱) عربوں اور مسلمانوں میں نسبی وخاندانی حیثیت سے سب سے بڑا درجہ سید یعنی سادات کا ہے، موجودہ سادات کا بڑا حصہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کے صاحبزادہ حضرت زین العابدینؒ کی نسل سے ہے، آپؒ کی والدہ محترمہ عرب نژاد نہیں تھیں، ایرانیوں کا کہنا ہے کہ وہ ایران کے شاہی خاندان سے تھیں، لیکن مؤرخین کا بیان ہے کہ وہ سندھ کی رہنے والی تھیں، اگر یہ بات صحیح ہے تو یہاں بے تکلف یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ عرب واسلام کے سب سے شریف ومقدس خاندان کے وجود میں ہندوستان کا بھی حصہ ہے اور شاید یہ کہنا بھی درست ہے کہ اور مسلمان ہوں یا نہ ہوں مگر سادات آلِ زین العابدین نیم ہندوستانی ہیں۔

۲) جو ملک دریا کے کنارے یا اس کے قرب وجوار میں ہوتے ہیں ان کے درمیان فطرتاً تجارتی تعلقات ہوتے ہیں، پھر جیسا کہ معلوم ہے کہ ہندوعرب کے درمیان صرف سمندر حائل ہے، ایک لحاظ سے یہ دونوں پڑوسی وہمسایہ کہے جاسکتے ہیں، عرب تجار تاریخ کی دریافت سے پہلے ہی سے ہندوستانی سواحل تک آتے تھے اور یہاں کی پیداوار غلہ کو مصر وشام کے ذریعہ دوسرے یوروپی ممالک میں پہنچاتے تھے اور وہاں کے سامان کو ہندوستان، جزائرِ ہند اور جاپان تک لے جاتے تھے، اس زمانہ میں خلیج فارس، بحر احمر، بندرگاہ دیبل اور تھانہ وغیرہ دریائی شہروں میں درآمدات وبرآمدات کا سلسلہ مسلسل جاری تھا، طلوعِ اسلام کے بعد ان تجارتی تعلقات کی نوعیت بدل گئی، اب یہاں کے عرب نہ صرف تاجر تھے بلکہ وہ دینِ حق کے مبلغ وداعی بھی تھے، اس لیے یہ تعلقات دعوتی ومذہبی تعلقات میں بدل گئے۔

۳) ان تاریخی حقائق میں حیرت انگیز اور تعجب خیز بات یہ ہے کہ جنگِ مہابھارت کے زمانہ میں بھی عربی زبان رائج تھی اور لوگ اس کو بولتے اور سمجھتے تھے، ہندستان کے نامی گرامی مشہور پنڈت دیانند سرسوتی اپنی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' میں لکھتے ہیں کہ ''مہابھارت میں جب کوروں نے راکھ کا

گھر بنا کر اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو درجی نے یہ یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر نے اسی عربی زبان میں ان کو جواب دیا۔ (سمولاس: پہلا پرواد ھیانہ: ۷ ۱۴، بحوالہ عرب و ہند تعلقات ص:۱۱)

پنڈت صاحب کے اس حوالہ کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں ہے تو مشکل ضرور ہے اور اس سے عربوں و ہندوؤں کا جو انتہائی قدیم ابتدائی رشتہ ہے، بخوبی واضح ہے، یہ تو تھے وہ حالات اور تعلقات جو اسلام اور بعثتِ نبویؐ سے پہلے یہاں کے باشندوں کے درمیان قائم تھے۔

اب آیئے ان روابط کی طرف جو طلوع اسلام کے بعد عرب اور ہندوستانیوں کے درمیان رواج پائے، ہندوستان سے مسلمانوں کا پہلا رابطہ آنحضرت ﷺ کے زمانۂ بعثت میں ہی ہو چکا تھا، کچھ، سراندیب، لکشادیپ، مالدیپ وغیرہ ساحلی علاقوں کے بعض راجہ بھی اس زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے، سب سے پہلے اسلام اور مسلمانوں سے واقفیت سراندیپ کے راجہ کو ہوئی، وہ عہد صحابہؓ میں ۲۰ھ مطابق ساتویں صدی عیسوی میں مسلمان ہو گیا تھا، بزرگ بن شہریار ناخدا جو جزیروں کا جہاز راں تھا، مزید تفصیل بتاتے ہوئے لکھتا ہے:

> ”سراندیپ اور اس کے آس پاس والوں کو جب پیغمبر اسلام کی بعثت کا حال معلوم ہوا تو انہوں نے اپنے میں سے ایک سمجھ دار آدمی کو تحقیقِ حال کے لیے عرب روانہ کیا، وہ رکتے رکاتے جب مدینہ پہونچا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا چکے تھے، (حضرت) ابوبکرؓ کی خلافت بھی ختم ہو چکی تھی اور (حضرت) عمرؓ کا زمانہ تھا، وہ ان سے ملا اور رسالت مآب ﷺ کے حالات دریافت کیے، (حضرت) عمرؓ نے بالتفصیل بیان کیے، جب وہ واپس ہوا تو مکران (بلوچستان) پہنچ کر مر گیا، اس کے ساتھ اس کا ایک ہندو نوکر تھا، جو صحیح سلامت سراندیپ پہنچ گیا اور اس نے رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کا سارا حال بیان کیا اور ان کے فقیرانہ اور درویشانہ طور وطریق کا ذکر کر کے بتایا کہ وہ کیسے متواضع اور خاکسار ہیں

اور پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے ہیں اور مسجد میں سوتے ہیں، اب یہ لوگ مسلمانوں کے ساتھ جو اس قدر محبت و میلان رکھتے ہیں، وہ اسی سبب سے ہے۔" (عجائب الہند: ۱۵۵، بحوالہ عرب و ہند تعلقات: ۲۶۲)

ہندوستان کی تاریخ پر لکھی گئی قدیم کتاب "تاریخِ فرشتہ" میں یہ بات بھی ملتی ہے کہ جس زمانہ میں کفار کے مطالبہ پر آنحضرت ﷺ نے اپنی انگشتِ مبارک سے چاند کی جانب اشارہ فرما کر اس کے دو ٹکڑے کر دیے تھے اور مکہ کے مشرکین نے کھلے آنکھوں اس کا مشاہدہ کیا تھا، یہ عظیم معجزہ ہندوستان میں بھی نظر آیا اور مالا بار کے راجہ نے اس کا نظارہ کیا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔

غرض یہ کہ ان حقائق کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلام کا رشتہ اس ملک کی سرزمین سے بہت گہرا ہے، اسلام کے بغیر اس ملک کی تعمیر و ترقی ادھوری اور نامکمل ہے، جو فرقہ پرست طاقتیں اور تحریکیں "بھارتیہ کرن" کے نام پر اور "قومی دھارے" کے عنوان سے اس ملک کی سب سے اقلیت مسلمانوں کو "دیس نکالا" کرنا چاہتے ہیں وہ دراصل اپنے ہی ملک کے عظیم سرمایہ اور قابل فخر ورثہ سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔

روزنامہ منصف، یکم مارچ ۲۰۰۲ء

ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا آغاز

ہندوستان میں ظہورِ اسلام اور مسلمانوں کی آمد کی تاریخ بہت قدیم اور پرانی ہے، خلفاء اسلام اور سلاطین اسلام کی طرف سے اس ملک میں جنگی کاروائیوں سے بہت پہلے ہی یہاں کے باشندوں اور عربوں کے درمیان سمندری راستے سے تجارتی تعلق وروابط ہو گئے تھے، اسلام کو گلے لگانے کے بعد عربوں کے لیے پہلے سے قائم یہ قدیم تجارتی تعلقات اسلام کی دعوت واشاعت کا بہترین ذریعہ ثابت ہوئے، عرب تاجروں کے داعیانہ کردار اوران کے اعلیٰ اخلاق واطوار کی وجہ سے یہاں کے باشندوں نے بہت تیزی اورآسانی سے اسلام قبول کیا، اس طرح رفتہ رفتہ، دھیرے دھیرے اسلام کی روشنی پھیلتی اور بڑھتی رہی، اورایمان کی دولت بٹتی رہی، یہاں تک کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ کے زمانۂ خلافت میں یہاں اسلامی فتوحات کا آغاز ہوا، اس کی تفصیل یوں ہے:

۱) ۱۵ھ مطابق ۶۳۶ء یہ فاروقی خلافت کا زمانہ ہے، اس میں حکم بن عاص ثقفی نے بحرین وعمان کے گورنر عثمان کے اشارہ سے تھانہ بندرگاہ پر حملہ کیا، یہ بندرگاہ گجرات اورکوکن ممبئی کی سرحد پر واقع ہے، یہ عربوں کا گجرات بلکہ ہندوستان پر پہلا حملہ تھا، اسی زمانہ میں مغیرہ بن عاص ثقفی کی قیادت میں سندھ کے مشہور شہر دیبل پر حملہ ہوا۔

۲) ۲۳ھ مطابق ۶۳۶ء یہ بھی عہدِ فاروقی ہے، اس زمانہ میں حکم بن عمر تغلبی کی سپہ سالاری میں مران (بلوچستان) اورسندھ کی فوجوں سے مقابلہ آرائی ہوئی اوراس جنگ میں مسلمان فتح یاب ہوئے، اس جنگ کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ طرف سے اجازت نہ ہونے کی وجہ سے مزید پیش قدمی نہ کی جاسکی، ہندوستان پر خشکی راستہ سے مسلمانوں کا یہ پہلا کامیاب حملہ تھا، گویا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ ہی میں ہندوستان میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

۳) حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں حکیم بن جبلہ سرکاری طور پر ہندوستان

آئے اور تحقیقات کے بعد واپس چلے گئے۔

۴) ۳۵ھ تا ۴۰ھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ ہے، اس میں عبد الرحمن جرد طائی، ربعی بن کاس عنبری اور زیاد وغیرہ مختلف اصحاب جنگی کاروائیوں کے سلسلہ میں ہندوستان آئے۔

۵) ۴۴ھ مطابق ۶۶۴ء یہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کا عہدِ خلافت ہے، آپؓ کے زمانہ میں سرحدی علاقوں کی نگرانی اور ان کے انتظامات کا ایک مستقل عہدہ تھا، سندھ اور سرحد کے بعض مفتوحہ علاقوں کی نگرانی و بندوبست کے لیے مہلب نامی ایک شخص اس زمانہ میں آئے، ان کے بعد ان انتظامات کے عہدہ پر مختلف لوگ یہاں آتے رہے۔

۶) ۸۶ھ مطابق ۷۰۵ء سلطنتِ بنی امیہ کے بادشاہ ولید بن عبد الملک کا زمانہ ہے، اس دور میں اسلامی حکومت ایشیاء، یورپ اور افریقی ممالک تک پھیل چکی تھی، دوسرے ممالک کے بادشاہ اور سربراہانِ سلطنت اس وقت اسلامی مملکت سے خوشگوار اور دوستانہ تعلقات کے خواہش مند تھے، وہ ہدایا و تحائف کے ذریعہ اپنی دوستی کا اظہار کرتے تھے، ان حکومتوں میں لنکا بھی شامل تھا، وہاں کا راجہ خلیفۂ وقت سے اپنے سیاسی و اخلاقی روابط بڑھانے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا، چنانچہ لنکا میں جو عرب تاجر سکونت پذیر تھے، ان میں سے ایک کا انتقال ہوگیا، وہاں کے راجہ نے اس عرب تاجر کے اہل وعیال کو مکمل سہولیات کے ساتھ مع تحائف جہاز میں سوار کرا کر والیٔ عراق حجاج بن یوسف ثقفی کے یہاں روانہ کر دیا، لیکن بدقسمتی سے راستہ میں اس جہاز کو سمندری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا، جہاز میں سوار قبیلہ ربوع کی ایک خاتون نے پرسوز انداز میں حجاج بن یوسف سے فریادرسی کی، حجاج باوجود اپنے ظلم وجور کے اس وقت غصہ سے بے تاب ہوگیا اور فوراً سندھ راجہ داہر کو خط لکھ کر جہاز مع ساز وسامان اور مسافرین کی بحفاظت واپسی کا مطالبہ کیا، راجہ داہر نے اس خط کا معقول جواب نہیں دیا، تب حجاج نے سندھ پر لشکر کشی کا فیصلہ کیا، لیکن اس کی جانب سے بھیجے گئے لشکر کو ۲؍مرتبہ ناکامی ہوئی، تیسری دفعہ اس نے تاریخ کے سب سے کم سن فاتح اپنے ۱۷؍سالہ داماد محمد بن قاسمؒ کو مکمل ساز وسامان سے لیس ایک بڑے لشکر کے ساتھ سندھ کی مہم پر روانہ کیا، محمد بن قاسمؒ ۷۱۲ء میں سندھ کے مشہور شہر دیبل پر حملہ آور

ہوئے اور راجہ داہر اور اس کی اتحادی فوجوں کو سخت معرکہ آرائی کے بعد شکستِ فاش دی، مگر افسوس کہ بنوامیہ کی داخلی چپقلش، اندرونی کشمکش اور خاندانی ریشہ دوانیوں نے اس ابھرتے ہوئے عظیم سپہ سالار کے ہمالیائی عزائم کو وقت سے پہلے سپردِ خاک کر دیا۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: تاریخ سندھ مؤلف ابوظفر ندوی) سندھ پر محمد بن قاسمؒ کا یہ حملہ عربوں کی جانب سے ہندوستان پر پہلی بڑی جنگی کارروائی تھی، اس کے بعد وقفہ وقفہ سے مبلغینِ اسلام، اولیاءِ عظام، صوفیاءِ کرام اور جنگی سپہ سالار آتے رہے، یہاں تک کہ یہ ملک آگے چل کر مسلم ملک میں تبدیل ہو گیا۔

یہ بات کہ مسلمان اس ملک میں صرف حملہ آور کی حیثیت سے داخل ہوئے اتنی ہی غلط ہے جتنا یہ کہ وہ اس ملک میں فتوحاتِ غزنوی کے بعد آباد ہوئے، حقیقت یہ ہے کہ مسلمان سراندیپ، مالدیپ، لکشادیپ، مالابار اور کوکن وغیرہ ساحلی علاقوں میں ان بیرونی حملوں سے پہلے ہی پہلی صدی ہجری مطابق ساتویں صدی عیسوی سے آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور ان علاقوں کے راجہ مہاراجاؤں نے ان کے اخلاق وعادات اور سیرت وکردار سے متاثر ہو کر انہیں بہت ساری مراعات وسہولیات فراہم کر رکھی تھیں۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: عرب وہند تعلقات) ان ابتدائی مسلمانوں کی رَواداری، امانت ودیانت داری، راست بازی، خوش اخلاقی چھوت چھات اور اونچ نیچ سے پاک سماجی زندگی اور ان کے بلند اخلاقی اوصاف کو دیکھ کر یہاں کے باشندوں کی بڑی اکثریت نے سماجی ظلم وستم اور مذہبی تنگ دامانیوں سے نکل کر اسلام کے ہمہ گیر دامنِ رحمت وآغوشِ محبت میں پناہ لی، کیوں کہ اسلام کے بعد مسلمانوں کی حیثیت تاجر سے بڑھ کر داعی اور مبلغ کی ہو گئی۔

ہندوستان پر مسلمانوں کے حملے خواہ مخواہ کی غیر ضروری دل لگی اور شوق ومستی کی بناء پر نہیں تھے، بلکہ اس ملک میں غیر اسلامی فرقے باطنیہ، قرامطہ وغیرہ کا باغی بن کر پناہ گزیں ہونا اور یہاں کے حکمرانوں کی جانب سے سرحدی معاہدوں کی مخالفت ان حملوں کے اسباب میں سے اہم سبب تھے، لہٰذا اسلامی مملکت کے تحفظ وسلامتی کی ذمہ دارانہ حیثیت سے جو اقدامات کیے گئے ہیں، وہ اپنی جگہ صحیح اور درست تھے، تاہم بعض خامیوں اور کوتاہیوں سے وہ بھی بری نہ تھے۔

آخر میں یہاں یہ تذکرہ بے جا نہیں ہوگا کہ اس وقت ملک کی خارجہ پالیسی بدلتی جا رہی ہے،

آزادی کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو کے زمانہ میں عالمِ عرب کے بارے میں ملک کی خارجہ پالیسی دوستانہ سلوک، آپسی تعاون اوراعتدال پسندی پر مبنی رہی، ہندوستان فلسطین کے مسئلہ پر اکثر عرب ممالک کی تائید وحمایت کرتا رہا، اسی طرح بعض مرتبہ عرب ممالک بھی اپنے قدیم تجارتی تعلقات کی بناپر مسئلہ کشمیر پر پاکستان کے بجائے ہندوستان کی حمایت کرتے رہے، لیکن ادھر چند سالوں سے خصوصاً کانگریس کے آخری دورِ حکومت میں اسرائیلی سفارت خانہ کے قیام کے بعد ہندوستان کی خارجہ پالیسی بدل گئی ہے، موجودہ حکومت میں ملک کی اسرائیل نواز پالیسی بامِ عروج پر ہے، حکومت کا وزیر اور معمولی افسر اسرائیل کی قدم بوسی کررہا ہے اور ملک میں اپنی مفروضہ دہشت گردی وانتہاپسندی کو کچلنے کے لیے وہاں کی بدنامِ زمانہ تنظیم ''موساد'' کے تعاون اور مدد کی بھیک مانگی جارہی ہے، لیکن کیا یہ حکومت اس پالیسی کے پسِ پردہ مقاصد کے حصول میں کامیاب رہی؟ کاٹھمنڈو طیارہ کیس میں وہ اس کا خمیازہ بھگت چکی ہے، ملک کی یہ اسرائیل نواز خارجہ پالیسی کہاں تک کامیاب اور کس حد تک ناکام؟ کتنی فائدہ منداور کتنی نقصان دہ ہے؟ دیر یاسویر کاواضح ہوجائے گا! فَتَرَبَّصُوْا اِنَّا مَعَکُمْ مُتَرَبِّصُوْنَ۔

..................روزنامہ منصف، یکم مارچ ۲۰۰۲ء..................

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کے یہ گلستاں ہمارا

وہ ادائے دلبری ہو کہ نوائے عاشقانہ
جو دلوں کو فتح کرلے وہی فاتح زمانہ

انصاف کوآواز دوانصاف کہاں ہے؟؟

۶۰/سالہ طویل عرصہ اور صبر آزما انتظار کے بعد شہید بابری مسجد سے متعلق الٰہ بادہائی کورٹ کا حالیہ فیصلہ آیا، فرضی عقیدہ اور دیو مالائی افسانوی کردار کو نہ صرف حقیقت کا روپ اور رنگ دیا گیا بلکہ اس کو ملک کی تاریخ کے انتہائی اہم، متنازعہ اور نازک ترین فیصلہ کی بنیاد بھی بنایا گیا، قانونی اور آئینی حیثیت سے اس فیصلہ کے تعلق سے تنقید وتبصرہ اور تجزیہ کا سلسلہ تاہنوز جاری ہے، گویا مضامین ومقالات کی باڑھ لگ گئی ہے، اس پس منظر میں کچھ اپنے بھی تأثرات پیش خدمت ہیں:

۱) خود قانون دانوں کا مقولہ ہے: ”انصاف میں تاخیر انصاف سے محرومی کے مترادف ہے“ شہید بابری مسجد سے متعلق حالیہ عدالتی فیصلہ اس کی واضح اور نمایاں مثال ہے، مقدمہ کا فیصلہ سنانے کے لیے جو ساٹھ سالہ تاخیر ہوئی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس قضیہ میں جو فریق شروع ہی سے مظلوم رہا وہی اس موقع پر انصاف سے محروم ہوگیا، اس مظلوم فریق کو انصاف کے نظام سے جو کچھ بجا یا بے جا امیدیں اور توقعات تھیں وہ خاک میں مل گئی، انتہائی شرمناک بات اس فیصلہ میں یہ رہی کہ اس سے نہ صرف انصاف سے محرومی ہوئی بلکہ انصاف کی پامالی ہوئی اور یہاں کے ”باوقار اور لائق اعتبار“ عدالتی نظام کی بدنامی بھی الگ سے رہی۔

۲) یہ بھی قانون دانوں کا مقولہ ہے کہ: ”قانون اندھا ہوتا ہے“ مطلب یہ کہ قانون انصاف دلانے میں کسی کی رعایت نہیں کرتا، امیر، غریب، کمزور، طاقتور، فریقین کی کوئی بھی حیثیت قانون کو نظر ہی نہیں آتی، حکمراں اور رعایا قانون کی نظر میں برابر ہیں، انصاف رسانی کے معاملہ میں قانون کسی بھی طرح کے دباؤ اور تناؤ (مثلاً انسانی جذبات، مذہبی خیالات، سماجی حالات، سیاسی رجحانات وغیرہ) کو قبول نہیں کرتا ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ سب کچھ شہید بابری مسجد سے متعلق حالیہ عدالتی فیصلہ میں ہوا ہے؟ شاید ایسا نہیں ہوا یا نہیں کیا گیا، اس لیے کہ بادی النظر میں ایسا لگتا ہے کہ معزز جج صاحبان اپنے

مذہبی خیالات وجذبات کے دباؤ میں آگئے اور اضطراب آمیز حالات کے تناؤ سے وہ بچ نہیں پائے ،اس لیے معزز جج صاحبان فیصلہ کی رولنگ میں عقیدہ اور آستھا کا حوالہ دئے بغیر نہیں رہ سکے، مسلمان جج صاحب صلح حدیبیہ کا سبق پڑھانے لگے اور یہ بھی کہا گیا کہ "یہ وہ فیصلہ ہے جس کو سننے کے لیے عوام کی سانس رُکی ہوئی ہے" اور یہ کہ "یہ وہ جگہ ہے جہاں فرشتے بھی دوڑنے سے ڈرتے ہیں"۔ مسئلہ سانسوں کے رُک جانے کا اور فرشتوں کے ڈر جانے کا نہیں، سوال انصاف کے بے لاگ فیصلہ کا ہے، قانون وانصاف کی تاریخ گواہ ہے کہ جب بے لاگ فیصلے ہوئے تو ظالموں کی سانسیں رکی نہیں اکھڑ گئیں، مظلوموں نے اطمینان کی سانس لی اور چین کی بانسری بجائی، غرض کہ الٰہ بادہائی کورٹ کے فیصلہ میں قانون اندھا نہیں ہوا، اس نے بہت کچھ پیش نظر رکھا، مگر اس کے نتیجہ میں انصاف کو اندھا کردیا گیا، انصاف کے اصولوں اور تقاضوں پر بلڈوزر چلا دیا گیا۔

۳) بعض حضرات اس پہلو سے عدالتی فیصلہ کی تائید اور تعریف کر رہے ہیں کہ فیصلہ آنے کے بعد امن وامان برقرار رہا، کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں آیا، یہاں قابل تعریف نہ فیصلہ ہے اور نہ فیصلہ کرنے والے معزز جج صاحبان ہیں، بلکہ لائق تعریف عام مسلمان ہیں جنھوں نے اپنے خلاف فیصلہ آنے کے باوجود صبر وتحمل کا مظاہرکیا، دانشمندی اور دوراندیشی کا ثبوت دیا، سوچنا چاہیے کہ اگر ٹھیک یہی فیصلہ ہندوفرقہ پرست عناصر کے خلاف ہوتا تو کیا سماج میں ایسا پرامن ماحول رہتا، مشہور اور نامور صحافی جناب کلدیپ نیر لکھتے ہیں:

> "اس میں شک نہیں کہ بابری مسجد رام جنم بھومی تنازع پر فیصلہ کے بعد ہندستان میں امن وسکون کا ماحول قائم رہا ہے، ملک میں کہیں بھی کوئی ناخوش گوار واقعہ پیش نہیں آیا لیکن اس کے لیے مسلم فرقہ قابل تعریف ہے، تصور کیجئے کہ اگر فیصلہ ہندوعناصر کے خلاف ہوجاتا تو کیا ہوتا، کیا وہ خاموش بیٹھے رہتے، فیصلہ پوری طرح ان کے حق میں نہ ہونے پر ان کے تیور فتح مندی کے ہیں، ان کے کسی انداز سے یہ اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے فیصلہ کو سنجیدگی وانکساری سے قبول کیا ہے اور نہ ہی کسی ایسے جذبہ کا اظہار ہورہا

ہے جس سے مسلمانوں کے اندیشوں میں کمی آئے، دونوں فرقوں کے نقطۂ نظر کے درمیان واضح فرق ہے............

تمام مسلم تنظیموں نے کہا ہے کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلہ کو قبول کریں گے اور اسے حتمی تصور کریں گے، لیکن کسی ہندو فریق کی طرف سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا بلکہ ایسی کوئی مبہم یقین دہانی بھی نہیں سننے میں آئی کہ اگر وہ سپریم کورٹ میں ہار گئے تو وہ اس کے فیصلہ کو من وعن قبول کرلیں گے، یہی درحقیقت پورے معاملہ کا خلاصہ ہے، ایک فرقہ جو اقلیت میں ہے یہ کہتا ہے وہ قانون کی بالادستی کو تسلیم کرے گا جب کہ دوسرا فرقہ جو اکثریت میں ایسا کوئی وعدہ نہیں کررہا ہے"

(روزنامہ راشٹریہ سہارا حیدرآباد ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۰ء اداریتی صفحہ)

دوسرے یہ کہ سماج میں امن وامان کی برقراری کی ذمہ داری مقنّنہ پر ہے نہ کہ عدلیہ پر، لیکن حیرت کو بھی حیرت ہے کہ عدلیہ بجائے اپنے فرضِ منصبی کو نباہنے کے مقنّنہ کی ذمہ داری اپنے سرلی، جب کہ خود مقنّنہ (نظم ونسق) نے اضطراب آمیز حالات میں اپنی ذمہ داری محسوس کی اور بیدارمغزی کا ثبوت دیا، نیز یہ بات ہمارے لیے انتہائی اہم اور قابل توجہ ہے کہ امن وامان کی عمارت قانون و انصاف کے ملبہ اور کھنڈر پر نہیں کھڑی کی جاسکتی، امن وامان کے قیام واستحکام کے لیے بنیادیں بھی مضبوط اور مستحکم ہونی چاہیے، ورنہ امن وامان کی کھوکھلی اور بودی عمارت فرقہ واریت کے بھونچال اور زلزلہ سے کبھی بھی زمین دوز ہوسکتی ہے، اس حقیقت کے باوجود بھی اگر کوئی سمجھے اور کہے کہ بھائی! فیصلہ صحیح ہو یا غلط، امن وامان تو برقرار رہا، فتنہ وفساد نہیں ہوا، اس طرح کی سوچ بالکل ایسی ہی ہے جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ "مریض فوت آپریشن کامیاب" یعنی امن وامان تو رہا لیکن انصاف کا گلا گھونٹ دیا گیا، انصاف جو تاخیر کے مرض کا شکار رہنے کی وجہ سے قریب المرگ تھا وہ فوت ہوگیا اور مہینوں پہلے امن و امان کی برقراری کا جو آپریشن شروع کیا گیا وہ کامیاب ہوگیا۔

۴) بہت امیدوں اور اندیشوں کے درمیان یہ فیصلہ آیا، امیدیں تو یہ تھیں کہ حق وانصاف کا

بول بالا ہوگا، انصاف کو شرمندگی اور شرمساری نہیں اٹھانی پڑے گی اور ملک میں قانون کی حکمرانی اور انصاف کی بالا دستی کی نئی تاریخ رقم ہوگی، مگر صد افسوس اس طرح کی تمام امیدوں پر پانی پھر گیا ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو ایک خطرۂ خون نہ نکلا

اور یہ بھی کہ ؎

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کیسے وکیل کریں ، کس سے منصفی چاہیں

اس فیصلہ سے پہلے بھی اندیشے تھے مگر یہ صرف فرقہ وارانہ فسادات کے متعلق رہے، لیکن فیصلہ کے بعد نئے اندیشے پیدا ہوگئے، یہ سوالات ملک کے باشعور اور فکرمند شہریوں کے ذہنوں میں پیدا ہونے لگے کہ کیا ملک میں ہندوتوا کی ذہنیت اور اس کا وائرس اتنا زیادہ پھیل گیا کہ یہاں کا عدالتی نظام بھی اس سے محفوظ نہیں رہا؟ کیا ہمارا جمہوری ملک بتدریج ہندوراشٹر یہ بننے جارہا ہے؟ کیا اس ملک میں ملکیت اراضی کے قوانین تبدیل ہوجائیں گے؟ کیا ملک میں قانون کی حکمرانی کی جگہ فرضی عقیدوں اور دیومالائی کہانیوں کی بالادستی ہوگی؟ ہمارا ملک ہمہ مذہبی ملک ہونے کی وجہ سے یہاں خوش عقیدہ لوگوں کی کمی نہیں، کبھی عین سڑک کے درمیان دیوتا ظاہر ہوجاتے ہیں، کبھی سڑکوں کی توسیع کے موقع پر اپنے ”بھگتوں“ کی جائیدادیں بچانے کے لیے دیوتائیں کھڑے ہوجاتے ہیں اور مذہبی آثار وعلامات قائم کردئے جاتے ہیں کیا ایسی جگہوں پر بھی ملکیت اور قبضہ کا فیصلہ آستھا/عقیدہ کی بنیاد پر ہوگا، غرض یہ کہ ان اندیشوں کے باوجود ایک آخری اور آس صرف سپریم کورٹ سے رہ گئی ہے، خدا کرے کہ یہ آس یاس میں تبدیل نہ ہو۔

۵) فیصلہ کے نام پر عدالتی مفاہمتی فارمولہ منظر عام پر آنے کے بعد بعض دانشور حضرات فرمانے لگے کہ مسلمان بابری مسجد کو بھول جائیں اور ایک نئے مستقبل کی تعمیر کریں، اپنی آئندہ نسلوں کے تعلیمی ومعاشی مسقبل کو تابناک اور روشن بنانے کی فکر کریں۔

بحیثیت مسلمان، ہر مسلمان کو اپنی گرہ میں یہ بات باندھ لینی چاہیے کہ اس کا اور اس کی نسل کا

روشن وتابناک مستقبل مذہبی غیرت وخودداری سے وابستہ ہے، مسلمان اوران کی نسلیں جاہل گنواراور فقیر وکنگال رہ سکتی ہے لیکن اپنے مذہب سے بے نیاز اوراپنے مذہبی شعائر سے دستبردار نہیں ہوسکتی، پھر یہ کہ بابری مسجد کا قضیہ محض مندر مسجد کا مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ملک میں قانون کی حکمرانی، انصاف کی بالادستی اور بالاتری کا ہے، مسلمانوں نے اس ملک کو خونِ جگر سے سینچا ہے، وہ اس ملک کے حصہ دار ہیں کرایہ دار نہیں، اس لیے ان کی کوشش محض بابری مسجد کی بازیابی کے لیے نہیں ہے بلکہ اس ملک میں انصاف کی بالادستی اور برتری کے لیے بھی ہے، نیز مسجد سے دستبرداری کا کوئی شرعی اورقانونی جواز بھی تو نہیں ہے، شرعی اعتبار سے جو جگہ مسجد کے لیے مختص اور متعین ہوگئی اور وہاں نمازیں پڑھی گئیں تو تاقیامت وہ جگہ مسجد ہی باقی رہے گی، یہ بھی تعجب خیز اور حیرت انگیز بات ہے کہ جو عناصر محض فرضی عقیدہ اور دیومالائی فلسفہ پر یقین رکھتے ہیں وہ تو اپنے موقف پر جمے ہوئے اور ڈٹے ہوئے ہیں، اس میں وہ کوئی لچک اور نرمی نہیں چاہتے ہیں، لیکن مسلمان اپنے موقف پر شرعی اور قانونی ٹھوس بنیاد رکھنے کے باوجود ڈانواڈول ہورہے ہیں، پس سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ بابری مسجد کا مقدمہ محض مندر مسجد کا قضیہ نہیں ہے بلکہ ہمارے لیے عزت اور وقار کی جنگ ہے، زورزبردستی اور ضد وہٹ دھرمی سے انصاف وقانون کی بالادستی کا مقابلہ ہے، جب تک یہ جنگ اور یہ مقابلہ آئینی اور دستوری اعتبار سے اپنے آخری انجام کو نہیں پہونچ جاتا، مسلمان بابری مسجد سے ایک انچ بھی دستبردار نہیں ہوسکتے۔

۶) عدالت کا پنچایتی فیصلہ آنے کے بعد بعض قائدین کے بیانات سامنے آئے جس میں فیصلہ کو قبول کر لینے کا مشورہ دیا گیا اور اس فیصلہ کو ’’قابل غور‘‘ سمجھا گیا تا کہ آئندہ نسلیں فرقہ وارانہ فسادات کے خطرہ سے دوچار نہ ہوں۔

امن وامان کا حوالہ دے کر اور آئندہ نسلوں کی دہائی دے کر فیصلہ کی ناانصافی کو ختم نہیں کیا جاسکتا، اس طرح کا مشورہ فرقہ پرستوں کی داداگری کے سامنے گھٹنے ٹیکنے کے مترادف ہے، یہ بالکل اسی طرح کی سودے بازی ہے جو عام طور پر گلی کے لیڈران، پہلوان اپنے فیصلوں میں کرتے ہیں، مثلاً: اگر کسی کمزور غریب آدمی کے بیس ہزار روپے کسی نامی گرامی پہلوان کے ذمہ قابل ادا ہے، گلی کے لیڈران اور پہلوان تصفیہ کرواتے ہیں کہ میاں! پندرہ ہزار روپے رکھ لو باقی کو بھول جاؤ، وہ

جو دادکر رہا ہے اس کو غنیمت سمجھو ورنہ اگر اصرار کرو گے تو اس سے بھی محروم ہو جاؤ گے، اب بے چارہ غریب کمزور شخص کے لیے اس ظالمانہ اور غیر منصفانہ تصفیہ کو قبول کئے بغیر کوئی چارہ نہیں، جو لوگ بابری مسجد سے متعلق حالیہ عدالتی تصفیہ اور مفاہمتی فارمولہ کو قبول کر لینا کا مشورہ دے رہے ہیں وہ شاید ہندوستانی مسلمانوں کو اسی کمزور اور مجبور آدمی کی حیثیت دینا چاہتے ہیں اور اسی حیثیت میں دیکھنا چاہتے ہیں، اہلِ نظر اور ارباب بصیرت اس سے بخوبی آگاہ و باخبر ہیں کہ مسلمان اتنے کمزور نہیں ہیں کہ بدرجۂ مجبوری اس فیصلہ کو ماننے بغیر ان کے لیے کوئی دوسرا راستہ ہی نہ ہو، وہ آج بھی ناانصافی اور محرومی کے اس گئے گذرے دور میں بادشاہ گر کا موقف اور توازن کی قوت رکھتے ہیں۔

یادرکھیے! اگر یہ فیصلہ تسلیم کر لیا جائے تو ہم خود یہ فیصلہ کرنے والے ہوں گے کہ ہم اور ہماری آئندہ نسلیں اس ملک میں دوسرے درجہ کے شہری بننے کے لیے تیار اور آمادہ ہیں! پھر وقت کے بے باک اور منصف مزاج مؤرخ ہمارے اس "جرم عظیم" کو کبھی معاف نہیں کرے گا ہمارا یہ "جرم عظیم" ہماری آئندہ نسلوں اور پشتوں پر "ظلم عظیم" ڈھانے کا ذریعہ ہوگا، غور کیجیے! کیا ملک کی آزادی اور ملک کی تعمیر و ترقی کے لیے ہمارے اسلاف کی قربانیاں اس لیے تھیں کہ ہم ملک میں دوسرے درجہ کے شہری بن کر رہیں؟؟ کیا ان بزرگوں نے پھانسی کے پھندوں کو اس لیے چوما کہ ہم اپنی عزت و وقار کا سودا کر لیں؟ اور آئینی و دستوری اعتبار سے اپنی "خودکشی" کو تسلیم کر لیں؟ **فَخَلَفَ مِنۡ بَعۡدِهِمۡ خَلۡفٌ وَّرِثُوا الۡكِتَابَ يَاۡخُذُوۡنَ عَرَضَ هٰذَا الۡاَدۡنٰى**۔

۷) شہید بابری مسجد کے مقدمہ کا آخری حل ملک کی آخری عدالت سپریم کورٹ سے وابستہ ہے جب ہم ۶۰ر سال سے اس مقدمہ کو لڑ رہے ہیں مزید ۶-۷ر سال اور برداشت کرنے میں ہمارے لیے کیا دشوری اور پریشانی ہے، اس لیے ہائی کورٹ کے حالیہ فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل کرنا از حد ضروری ہے، تاکہ طویل قانونی جنگ اپنے آخری منطقی انجام کو پہونچے، اگر خدانخواستہ ہزار بار خدانخواستہ فیصلہ غیر منصفانہ اور غیر عادلانہ ہو تو خاموش رہ جانے میں ہمارے لیے عافیت اور راحت ہے، شاہ بانو کیس کی طرح پارلیمنٹ میں قانون سازی کی کوشش شاید مفید نہیں ہوگی، پھر چوں کہ قانونی اعتبار سے آخری کوشش اور تدبیر ہو چکی ہوگی اس لیے مزید کوئی دینی و ملی ذمہ داری

ہم پر نہیں ہو سکتی اور نہ ہم آئندہ بابری مسجد کے مستقبل کے تعلق سے جوابدہ سمجھیں جائیں گے، فیصلہ خلاف ہونے کی صورت میں بحیثیت امن پسند اور پابند قانون شہری کے اس فیصلہ کو قبول کریں گے لیکن بحیثیت مسلمان ہمارا یہ سمجھنا حق بجانب ہوگا کہ بابری مسجد کا مقدمہ "عدالتِ عالیہ" سے نکل کر احکم الحاکمین کی "عدالتِ الٰہیہ" میں جاچکا ہے، اُسی کا فیصلہ قطعی، حتمی اور آخری فیصلہ ہوگا۔ قرآن مجید کی یہ دعا ورد زبان رہے گی: رَبَّنَا افۡتَحۡ بَيۡنَنَا وَ بَيۡنَ قَوۡمِنَا بِالۡحَقِّ وَ اَنۡتَ خَيۡرُ الۡفَاتِحِيۡنَ۔
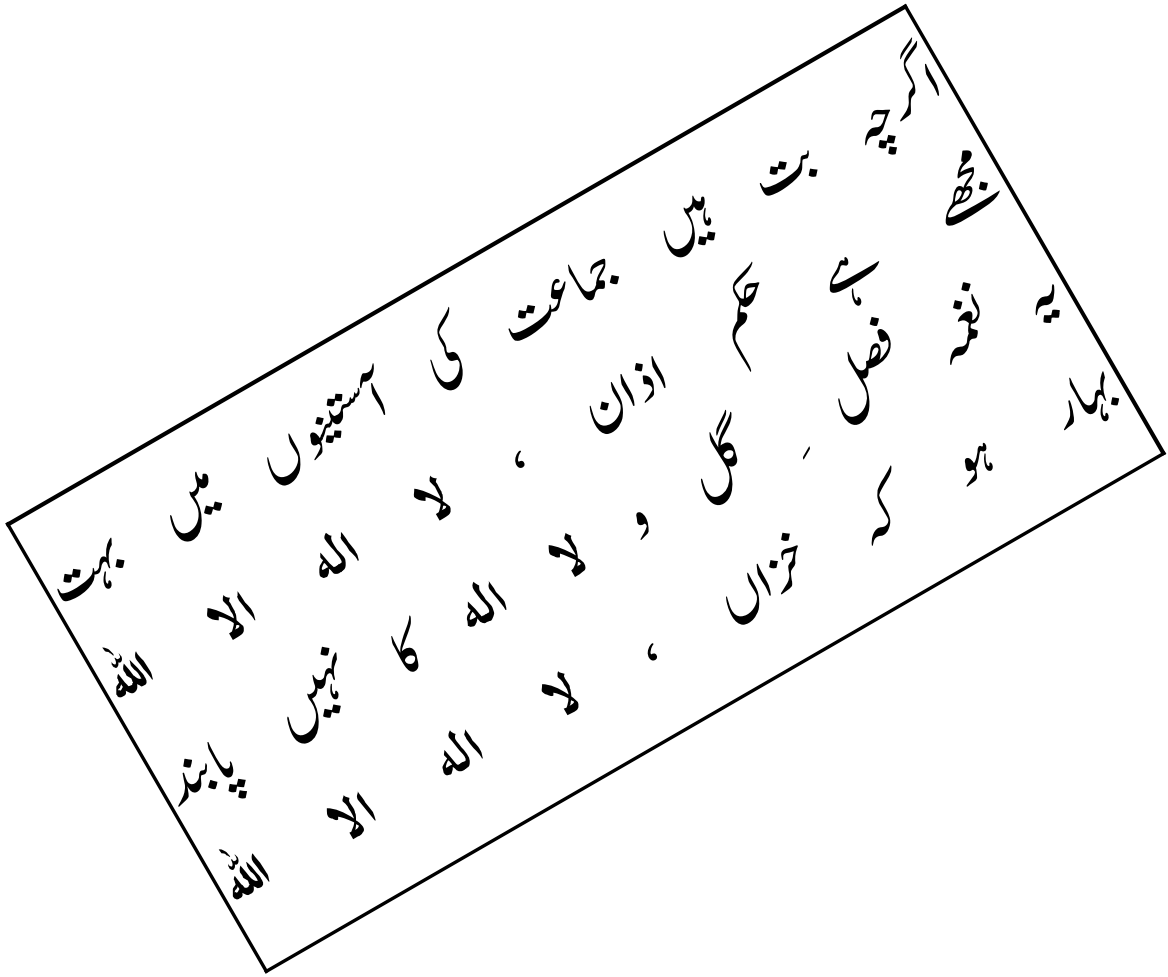
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے؟؟

۲۰۱۴ء کا ہنگامہ خیز الیکشن ختم ہوا، توقع کے مطابق حیرت انگیز ہی نہیں بلکہ دھما کہ خیز اور ملک کی سیکولر عوام کے لئے لرزہ خیز نتائج بھی آ گئے، کامیاب سیاسی پارٹیوں کو اقتدار کا مورچہ سنبھالے ہوئے اچھا خاصا عرصہ ہو چکا ہے، لیکن ملک کے جان بلب جمہوری نظام کے لئے ہلاکت خیز ان نتائج پر تذکروں، تبصروں، جائزوں اور تجزیوں کا سلسلہ تا ہنوز جاری ہے، زیر نظر مضمون بھی اسی کا تسلسل ہے، یہ ایک تاثراتی مضمون ہے، جمہوری ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے بھی ان نتائج پر اظہارِ خیال کیا گیا۔

۱- جمہوری ملک کے ذمہ دار، باخبر اور باشعور شہری ہونے کی حیثیت سے ان نتائج کو ملک کے حق بہتر قرار نہیں دیا جا سکتا، اس لئے کہ یہ ملک نظریاتی طور پر ایک جمہوری ملک ہے، ڈیموکریسی اس کی شناخت اور پہچان ہے، مختلف مذاہب اور تہذیبوں کی رنگا نگی اس ملک کی خوبی اور خوبصورتی ہے، وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت اس ملک کا طرۂ امتیاز، سرمایۂ افتخار و ناز ہے، شاعر مشرق علامہ اقبال کے اس ''گلستان'' میں ہر پھول کو کھلنے اور ہر کلی کو مہکنے کی اجازت ہے، آزادی وطن کی لڑائی ملک کو ''مذہبی اسٹیٹ'' بنانے کے لئے نہیں لڑی گئی، آزادی کے بعد جنہیں اپنے خاص مذہبی نظام اور تہذیبی کلچر کے تحت زندگی گذارنے پر اصرار تھا انہوں نے اس ملک کے حصے بخرے کر لیے، اس کے نتیجہ میں مسلم ملک پاکستان اور ہندو ملک نیپال و سری لنکا وجود میں آئے، لیکن جن لوگوں نے ایک جمہوری نظام حکومت کے تحت زندگی گذارنا قبول کیا، نامساعد حالات اور ناموافق ماحول کے باوجود انھوں نے اس ملک میں رہنے اور بسنے کو ترجیح دی۔

سوال یہ ہے کہ حالیہ نتائج کے بعد ملک کی نظریاتی حیثیت و شناخت ڈیموکریسی کیا عملاً (صرف

دستوری نہیں) باقی رہے گی ؟ کیا ہندوستان ، ہندو مذہبی اسٹیٹ اور ''ہندوراشٹرا'' بننے کے ایک فیصلہ کن مرحلہ میں داخل ہوگیا ؟ کیا اب اس ''گلستان'' میں صرف کمل کے پھول کھلنے اور مہکنے کی اجازت ہوگی ؟ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات ہیں جن کو لے کر صرف مسلمان اور دوسری مذہبی اقلیتیں نہیں بلکہ سیکولر اور انصاف پسند شہری ملک کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہیں ، پھر یہ کہ یہ سوالات صرف ''اندیشہ ہائے دور دراز'' بھی نہیں ہیں ، بلکہ جن بنیادوں پر یہ الیکشن لڑا گیا اور جیت کے بعد وزیر اعظم نریندر مودی کے جو رنگ ڈھنگ سامنے آئے ہیں ، اس کی وجہ سے بجا طور یہ سوالات ملک کے جمہوری نظام کی بقا کے لئے خطرات کو جنم دیتے ہیں اور ان سے اندیشوں کو تقویت ملتی ہے۔

الیکشن میں ملک موجودہ برسر اقتدار ہندوتوا نظریہ کی حامل پارٹی نے واضح اور غیر مبہم انداز میں اپنے انتخابی منشور میں رام مندر کی تعمیر کرنے اور یکساں سول کوڈ لانے کا اعلان کیا ، اسی طرح وزیر اعظم کا ایک مذہبی مقام سے الیکشن لڑنا ، مذہبی لب ولہجہ میں انتخابی تقریریں کرنا ، بار بار کہنا کہ ''گنگا ماتا'' نے مجھے یہاں بلایا ہے ، پھر جیت کے بعد گنگا میں آرتی اتارنا اور پارلیمنٹ کی سیڑھیوں پر سر رکھنا ، یہ سب باتیں کس چیز کی غماز ہیں؟ یہ باتیں موجودہ حکومت کے آئندہ اقدامات اور کاروائیوں کا سگنل ہے کہ ملک کی ہمہ رخی —— سیاسی ، سماجی ، تعلیمی ، داخلی ، خارجی —— پالیسیاں کس رخ اور سمت پر جانے والی ہیں؟ ہمارے خیال میں ملک کی تاریخ میں ایسا پہلی مرتبہ ہوا ہے کہ کسی وزیر اعظم نے عوامی سطح پر اتنا کھل کر اپنی مذہبی شناخت کا اظہار کیا ہے ، یوں تو دیگر وزرائے اعظم بھی اپنے مذہبی عقائد ونظریات میں مضبوط و پختہ تھے اور وہ ان پر پوری طرح کاربند تھے ، لیکن انھوں نے اپنی مذہبی امیج کو ملک کے جمہوری قدروں کے پیش نظر عوامی اور سیاسی زندگی میں نہیں ابھارا بلکہ اپنی نجی اور ذاتی زندگی تک محدود رکھا ، اگر وزیر اعظم عام ہندو نظریات کے حامل ہوتے تو پھر بھی کوئی بات نہیں تھی ، اس لئے کہ ہمارے ملک میں جمہوریت کا مطلب ''لا مذہبیت'' نہیں ، ہمہ مذہبی ہے ، یہاں پر ہر شخص جمہوری اقدار کا پابند رہ کر اپنی مذہبی امیج کا اظہار کر سکتا ہے ، لیکن بعض مرتبہ نظریات کی شدت اور فسطائیت عام اور سادہ مذہبی روایات ورسوم کو گنجلک ، پیچیدہ اور مشکوک بنا دیتی ہے ، کٹر ہندوتوا نظریہ کی وجہ سے ایسا ہی کچھ معاملہ ملک کے وزیر اعظم کا بھی ہے۔

۲- حالیہ الیکشن میں ہندوفرقہ پرست فسطائی تنظیم آر یس یس کا انتہائی اہم اور بنیادی رول رہا، اس حقیقت سے تو کوئی باخبر بے خبر نہیں ہے کہ برسر اقتدار پارٹی اس تنظیم کا سیاسی بازو ہے، ہر الیکشن میں تنظیمی ضرورت اور تقاضہ کے مطابق اس کا تعاون ہمیشہ رہا، مگر اس مرتبہ تنظیم نے بہت ہی طاقت ور اور جارحانہ انداز میں نتائج کے حصول کے لئے اپنی پوری دانائی اور توانائی جھونک دی، ہمیں تنظیم کے اس کردار پر کوئی حیرت وتعجب نہیں ہے، اس لئے کہ یہ دنیا دار العمل ہے، عمل اچھا ہو یا برا، اس کا نتیجہ ضرور ظاہر ہوتا ہے، ضابطہ بھی ہے،''**من جدو جد**'' جس نے کوشش کی اس نے پایا، جس تنظیم کی بنیاد ہی جمہویت مخالف ہو، اس سے جمہوریت کے فروغ واستحکام کی امید رکھنا''نیم کے درخت سے امرود پانے'' کے مترادف ہے، تعجب اور حیرت تو ہمیں اپنے آپ پر ہونا چاہئے کہ سب کچھ جانتے بوجھتے ہم عمل کا جواب بے عملی سے اور کارکردگی کا جواب کاہلی سے دیتے ہیں، شکوہ وشکایت اور حالات کا ماتم ومرثیہ ہمارا شیوہ اور شعار بن چکا ہے۔

یہ حقیقت بھی ذہن نشین ہونی چاہئے کہ''کمزور مخالفت دشمن کو ہمیشہ طاقتور بنادیتی ہے'' کانگریس کے بشمول دیگر سیکولر کہلانے والی پارٹیوں نے بہت ہی نیم دلی اور سرد مہری کے ساتھ اور غلط حکمتِ عملی کے تحت کٹر ہندتوا نظریہ کا مقابلہ کیا، اس کے نتیجہ میں فرقہ پرستی کا سانپ اژدھا بن گیا، الیکشن میں اصل مسئلہ نظریات سے زیادہ مفادات اور ووٹ بینک کا رہا، کسی کے سامنے اکثریتی ووٹ بینک رہا تو کسی کے سامنے اقلیتی ووٹ بینک رہا، اس کے نتیجہ میں نظریاتی جنگ پس منظر میں چلی گئی اور نرم ہندتوا کے مقابلہ میں گرم ہندتوا کی جیت ہوگئی، اگرچہ سیاسی تجزیہ نگاروں کے مطابق مہنگائی اور کرپشن کی وجہ سے ملک کی عوام سابق حکمران پارٹی سے انتہائی متنفر اور بے زار ہوگئی تھی، اس بے زارگی اور نفرت کی لہر نے بھی اپنا کام کیا، لیکن اس کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اس بار فرقہ پرستی کی سوچ اور ذہنیت مکمل نہ سہی بڑی حد تک نتائج پر اثر انداز ہوئی، اس وقت پوری دنیا میں مذہبی افکار اور تہذیبی اقدار کا بڑا جوش وخروش ہے، مذہبی بیداری کا عام ماحول بنا ہوا ہے، چنانچہ کہیں پردہ وحجاب کو مسئلہ بنایا گیا ہے، تو کہیں سکھوں کی پگڑی پر مباحثہ ہورہا ہے، کہیں آذاں کی آواز اور مساجد کے میناروں پر پابندی لگانے کی بات کی جارہی ہے ہر فریق اپنے فریق

مخالف کے خلاف سیاسی اور فوجی کارروائیوں میں مذہبی جذبات اور نظریات کا حوالہ دے رہا ہے، اس لئے شاید یہ کہنا بے جا اور غلط نہ ہوگا کہ آج کے دور میں ''فرقہ پرستی'' انسان کی فطری اور نیچرل ضرورت بن گئی، ہر انسان کو اپنے مذہب سے اور اپنی کمیونٹی سے فطری محبت وہمدردی ہوتی ہے، پس جن لوگوں نے ہندتوا نظریہ کی بنیاد پر بی جے پی کو ووٹ دیا ہے، ضرور انہیں اس کا حق تھا، لیکن ان سے ملک کی سیکولر عوام کا یہ سوال بالکل بجا ہے کہ کیا ایسی فرقہ پرستی سماج کی تعمیر اور ترقی کے لئے مفید ومؤثر ہوگی جو دوسرے فرقوں کو ان کے مذہبی روایات اور تہذیبی خصوصیات کے ساتھ زندگی گذارنے کے حق سے محروم کردے؟ فرقہ پرستی بجائے خود قابل اعتراض نہیں مگر جب یہ فرقہ پرستی دوسرے شہریوں کو باعزت اور باوقار طریقہ اپنے مذہبی وملی تشخص کے ساتھ جینے کا حق نہیں دیتی تو پھر یہ قابل اعتراض ہی نہیں بلکہ قابلِ رد ہوجاتی ہے۔

۳- ملک میں جمہوریت کی موجودہ حالت خود ملک کی نظریاتی شناخت کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے؟ کہنے کو تو ہمارا ملک جمہوری ملک ہے، یہاں عوام کو اپنے عقیدہ ونظریہ کے مطابق مذہبی سرگرمیاں چلانے اور مذہبی عبادات وروایات کو بجالانے کی اجازت ہے، لیکن بذات خود حکومت کا کوئی مذہب نہیں ہوگا، اس کے باوجود ہندو عقیدہ اور کلچر سرکاری پروگراموں اور منصوبوں پر پوری طرح اثر انداز ہورہا ہے، ہندو رسوم وروایات کے مطابق حکومت کے پروگرامس کا آغاز ہوتا ہے، مہورت اور شبہ گھڑی کے مطابق حلف اٹھایا جاتا ہے، ہندو فلسفہ ''واستو'' کے تحت بنی بنائی، خوبصورت، شاندار اور عالی شان وسیع عمارتوں کی توڑ پھوڑ ہوتی ہے، سوچنا چاہیئے کہ اس توڑ پھوڑ کے ذریعہ کثیر عوامی سرمایہ ضائع ہوتا ہے، جو ٹیکس کی شکل میں عوام حکومت کو ادا کرتی ہے، ٹیکس دینے والی ساری عوام ہندو مذہب پر تو یقین نہیں رکھتی، پھر اس سرمایہ کو ضائع کرنے کا کیا جواز ہے؟ چند مہینوں پہلے سکّوں پر ہندو دیوی دیوتاؤں کی تصویریں اتاری گئیں، پھر سیکولر عوام کی گہری تشویش کے اظہار اور احتجاج کے بعد ان سکّوں کو ہٹالیا گیا، اسی طرح سرکاری محکموں میں جہاں بھی آپ چلے جائیں، باب الداخلہ پر، استقبالیہ پر اور کونٹر پر ہر جگہ آپ کو مورتی یا مورتی کی تصویر نظر آئے گی، جس سے آپ کو یہ احساس ہوگا کہ آپ ایک جمہوری ملک کے نہیں بلکہ ایک ہندو ملک کے شہری ہیں۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ ''تحفظ جمہوریت'' کے عنوان سے فرقہ پرستی کی لہر کو روکنے کی جو کوششیں کی گئیں یا جو تحریک چلائی گئی وہ بے مقصد اور بے معنی ہو کر رہ گئی، اس لئے کہ حفاظت کسی موجودہ چیز کی ہوتی ہے، جس کا وجود ہی مشکوک و مبہم ہے اس کا تحفظ کیا معنی رکھتا ہے؟ سوال ''جمہوریت تھی'' کا نہیں ہے، سوال اب کا ہے کہ ''جمہوریت ہے کہاں''؟ اس لئے جمہوریت کی نئی تشریح کی ضرورت ہے، جمہوریت کی موجودہ حالت کو دیکھ کر ہمیں بہت زیادہ خوش فہمی نہیں ہونی چاہئے، اس لئے کہ جمہوریت صرف چند مذہبی آزادیوں کا نام نہیں ہے، اصل مسئلہ پالیسیوں کا ہے، تعلیمی پالیسی، خارجہ پالیسی اور داخلی سلامتی پالیسی وغیرہ، ملک کے حکمران ان پالیسیوں کو بنانے اور طے کرتے وقت مختلف مذہبی برادریوں کے جذبات واحساسات کو کہاں تک ملحوظ رکھتے ہیں؟ اقتدار چاہے دائیں بازو کا ہو یا بائیں بازو کا، ہر ایک کے دورِ حکومت میں ملک کی تعلیمی اور ثقافتی پالیسیوں کو ایک خاص رنگ میں رنگے جانے کی پوری کوشش کی گئی، نصابِ تعلیم اور ثقافتی پروگراموں میں ایک خاص مذہب کو نمائندگی دی گئی اور ایک مخصوص نظریہ کی ترجمانی کی جاتی رہی، اس طرح ملک کے جمہوری نظام کا بھارتیہ کرن کرنے اور اس پر بھگوا رنگ چڑھانے کا ایک تسلسل ہے، اس طرح سے غیر معلنہ طور پر یہاں کی رہی سہی اور بچی کھچی مذہبی آزادیوں کا سلسلہ ختم اور ان کا دائرہ کم کیا جارہا ہے، ایسی جمہوریت اور اس کے حوالہ سے یہاں کی مذہبی آزادی سے متعلق قوانین کے پس منظر دیگر مذہبی اقلیتوں کو شاید کچھ احساس ہو یا نہ ہو لیکن مسلمانوں کو علامہ اقبالؒ کا یہ شعر ضرور یاد آتا ہے ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدہ کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اور علامہ ہی کا یہ شعر بھی ذہن میں گونجتا ہے ؎

ہے مملکت ہند میں ایک طرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس ، مسلمان ہے آزاد

۴- ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں ان نتائج سے ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں، اس لئے کہ ہماری تاریخ میں منفی نتائج ایمانی قوت کی ترقی اور یقین کی پختگی ذریعہ بنے، قرآن مجید میں

غزوۂ اُحد کا تذکرہ ہے، اس غزوہ میں ایک نادانستہ غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کی فتح شکست میں تبدیل ہوگئی، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دندانِ مبارک اس غزوہ میں شہید ہوئے، 70 صحابہ کرامؓ نے جامِ شہادت نوش فرمایا، سید الشہداء حضرت امیر حمزہؓ کی المناک شہادت اسی غزوہ میں ہوئی، غرض یہ کہ مسلمان اس غزوہ میں صرف شکست خوردہ ہی نہیں بلکہ نہایت غم زدہ اور زخم خوردہ بھی تھے، عین اسی حالت میں اطلاع ملتی ہے کہ دشمنانِ اسلام کا ایک نیا لشکر حملہ کرنے کے لئے پھر اکھٹا ہو رہا ہے، اس موقع پر اسلامی فوج کے کمانڈر انِ چیف حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کو کوچ کرنے کا حکم فرمایا، صحابہ کرام اس کے لئے بالکل تیار اور آمادہ ہوگئے، میدانِ جنگ کی شکست سے ان کے عزائم وحوصلوں کی شکست نہیں ہوئی، قرآن مجید میں صحابہ کرام کے اس عمل کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا:

الَّذِيْنَ اسْتَجَابُواْ لِلهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ أَحْسَنُواْ مِنْهُمْ وَاتَّقَواْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ، الَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُواْ لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيْمَاناً وَقَالُواْ حَسْبُنَا اللهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔

وہ لوگ جنہوں نے (غزوۂ احد میں شکست کا) زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار کا فرماں برداری سے جواب دیا، ایسے نیک اور متقی لوگوں کے لئے زبردست اجر ہے، وہ لوگ جن سے کہنے والوں نے کہا تھا کہ: ''یہ (مکہ کے کافر) لوگ تمہارے (مقابلے) کے لئے (پھر سے) جمع ہورہے ہیں، لہٰذا ان سے ڈرتے رہنا'' تو اس (خبر) نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کردیا اور وہ بول اٹھے کہ: ''ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے''۔ (ال عمران: ۱۷۲، ۱۷۳/ توضیح القرآن از جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی)

ہندوستان میں مسلمانوں کی حالتِ زار بہت واضح ہے، مختلف حکمرانوں نے اپنے دورِ حکومت

میں انہیں سیاسی، معاشی اور تعلیمی ہر طرح کی پسماندگی کا داغ اور دکھ دیا، وہ ایک طویل عرصہ تک ملک کی نام نہاد سیکولر پارٹیوں کی ''نرم ہندتوا'' کی پالیسی کا زخم سہتے رہے، اب انہیں ''گرم ہندتوا'' کا نیا اور گہرا زخم لگا ہے، لیکن جس ملت کی تاریخ زخموں سے چور چور اور لہولہاں ہو تو اس کو اس زخم کا کیا غم ہے، اس لئے ان نتائج پر اپنے سلف صالحین کی پیروی میں قرآن مجید کی یہی آیت ہماری زبانوں پر ہوگی کہ ''حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ'' اس ملک میں ہمارے بزرگوں نے ہمیں جس حوصلہ و ہمت سے رہنا سکھایا ہے، آج موجودہ حالات میں اسی حوصلہ و ہمت کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہے، یہاں ''وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان'' کے مصداق مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی حوصلہ افزا تحریر کا ایک اقتباس نقل کرنا بے موقع اور بے محل نہیں ہوگا، حضرت مولانا ندویؒ فرماتے ہیں:

> ''ہم مسلمانوں نے پورے عزم کے ساتھ سوچ سمجھ کر اپنے وطن ہندوستان میں رہنے کا فیصلہ کیا ہے ہمارے اس فیصلہ کو ارادۂ الٰہی کے سوا کوئی طاقت نہیں بدل سکتی، ہمارا یہ فیصلہ کسی کم ہمتی، مجبوری یا بے چارگی پر مبنی نہیں، ہم نے سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے...... ہمارا دوسرا فیصلہ یہ ہے کہ (جو اپنے عزم اور قطعیت میں پہلے فیصلہ سے کسی طرح کم اور غیر اہم نہیں) کہ ہم اس ملک میں اپنے پورے عقائد، دینی شعائر، قانون شریعت اور اپنی پوری مذہبی وتہذیبی خصوصیات کے ساتھ رہیں گے، ہم ان کے کسی ایک نقطہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں، اس ملک کے باشندے کی حیثیت سے ہمیں یہاں آزادی اور عزت کے ساتھ رہنے کا پورا حق حاصل ہے، یہ اس ملک کی جمہوریت اور دستور وآئین کا بھی فیصلہ ہے، ہم اس ملک میں آزاد ہیں اس کی تعمیر وترقی اور دستور سازی میں شریک ہیں، اس لئے اس کے ساتھ زندگی گذارنا ہر شخص کا فطری انسانی، اخلاقی، اور قانونی حق ہے، اور اس حق کو جب بھی چھیننے کی کوشش کی گئی تو اس کے ہمیشہ سنگین نتائج نکلنے''

(عہد ساز شخصیت از مولانا رابع حسینی ندوی، ص: ۲۳۴-۲۳۳)

۵- فرقہ پرست پارٹی کی کامیابی سے بعض ریاستی حکومتوں میں ''سائیڈ ایفکٹ'' ہوگیا اور غالباً آئندہ بھی اس کے امکانات ہیں، لیکن اگر غور کیا جائے تو یہ کامیابی خود مسلمانوں کے لئے بھی ''سائیڈ ایفکٹ'' ہوسکتی ہے، یہاں ''سائیڈ ایفکٹ'' کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان بہت سختی کے ساتھ اپنے شرعی احکام پر عمل پیرا ہوں گے اور وہ اپنے مذہبی شعائر کے بارے میں پہلے سے زیادہ حساس و غیرت مند ہوں گے، 9/11 کے منصوبہ بند واقعہ کے بعد منظم انداز میں مسلمانوں کی مذہبی شناخت اور ملی تشخص کو نشانہ بنایا گیا، مسلمانوں کو خوف زدہ کیا گیا، اس کا ریاکشن اور سائیڈ ایفکٹ یہ ہوا کہ امریکہ و یورپ کے مسلمانوں میں ان کے اندر کا سویا ہوا مسلمان جاگ اٹھا، انھیں اپنی مذہبی شناخت، ملی تشخص کی اہمیت معلوم ہوئی، اس واقعہ سے پہلے مروت و رواداری میں انہیں اپنی مذہبی شناخت پر زیادہ اصرار نہیں ہوا کرتا تھا اور نہ وہ اس کو خاص اہمیت دیتے تھے، لیکن اب یورپ کے مسلمان بہت سختی کے ساتھ اپنے مذہبی شناخت پر عمل پیرا ہیں، اور وہ مذہب سے جذباتی وابستگی رکھتے ہیں، آئے دن اخبارات میں پردہ وحجاب اور حلال گوشت کے سلسلہ میں جو خبریں اور واقعات پڑھنے کو مل رہے ہیں وہ سب اسی نئی پیدا شدہ مذہبی بیداری اور مذہبی غیرت وحمیت کا نتیجہ ہے، ہمارے ملک میں بھی اس کی مثال موجود ہے، گائے کا گوشت کھانا فرض اور واجب نہیں ہے، لیکن اس پر پابندی کی بنیاد ایک مذہبی ہند وعقیدہ ہے، اس لئے مسلمان اس اصرار کرتے ہیں، سوچا جاسکتا ہے کہ اگر یہ پابندی نہ ہوتی تو کیا گائے ذبح کرنے پر مسلمانوں کو اصرار ہوتا تھا؟ جیسے بعض دیگر مذہبی معاملات کو لے کر مسلمانوں میں سختی اور شدت نہیں ہوتی، یہ مسئلہ بھی اسی طرح کا ہوتا، لیکن جیسا کہ محاورہ ہے ''**الانسان حریص فیما منع**'' انسان منع کردہ چیزوں کا ہی زیادہ حریص ہوتا ہے، ایسی ہی نوعیت کچھ اس مسئلہ کی بھی ہے۔

پس اگر موجودہ برسر اقتدار پارٹی کامیابی کے نشہ وغرور میں انتخابی منشور کے ایجنڈہ ''یکساں سول کوڈ'' کو نافذ کرنے کی کوشش کی تو اس کا ریاکشن اور سائیڈ ایفکٹ یہ ہوگا کہ مسلمان اپنے ''پرسنل لاء'' میں بہت مضبوط ہوجائیں گے اور وہ اپنے عائلی وخاندانی مسائل کے حل کے لئے شرعی عدالتوں سے رجوع ہوں گے، اس طرح مسلمانوں میں قانونِ شریعت پر عمل کرنے کا ایک نیا جوش نیا جذبہ

اور حوصلہ پیدا ہوگا، یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمیشہ بے خبری اور بے خوفی اچھی نہیں ہوتی، حالات جب بالکل پرسکون ہو اور ماحول بھی موافق ہو تو آدمی خود اپنے حال میں مست ہو جاتا ہے، اس کو اپنا مقصد زندگی یاد نہیں رہتا، جب خطرہ درپیش ہو تو آدمی بہت ہی محتاط، چوکنا، چوکس اور ہوشیار رہنے لگتا ہے، خطرات اور اندیشے بھی بعض مرتبہ آدمی کو بہت کچھ سکھا دیتے ہیں، اب ہندوتوا خطرہ کے پیشِ نظر مسلمانوں کو بیدار رہنا چاہئے اور بیداری مغزی کا ثبوت دینا ہوگا، سابقہ حکومت میں مسلمانوں کے خلاف حکومت کی پالیسیاں اور اسکیمیں لومڑی کی چال اور کچھوے کی رفتار کی طرح ہوا کرتی تھی، علمائے دین اور دانشورانِ قوم ابھی سوچنے اور سمجھنے کے مرحلہ میں رہتے کہ حکومت اپنا کام کر جاتی، لیکن موجودہ حکومت چوں کہ اپنے خاص نظریہ کی بنیاد پر برسر اقتدار آئی ہے، اس لئے اس کا انداز اور طریقۂ کار الگ ہوگا، حکومت کے منصوبہ اور اقدامات ڈھکے چھپے اور نپے تلے انداز میں نہیں بلکہ کھلے عام ڈنکے کی چوٹ پر ہوں گے، اس لئے اگر ہمیں اس ملک میں اپنی ''مسلمانیت'' باقی رکھنا ہے تو حکومت کے اعلانات اور اقدامات پر گہری نظر رکھی ہوگی، ایسا بھی نہ ہو کہ حکومت کے ہر اقدام کو روایتی مخالفت کی نظر سے دیکھیں، مثبت اور معروضی انداز میں بھی اس پر غور کرنا ہوگا۔

غرض یہ کہ موجودہ نتائج کی وجہ سے اگر مسلمانوں میں اپنی مذہبی شناخت کا گہرا احساس بیدار ہوتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنے ملی تشخص کو باقی رکھنے میں پرعزم اور سرگرم رہتے ہیں، ''**الانسان حریص فیما منع**'' (آدمی منع کردہ چیزوں کا ہی زیادہ حریص ہوا کرتا ہے) کے تحت ہی کیوں نہ ہو اگر وہ ہندوتوا نظریہ کے مخالفانہ جوش میں شرعی اور عائلی قوانین پر عمل پیرا ہوتے ہیں تو پھر یہ منفی نتائج کا مثبت پہلو ہوگا، جیسا کہ مقولہ ہے ؎ خدا شرے برانگیزد کہ خیر مادر آں شد۔

۶- بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ ''مختارِ کل'' اور ''قادر مطلق'' ہیں اس کی ذات علیم وحکیم بھی ہے اور خبیر وبصیر بھی، اللہ تعالیٰ کا اختیار اور اقتدار یہ ہے کہ وہ جس کو چاہے حکومت عطا کرتا ہے، **قل اللّٰھم مالک الملک، توتی الملک من تشاء**، نظامِ عالم کی ہر تبدیلی کے پیچھے اسی کے فرمانروائی کارفرما ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت کے نمونے اور نظارے آئے دن ہم

اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں، کل تک جو صاحب اقتدار تھے آج وہ ''تختہ دار'' پہ ہے، کل تک جن کا پورے ملک میں طوطی بولتا تھا آج ان کی حالت ''یوسف بے کارواں'' کی سی ہے، اور کیفیت یہ ہے کہ ''پھرتے ہیں مئے خوار کوئی پوچھتا نہیں'' کل تک جن حکمرانوں کی آمد درفت پر پولیس اور سیکورٹی گارڈس اپنی سانسیں روکے رہتے تھے، آج وہ پوری بے دردی اور بے مروتی کے ساتھ انہیں جیلوں اور عدالتوں میں حاضر کرتے ہیں **وتلک الایام نداولھابین الناس** ''ہوتا ہے شب وروز تماشا میرے آگے'' اس لئے گذشتہ الیکشن کے نتائج بھی قانونِ قدرت کا حصہ ہے۔

اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے یوں ہوتے ہیں کہ کسی چیز کو ہم اپنی دانست میں بہتر اور اچھی سمجھتے ہیں لیکن انجام کار وہ چیز ہمارے لئے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے اور کسی چیز کو ہم اپنی سوچ کے مطابق اپنے لئے بُری سمجھتے ہیں لیکن نتیجہ کے اعتبار سے وہ چیز ہمارے حق میں نفع بخش اور فائدہ مند ثابت ہوتی ہے، قرآن مجید میں فرمایا گیا: **عَسٰی اَنْ تَکْرَهُوْ شَیْئاً وَهُوَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَعَسٰی اَنْ تُحِبُّوْ شَیْئاً وَهُوَ شَرٌ لَّکُمْ**، حالیہ نتائج میں اللہ تعالیٰ کے فیصلہ کی یہ حکمت ہوسکتی ہے کہ ''ہندتوا'' نظریہ کے نفع ونقصان کا امتحان ہوجائے، اس لئے کہ جب تک کوئی بھی بات محض نظریہ ہی رہتی ہے تو اس کا نفع ونقصان واضح نہیں ہوتا، اس نظریہ والوں کو کہنے کا موقع رہتا ہے کہ اگر عملاً ہمیں اپنا نظریہ نافذ کرنے کا موقع ملتا تو ہم بتاتے کہ اس نظریہ سے انسانی زندگی میں کیا ترقی ہوگی؟ اور سماج کو کیا فائدہ ہوگا؟ اب جب کہ ہندوتوا کی صرف حامی نہیں بلکہ حامل پارٹی کو اقتدار ملا ہے تو دیکھنا اور انتظار کرنا ہوگا کہ یہ نظریہ ملک کی ترقی اور قوم کی خوش حالی کے لئے کتنا فائدہ منداور نفع بخش ثابت ہوگا؟ **قُلْ کُلٌّ مُّتَرَبِّصٌ فَتَرَبَّصُوْا فَسَتَعْلَمُوْنَ مَنْ اَصْحَابُ الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَمَنِ اهْتَدٰی**، پھر یہ کہ جو چیز انسانیت کے لئے بہتر اور نافع ہوگی وہ باقی رہے گی اور جو چیز نقصان دہ ہوگی وہ سمندر کی جھاگ کی طرح ختم ہوجائے گی، **فَاَمَّا الزَّبَدُ فَیَذْهَبُ جُفَاءً وَاَمَّا مَا یَنْفَعُ النَّاسَ فَیَمْکُثُ فِی الْاَرْضِ**۔

۷- قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی شانِ قدرت یہ بھی بیان ہوئی کہ ''**یخرج الحی من المیت ویخرج المیت من الحی**'' یعنی وہ بے جان سے جاندار کو نکالتا ہے اور جاندار سے بے جان کو، اللہ تعالیٰ اس شانِ قدرت میں یہ لطیف نکتہ اور اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کے تکوینی فیصلوں کے تحت

بعض مرتبہ مایوسی اور ناامیدی کے تاریک ماحول میں امید کے دیپ اور چراغ جل اٹھتے ہیں اور امید افزا ماحول میں حوصلہ شکن حالات پیش آتے ہیں، اس لئے حالیہ مایوس کن نتائج میں ہمیں امید کے دیپ اور دیئے جلائے رکھنا ہوگا اور یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ غیر بی جے پی حکومتوں کے امید افزاء ماحول میں جب ہم حوصلہ شکن حالات سے دوچار ہوئے ہیں تو اس فرقہ پرست اور ہندوتوا پارٹی بی جے پی کے دور اقتدار میں ہمارے لئے حالات انشاء اللہ اُمید افزا ہوں گے، پس بات جب تمام تر اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کی ہے تو شاعر اسلام علامہ اقبالؒ کی روح سے بھر پور معذرت اور اس سے زیادہ باحیات ماہرین اقبالیات سے دست بستہ معافی کے ساتھ کہتا ہوں ؎

ہے عیاں یورش "فرقہ پرستی" کے افسانے سے
پاسبان مل گئے مسلمانوں کو" فرقہ پرستوں" کے میخانے سے

اگر اس طرح کی باتیں خالص ہماری حکمت عملی اور منصوبہ بندی کے ضمن میں ہوتی تو یقیناً ان کی حیثیت ''خیالی پلاؤ'' اور ''شیخ چلی کے خواب'' سے زیادہ نہیں ہوتی، لیکن یہ اس قادرِ مطلق اور مختار کل کے فیصلوں کے بارے میں ہے جس کے بارے میں فرمایا گیا ''**القلب بین اصبعی الرحمن**'' دل رحمن کی دو انگلیوں کے درمیان ہے، وہ اس کو جیسا چاہے اور جدھر چاہے پلٹ دیتا ہے، ممکن ہے کہ ذمہ دارنہ حیثیت سے مسلم معاملات اور مسائل سے واسطہ پڑنے پر سوچ وفکر کا زاویہ تبدیل ہو جائے اور ان کے دل بدل جائیں، پھر یہ کہ ایمان صرف ڈرتے رہنے کا نام نہیں ہے اور نہ صرف امیدوں کے سہارے جینے کا نام ہے، ایمان ڈرتے رہنا اور امید کا دامن پکڑے رہنا دونوں کا نام ہے، **الایمان بین الخوف والرجا**، حالیہ نتائج میں ہمیں ڈر اس بات کو لے کر ہے کہ کہیں یہ نتائج ہماری بداعمالیوں کا نتیجہ نہ ہوں، **بما کسبت ایدی الناس** اور **اعمالکم عُمّالکم** کا نمونہ نہ ہوں اور امید یہ ہے کہ یہ نتائج قدرت کے کسی کرشمہ کے ظہور کا مقدمہ اور پیش خیمہ بننے والے ہوں۔

۸- ملک کے وزیر اعظم نے اپنی انتخابی تقریروں میں ایک سے زائد مرتبہ کہا: ''اچھے دن آنے والے ہیں'' اب جب کہ وہ اقتدار پر آچکے ہیں تو ملک کے ہر شہری کو ''اچھے دنوں'' کا انتظار ہے، مگر یہاں ''اچھے دنوں'' کا معیار اور تصور بھی طے ہونا ہے، وزیر اعظم کے لئے اچھے دن صرف یہ

نہیں ہیں کہ وہ وزیر اعظم بن گئے، جس دن ملک کی دوسری بڑی اکثریت کے تعلق سے وزیر اعظم کی سوچ وذہنیت بدلے گی اوران کا طرز عمل تبدیل ہوگا، حقیقی معنوں میں یہ دن وزیر اعظم کے لئے سب سے اچھا دن ہوگا، اسی طرح ''اچھے دن آنے والے ہیں'' کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ معاشی ترقی ہوجائے یا مہنگائی ختم ہوجائے، بلکہ یہ ہے کہ امن وشانتی باقی رہے، مذہبی بھائی چارگی کوفروغ ہو، بلالحاظ مذہب وملت اورذات پات کے ملک کے تمام شہریوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے تعلق سے پیارو پریم کے جذبات ہوں، فرقہ پرستی کے بجائے انسانیت نوازی کا بول بولا ہو۔

اس کے علاوہ ملک میں ''اچھے دن'' لانے کے لئے خود مسلمانوں کوبھی اپنا داعیانہ کردار اچھی طرح ادا کرنے کی ضرورت ہے، الیکشن کے ہنگاموں میں تو برداران وطن کے سامنے ہماری حیثیت ''سیاسی حریف'' اور''معاشی رقیب'' کی سی ہوتی ہے، لیکن اب چوں کہ الیکشن کا ہنگامہ ختم ہو چکا، سب کچھ جدھر کا ادھر ہوگیا تو ہمیں سچی خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ برادرانِ وطن کے ساتھ حریف کے بجائے حلیف اورفریق کے بجائے رفیق بننا ہوگا، ایسے ہی حالات کے پس میں میں مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''یہ وہ نادر موقع ہے کہ مسلمان اپنی زندگی پر نظر ثانی کریں اوراپنی غلط وکمزور حیثیت کوختم کر کے صحیح اور طاقتور حیثیت طے کرلیں اوریوں سمجھیں کہ آج سے ہندوستان میں ان کی اصلی زندگی کا آغاز ہوتا ہے، ان کی حیثیت اب اس ملک میں ایک سیاسی حریف یا معاشی رقیب کی نہیں ہے جس کو اپنی تعداد اورحیثیت کے لحاظ سے خدمت ومناصب کے کچھ مواقع ملنے چاہیں، بلکہ ان کی حیثیت ایک بے لوث داعی کی ہے، جواپنے فوائد ولذائد کے حصول کے لئے نہیں بلکہ نسل آدم کے مفاد کے لئے آیا ہے''
>
> (کتاب ''نشان راہ'' ص ۱۵)۔

ان کا جو کام ہے وہ اہل سیاست جانیں
میرا پیغام محبت ہے جہاں تک پہونچے

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ
أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ
ممتاز عالمِ دین مولانا محمد عبد القوی صاحب کی ناحق گرفتاری

خدایا! کیا لکھوں اور کیسے لکھوں؟؟ عام طور پر جب کسی عنوان پر لکھنا شروع کیا جائے تو بے ساختہ اور برجستہ قلم چل پڑتا ہے، جس کو ''قلم برداشتہ'' لکھنا کہتے ہیں، لیکن جب قلب رنجیدہ ہو، لکھنے والا، دل گرفتہ اور دل شکستہ ہو تو ان جذبات کے سامنے قلم کی حیثیت شکست خوردہ کی ہوتی ہے، یقیناً ہمارا اس پر پختہ یقین اور ایمان ہے کہ دینِ اسلام مرثیہ اور ماتم کا مذہب نہیں ہے، لیکن کیا کیا جائے غم اور تکلیف کا احساس ایک فطری تقاضہ ہے اس کے اظہار کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا، ہم اُس نبی پاک ﷺ کے امتی ہیں، جنھوں نے اپنے فرزند ارجمند حضرت ابراھیمؑ پر اپنے غم کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا ''**وانا بفراقک لمحزون یا ابراھیم**''

ماہنامہ ''اشرف الجرائد'' کے روشن ضمیر مدیر، اسلام کے داعی اور سفیر، آسمانِ خطابت وصحافت کے ماہ منیر، قافلہ سلوک وتصوف کے امیر، طالبانِ تربیت واصلاح کے مخلص مربی ومشیر، مخدومِ گرامی حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب اس وقت جیل میں ہیں، آپ کی گرفتاری پر ہر کوئی بے چین و بے قرار ہے، جذبات کی بے چینی و بے قراری ایسی کہ اُس کے اظہار و بیان میں الفاظ و جملوں کا وسیع تر ذخیرہ اور گوشہ بھی تنگ معلوم ہوتا ہے، یقیناً بعض مرتبہ حالات اور حادثات کچھ اس انداز کے پیش آتے ہیں کہ انتہائی معنیٰ خیز اور مفہوم آفریں الفاظ اور خوبصورت جملے انسانی جذبات واحساسات کا ساتھ چھوڑ دیتے ہیں، اس لئے انسانی جذبات کی لطافت اور نزاکت کو الفاظ و جملوں کے خول میں بند نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب (**فرج اللّٰہ کربتھم**) کی گرفتاری کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ آپ کا تعلق ان علماء ربانیین سے ہے جنہیں اس طرح کے امتحان وآزمائش سے گذرنا پڑا، اسلام کی گذشتہ تاریخ

میں ہم جن علماء ربانیین کا تذکرہ پڑھتے ہیں، کیا یہ تذکرہ جیل اور قید و بند کے واقعات سے خالی ہے؟ کیا حضرت امام احمد بن حنبلؒ، امام مجدد الف ثانیؒ، حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ اور شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سوانح زندگی جیل کے ذکر کے بغیر پوری ہوسکتی ہے؟ یہاں پہونچ کر نبی ﷺ کے اُس ارشاد گرامی پر ہمارا یقین اور بڑھ جاتا ہے جس میں آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**العلماء ورثة الانبیاء**'' دوسرے لوگ تو وراثت میں جائداد اور مال و دولت پاتے ہیں، لیکن انبیاء کے وارثین علماء دین کے حصہ میں تو امتحانات و آزمائشیں ہوتی ہے، جن حالات سے انبیاء کرام کو گذارا جاتا ہے اور جو واقعات وقت کے نبیوں اور پیغمبروں پر پیش آئے ہیں، علماء کرام کے ساتھ بھی پیش آتے ہیں اور آئیں گے، ماضی قریب میں اردو زبان کے ممتاز اور مایۂ ناز خطیب حضرت مولانا عطاء اللہ شاہ بخاریؒ کے بارے میں تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آپؒ کی زندگی آدھی ریل میں گذری اور آدھی جیل میں گذری، خود ایک مرتبہ آپ سے پوچھا گیا کہ زندگی کیسی رہی، فرمایا لوگوں کی ''آہ'' اور ''واہ'' کے نذر ہوئی، جب جیل گیا تو لوگوں نے کہا ''آہ'' اور جب باہر آیا تو کہا ''واہ''۔

انبیاء کرام میں حضرت یوسف علیہ السلام کی ۲؍خصوصیات ہیں ایک آپ علیہ السلام کا حسن و خوبصورتی، دوسرے ''سنتِ یوسفی'' یعنی آپ کا جیل جانا، قرآن مجید میں حضرت یوسف علیہ السلام کے نام سے مستقل سورت ''سورۂ یوسف'' موجود ہے، آپ علیہ السلام کے واقعہ اور قصہ کو سب سے بہترین واقعہ فرمایا گیا، اس واقعہ میں بیان کیا گیا کہ کس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو نا کردہ جرم کے الزام میں جیل میں ڈالا گیا، جیل میں جانے کے بعد بھی حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے پیغمبرانہ مشن کو جاری رکھا، جیل میں جن دو قیدیوں نے آپ علیہ السلام سے خواب کی تعبیر طلب کی، آپ علیہ السلام نے خواب کی تعبیر بتانے سے پہلے انہیں توحید کی دعوت دی، شرک و بت پرستی کی مذمت اُن کے سامنے بیان کی، جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے دعوتی جملے قرآن مجید میں یوں بیان کئے گئے:

يَا صَاحِبَيِ السِّجْنِ أَأَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُونَ خَيْرٌ أَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ اے میرے جیل کے ساتھیو! ذرا سوچ کر بتاؤ کہ عبادت کے واسطے

متفرق معبود اچھے ہیں یا ایک معبودِ برحق جو سب سے زبردست ہے وہ اچھا ہے؟

غرض یہ کہ انبیاء کرام اور ان کے وارثین جہاں بھی رہتے ہیں اپنے مقام اور مشن کو نہیں بھولتے، اپنا فرض منصبی پورا کرتے ہیں، بات جب حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب (فرج اللہ کربتھم) کے جیل جانے سے نکل کر حضرت یوسف علیہ السلام کے جیل کے واقعہ تک جا پہونچی تو مناسب ہوگا کہ ''سنتِ یوسفی'' سے متعلق وہ فضائل اور فوائد بھی بیان کردئے جائیں جس کو بلند پایہ مفسر قرآن حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانیؒ نے اپنی شہرۂ آفاق تفسیر ''معارف القرآن'' میں ذکر فرمایا ہے:

۱- یوسف علیہ السلام جیل میں بھیجے گئے جو مجرموں اور بدمعاشوں کی بستی ہوتی ہے مگر یوسف علیہ السلام نے ان کے ساتھ بھی حسنِ اخلاق، حسنِ معاشرت کا وہ معاملہ کیا جس سے یہ گرویدہ ہوگئے، جس سے معلوم ہوا کہ مصلحین کے لئے لازم ہے کہ مجرموں اور خطا کاروں سے شفقت و ہمدردی کا معاملہ کرکے ان کو اپنے سے مانوس و مربوط کریں، کسی قدم پر منافرت کا اظہار ہونے نہ دیں۔

۲- حق کی دعوت دینے والوں اور اصلاحِ خلق کی خدمت کرنے والوں کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہئے کہ پہلے حسنِ اخلاق اور علمی و عملی کمالات کے ذریعہ خلق اللہ پر اپنا اعتماد قائم کریں، خواہ اس میں کچھ اپنے کمالات کا اظہار بھی کرنا پڑے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام نے اس موقعہ پر اپنا معجزہ بھی ذکر کیا اور اپنا خاندانِ نبوت کا ایک فرد ہونا بھی ظاہر کیا، یہ اظہارِ کمال اگر اصلاحِ خلق کی نیت سے ہو، اپنی ذاتی بڑائی ثابت کرنے کے لئے نہ ہو تو وہ تزکیہ نفس نہیں جس کی ممانعت قرآن میں آئی ہے۔ **فلا تزکوا انفسکم** یعنی اپنے پاک نفسی کا اظہار نہ کرو۔

۳- تبلیغ وارشاد کا ایک اہم اصول یہ بتلایا گیا کہ داعی اور مصلح کا فرض ہے کہ ہر حال میں اپنے وظیفۂ دعوت و تبلیغ کو سب کاموں سے مقدم رکھے، کوئی اس کے پاس کسی کام کے لئے آئے وہ اپنے اصلی کام کو نہ بھولے جیسے حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر خواب سے پہلے دعوت و تبلیغ کے ذریعہ انھیں رُشد و ہدایت کا تحفہ عطا فرمایا، یہ نہ سمجھے کہ دعوت و تبلیغ کسی جلسہ، کسی منبر، یا اسٹیج ہی پر ہوا کرتی ہے، شخصی ملاقاتوں اور نجی مذاکروں کے ذریعہ یہ کام اس سے زیادہ مؤثر ہوتا ہے۔

۴- حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل سے رہائی کے لئے اُس قیدی سے کہا کہ جب بادشاہ کے

پاس جاؤ تو میرا بھی ذکر کرنا کہ وہ بے قصور جیل میں ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی مصیبت سے خلاصی کے لئے کسی شخص کو رابطہ بنانا توکل کے خلاف نہیں ہے۔

۵- اللہ جل شانہ کو اپنے برگزیدہ پیغمبروں کے لئے ہر جائز کوشش بھی پسند نہیں کہ کسی انسان کو اپنی خلاصی کا ذریعہ بنائیں، ان کے اور حق تعالیٰ کے درمیان کوئی واسطہ نہ ہونا ہی انبیاء کا اصلی مقام ہے، شاید اسی لئے یہ قیدی یوسف علیہ السلام کے کہنے کو بھول گیا اور ان کو مزید کئی سال جیل میں رہنا پڑا ......

(معارف القرآن سورۂ یوسف: ۱۲ تا ۴۲ ملخصا)

حضرت یوسف علیہ السلام کے اس واقعہ کا پیغام جیسا کہ ظاہر ہے کہ دین کا داعی اور خادم جہاں بھی رہے دین کا داعی اور خادم ہی رہتا ہے، محاورہ مشہور ہے ''صدر جہاں بھی بیٹھ جائے صدر ہی رہتا ہے'' اس لئے اس پہلو سے حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب (اللہ تعالیٰ جلد ان کی رہائی سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی فرمائے آمین) کی گرفتاری میں ایک گونہ اطمینان اور تسلی کا سامان ہے کہ محض ایک قیدی کی حیثیت سے نہیں بلکہ دین کے داعی کی حیثیت سے حضرت مولانا کا علمی اصلاحی اور تربیتی فیض جیل کی تنگ و تاریک کوٹھریوں میں بھی جاری ہے، چنانچہ جن علماء دین، مجددین و مصلحین کو ''سنتِ یوسفی'' پر عمل کا موقع ملا تو اُن کے چشمہ فیض سے خود جیلر اور جیل کے قیدی بھی سیراب ہوئے، قید و بند کی زندگی اور جیل کی کوٹھری میں بھی وہ علم و تحقیق کے دریا بہائے، درسِ نظامی کی مشہور کتاب ''علم الصیغہ'' جیل ہی میں لکھی گئی۔

ہماری ریاست کے مشہور بزرگ امیر ملتِ اسلامیہ حضرت مولانا حمید الدین عاقلؒ حسامی اندرا گاندھی کے دورِ حکومت میں خاندانی منصوبہ بندی کے مسئلہ پر جیل گئے، جیل میں بھی وعظ و بیان اور پند و نصیحت کا سلسلہ جاری رہا، اس کی وجہ سے جیل کے در و دیوار اصلاح و تربیت کے انوار و آثار سے جگمگا اٹھے، جیلر بھی اس تبدیلی سے بہت متاثر تھا، اُس نے حضرت مولاناؒ سے رہائی کے وقت کہا: مولانا! آپ کی وجہ سے جیل کا ماحول بہت اچھا ہوگیا، بہت سارے قیدی بھی سدھر گئے؟ یہ سن کر حضرت مولانا نے اپنے مخصوص مزاحیہ انداز میں کہا: چھوڑ کے دیکھو، معلوم ہوتا قیدی سدھرے یا نئیں''

ہم اللہ تعالیٰ کے عاجز، کمزور اور ناتوں بندے ہیں، ہمارا ایمان بھی کمزور ہے، یقین کی کیفیت بھی دگر گوں ہے، اس لئے اسباب کے درجہ میں حضرت مولانا محمد عبد القوی صاحب کی جلد باعزت رہائی کے

لئے ہر ممکن تدبیر اختیار کی جاسکتی ہے، حضرت مولانا کے وکلاء بھی اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے استعمال میں اپنی پوری طاقت اور توانائی جھونک دیں گے، لیکن ان سب کے باوجود ہمارا اصل آسرا اور سہارا اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، وہی ہمارا سب سے بہترین کارساز اور مددگار ہے، نمرود کی آگ میں قرآن مجید کی آیت حسبنا اللہ ونعم الوکیل جلیل القدر اور اولوالعزم پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر تھی، ظلم وستم کی اس آگ میں بھی یہ آیت ہمارے لئے وردِ زبان رہے گی، اللہ تعالیٰ جلد از جلد حضرت مولانا کی باعزت رہائی کے اسباب پیدا فرمائے، حضرت مولانا کو اپنی خاص حفظ وامان میں رکھے اور حضرت مولانا کے اہل خانہ کی خصوصی دستگیری فرمائے۔ آمین

طریق اہل دنیا ہے گلہ وشکوہ زمانے کا
نہیں ہے زخم کھاکر آہ کرنا شان درویشی

❁❁❁

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و سن کہاں

❁❁❁

ہر لحظہ بدلتی ہوئی دنیا کی خبر رکھ
جینا ہے تو حالات کے تیور پہ نظر رکھ
گذرے ہوئے دن ہوگئے یادوں کے حوالے
اب اپنی نگاہوں میں نئی شام و سحر رکھ

خوشی ومسرت کے دواہم واقعات

ماہ اگست اور ستمبر ۲۰۱۴ء میں مجلس علمیہ کے مخلصین ، ماہنامہ ضیائے علم کے قارئین اور عامۃ المسلمین کے لئے خوشی ومسرت کے دواہم واقعات پیش آئے ، ایک مجلس علمیہ کے متحرک اور فعال نائب ناظم ممتاز عالم دین حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب مدظلہ العالی کی ناحق گرفتاری کے بعد پر مسرت رہائی ، دوسرے مجلس علمیہ کے نہایت قدیم اور مخلص معزز رکن تاسیسی کہنہ مشق فقیہ اور بلند پایہ صاحبِ قلم مایۂ ناز عالم دین حضرت مولانا خالدسیف اللہ رحمانی مدظلہ العالی کی کشمیر کے سیلاب میں محصوری کے بعد بخیر وعافیت واپسی ....اللہ تعالیٰ صحت وعافیت کے ساتھ ان دونوں بزرگوں کی زندگی میں خیر وبرکت عطافرمائے ،ان کی دینی، علمی اور اصلاحی خدمات کو دیر اور دور تک کے لئے قبول فرمائے ،ملت اسلامیہ پر ان حضرات کا سایہ تا دیر قائم ودائم رکھے (آمین)

امتحان وآزمائش کے واقعات تو اکثر وبیش تر ہر انسان کے ساتھ پیش آتے ہیں، البتہ جب خواص امت کے ساتھ ایسے واقعات ہوں تو وہ اپنے دامن میں عبرت ونصیحت کے کئی پہلو رکھتے ہیں، عبرت ونصیحت کی کچھ سوغات قارئین کی خدمت میں پیش ہیں :

۱)امتحان وآزمائش کے موقع پر ردعمل کا اظہار مختلف ہوتا ہے،اگر عام آدمی گرفتار ہو یا وہ سیلاب کی زد میں آجائے تو اظہار افسوس کے ساتھ چند دعائیہ جملے کہہ کر آدمی خاموش ہوجاتا ہے،لیکن جب معاملہ سرکردہ عالم دین اور مخلص رہنما کا ہو تو لوگ سراپا احتجاج اور مجسم غم بن جاتے ہیں، ہر آن دعا واذکار میں لگے رہتے ہیں،بعض لوگوں کو ردعمل کے اس فرق سے غلط فہمی ہوتی ہے،لیکن یہ غلط فہمی بالکل بے جا اور بلا وجہ ہے،اس لئے کہ ؎ ''سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے'' کہ مصداق حضرت الاستاذ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب اور مخدومِ گرامی حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب جیسے خواصِ اُمت پر جب کوئی آزمائش آئے تو ان کا حق اور استحقاق ہے کہ سارا جہاں ان کے

لئے بے چین و بے قرار ہو، عام آدمی کی پریشانی سے ایک گھر اور زیادہ سے زیادہ ایک خاندان متاثر ہوتا ہے اور خواص امت کی آزمائش سے امت کا بڑا حلقہ اور کئی افراد خاندان متاثر ہوتے ہیں۔

بہر حال اس طرح کے واقعات کا سبق عام مسلمانوں بالخصوص دین کے خدمت گزاروں کے لئے یہ ہے کہ اپنی ذات کے خول میں بند نہ رہیں، زندگی کی بھاگ دوڑ صرف اپنی ذاتی نفع وفائدہ تک محدود نہ رکھیں، رضاءِ الٰہی کی نیت سے اصلاحی وفلاحی خدمات کے ذریعہ اپنی عوامی شناخت و پہچان بنائیں، تاکہ امتحان وآزمائش کے موقع پر ہمارے اچھے ونیک اعمال کے علاوہ عوام کی پر خلوص و پر درد اور پُرسوز دعائیں بھی ہمارے کام آئیں۔

۲) خواص امت جب کسی امتحان وآزمائش سے دوچار ہوتے ہیں تو اسی آزمائش میں گرفتار دوسرے عام افراد کے لئے سہولت وآسانی کا سبب بنتے ہیں اور رحمت وراحت کا ذریعہ ثابت ہوتے ہیں، کتابوں میں پڑھا ہے اور بزرگوں سے بھی سنا ہے کہ نماز باجماعت کا اہتمام اس لئے بھی کرنا ہے کہ نہ معلوم کون اللہ تعالیٰ کا ولی اور نیک بندہ جماعت میں شریک ہو اور اس کے طفیل میں ہماری بھی نماز قبول ہوجائے، اسی طرح جب قبرستان میں اللہ تعالی کے کسی نیک اور ولی صفت بندہ کی تدفین ہوتی ہے تو اس کے طفیل میں دوسرے عام مرحومین کو بھی اللہ تعالی کی رحمتوں اور عنایتوں کا کچھ حصہ نصیب ہوجاتا ہے، ناحق گرفتاری کے بعد عام لوگوں کی دعائیں اور مناجات صرف حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب کی ذات تک محدود نہیں رہیں بلکہ گرفتار شدہ تمام بے قصور نوجوانوں کی رہائی کو بھی دعاؤں میں شامل کیا گیا، سوچنا چاہئے کہ اگر حضرت مولانا محترم کی ناحق گرفتاری نہ ہوتی تو کیا بے قصور نوجوانوں کو رہائی کے لئے اتنی ڈھیر ساری دعائیں ملتیں؟؟

اسی طرح حضرت الاستاذ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کی کشمیر کے سیلاب میں محصوری کا مسئلہ ہے، اگر عام آدمی ہوتا تو سیلاب سے بچ کر آنے کے بعد اپنی جان کی خیر مناتا، نمازِ شکرانہ ادا کرتا اور اگر زیادہ جذبہ ہوتو بکرا وغیرہ ذبح کرکے جان کا صدقہ دیتا، اس سے آگے وہ نہ کچھ کرتا اور نہ ہی اس کے بس واختیار میں ہوتا، اس کے برخلاف حضرت الاستاذ کا معاملہ ہے، آپ کشمیر کی تاریخ کے بدترین سیلاب میں محصور رہ کر حقیقی معنوں میں موت کے منہ سے باہر نکل آئے اور گھر آنے کے بعد

بالکل خاموش اور پرسکون ہو کر نہیں بیٹھ گئے بلکہ چنائی، بہار، بمبئی دہلی اور گجرات میں اپنے اثر ورسوخ کے وسیع حلقہ کو کشمیر کے آفت زدہ مسلمان بھائیوں کی امداد کے لئے متوجہ کیا اور ان کی رہنمائی فرمائی، اس طرح حضرت الاستاذ کی محصوری سیلاب زدگان کی راحت رسانی کا ذریعہ بن گئی۔

۳) حیدرآباد میں اپنی آمد کے فوری بعد ادارہ اشرف العلوم خواجہ باغ میں اپنے پہلے خطاب میں حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب نے فرمایا: آزادی سب سے بڑی نعمت ہے، قید وبند کی زندگی میں اس نعمت کی قدر وقیمت کا احساس بہت زیادہ ہوتا ہے، پھر یہ کہ ایک مسلمان اور بندہ مومن کے لئے حقیقی آزادی تو آخرت میں جنت کے ملنے پر ہے، جیل کی پابندیوں اور بندشوں کی طرح دنیا میں بھی اہل ایمان کے لئے دین وشریعت کی پابندیاں اور بندشیں ہیں، اس لئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: **الدنیا سجن المومن و جنة الکافر**، کہ دنیا مومن کا قید خانہ ہے اور کافر کے لئے جنت ہے، جیسے دنیا میں جیل کی پابندیوں اور بندشوں سے آزادی کے بعد آدمی راحت واطمینان محسوس کرتا ہے اسی طرح بندہ مومن دنیا کے جیل خانہ سے آزاد ہونے (انتقال کر جانے) کے بعد جنت میں اپنے لئے خوشی ومسرت کے تمام سامان پاتا ہے۔

۴) حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب نے المعہد العالی الاسلامی میں طلبہ اور اساتذہ کے درمیان اپنے خطاب میں فرمایا: کشمیر کا سیلاب، کشمیر کی تاریخ اور غالباً ملک کی تاریخ کا بدترین سیلاب ہے، کشمیر کی نامور اور مشہور شخصیات، بلند وبالا کوٹھیوں، خوبصورت اور عالی شان بنگلوں کے رہنے والے سیلاب میں بہہ گئے، ۳، ۳/منزلہ گھر زیر آب آگئے، یہ سیلاب قیامت صغری سے کم نہیں تھا، لیکن اس طرح کے آفات سماوی ہمارے لئے لمحہ فکر یہ اور اپنے احتساب وجائزہ کا موقعہ ہیں، احادیث کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اجتماعی عذاب ۳/گناہوں کی وجہ سے آتا ہے، ایک سودی لین دین کی وجہ سے، دوسرے زکوۃ نہ نکالنے کی وجہ سے، اور تیسرے زنا کاری وبدکاری کے عام ہونے کی وجہ سے، بدقسمتی سے مسلم معاشرہ میں یہ تینوں گناہ عام ہیں، الا ماشاء اللہ بنک کے سود کو تو سود ہی نہیں سمجھا جاتا، باغات اور کھیتوں کی پیداوار کی زکوۃ عام طور پر نہیں نکالی جاتی۔

حضرت الاستاذ نے مزید کہا: مصیبت کے اس موقع پر سیلاب زدگان کے لئے جہاں ریلیف

کا کام کیا جاتا ہے وہیں ریلیف کے کاموں کے دوران ان کی ذھن سازی بھی کرنی چاہئے اور ان گناہوں کی شناعت کے بارے میں شعور بیدار کرنا چاہئے، اس کے علاوہ علماء اور ملی تنظیموں کے ذمہ داروں کو بہت ہی بیدار اور چوکنا رہنا چاہئے کہ کشمیر کے مسلمان سیلاب کی زد میں آکر اپنے مال واسباب سے تو محروم ہو چکے ہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ عیسائی مشنریز کی نام نہاد امدادی کاروائیوں سے ارتداد کا سیلاب نہ آجائے، اور مسلمان مال واسباب کے ساتھ ایمان سے بھی محروم ہو جائیں، اللہ تعالیٰ ایسی آزمائش سے محفوظ رکھے۔

۵) احکم الحاکمین کے حکیمانہ فیصلوں کے تحت قوم وملت کے بعض نازک اور سنگین مسائل کو سمجھنے کے لئے بعض مرتبہ خود خواص امت کو بھی ان مسائل سے گذرنا پڑتا ہے، پھر ان کے حل کے لئے کوئی منصوبہ بندی اور منظم حکمت عملی اختیار کی جاتی ہے، گرفتار شدہ بےقصور نوجوانوں کے کیا مسائل ہیں؟ حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب نے اس کو بہت قریب سے دیکھا ہے، اور ان کے دکھ درد کو سمجھا ہے، کتنے نوجوان ہیں جو ناکردہ جرائم کی سزا میں برسوں سے جیلوں میں سڑ رہے ہیں؟ مضبوط وکیل اور صحیح قانونی چارہ جوئی نہ ہونے کی وجہ سے ان کی رہائی نہیں ہو رہی ہے، ان کی رہائی کے لئے متعلقین دردر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں، روتے روتے آنکھیں خشک ہو گئیں، غیر تو غیر اُن سے کیا شکوہ! خود اپنے بھی ''اندیشہ ہائے دور دراز'' کے تحت بیگانے ہو جاتے ہیں، ایسے میں گرفتار شدہ افراد کے اہل خانہ کو کھانے پینے کے لالے پڑ جاتے ہیں، آخر ان ناگفتہ بہ مسائل کا حل کیا ہے؟

کیا ہمارے پاس ملکی سطح پر یا کم از کم ریاستی سطح پر ماہر ومخلص وکلاء پر مشتمل کوئی مضبوط قانونی سیل موجود ہے؟ جو بےقصور نوجوانوں کی گرفتاری پر فوراً حرکت میں آئے اور ان کی رہائی تک ''جہد مسلسل'' کرتے رہے، کتنی ملی تنظیموں کے یہاں باضابطہ ''قانونی سیل'' ہے اور اگر ہے بھی تو تنظیمی ضرورتوں کے علاوہ وہ ملی مسائل کے حل میں کتنا کارگر اور کارآمد ہے، شاید ہی کوئی باخبر اس سے بےخبر ہو، پھر یہ کہ گرفتار شدہ ان بےقصور نوجوانوں کے معاشی مسائل کے حل کرنے کے لئے ہم نے کیا وسائل اختیار کئے ہیں؟ زکوۃ وصدقات کے قومی رقومات تو ماشاء اللہ زکوۃ کے دیگر مصارف پر خوب خرچ ہوتی ہیں لیکن زکوۃ کا ایک مصرف ''گردنوں کا چھڑانا'' بھی تو ہے، کیا اس مصرف میں وقت اور حالات کے

تقاضوں کے مطابق گرفتار شدہ بے قصور نوجوانوں کو شامل نہیں کیا جاسکتا ؟ کیا زکوۃ کے مد سے ان نوجوانوں کے پریشان حال گھر والوں کی امداد نہیں کی جاسکتی ؟ بہر حال ضرورت اس بات کی ہے کہ ملی تنظییں اور رفاہی ادارے جیلوں میں بند نوجوانوں کے گھر والوں کی مالی امداد اور بازآبادکاری کو اپنے مستقل اغراض ومقاصد میں شامل کریں، اور حضرت مولانا محمد عبدالقوی صاحب جیسی سرکردہ شخصیات مل بیٹھ کر اس اہم مسئلہ کے حل کے لئے کوئی مضبوط، مربوط اور مبسوط لائحہ عمل تیار فرمائیں۔

اداریہ ماہنامہ ضیاء علم، اکتوبر ۲۰۱۴ء

مسلم پرسنل لاء قوانین سے متعلق حکومت کا حلف نامہ

عقل وانصاف کی عدالت میں

سپریم کورٹ میں طلاق ثلاثہ مقدمہ کی کاروائیوں کے دوران وزیر اعظم نریندر مودی کے زیر قیادت مرکزی حکومت سے طلاق ثلاثہ سے متعلق رائے طلب کی گئی، اس پر مرکزی حکومت کی طرف سے سپریم کورٹ میں ایک حلف نامہ داخل کیا گیا، حلف نامہ میں حکومت نے مسلم پرسنل لاء قوانین سے متعلق اپنے موقف اور منشا کو واضح کرتے ہوئے کہا: وہ طلاق ثلاثہ، تعداد ازدواج اور حلالہ کے خلاف ہے، حکومت نے یہ بھی وضاحت کی کہ اُس کے اس موقف کو ''یکساں سِول کوڈ'' کے تناظر میں نہ دیکھا جائے بلکہ عورتوں کے بنیادی حقوق اور صنفی مساوات کے حوالہ سے پڑھا اور سمجھا جائے۔

مرکزی حکومت کی طرف سے پیش کردہ اس حلف نامہ میں عورتوں کے لئے ''بنیادی حقوق'' اور ''صنفی مساوات'' کے نام پر طلاق ثلاثہ اور تعداد ازدواج جیسے مسلم پرسنل لاء قوانین کی مخالفت کی گئی، بنیادی حقوق اور صنفی مساوات وغیرہ جیسے خاص ٹکسائیلی اور میڈیائی جملہ کہنے اور بولنے کی حد تک تو بہت ہی خوبصورت اور دلفریب معلوم ہوتے ہیں، لیکن بادی النظر میں حقیقت کے اعتبار سے اُتنے ہی زیادہ بے معنی اور پُرفریب ہیں، حکومت کے حلف نامہ میں ان دو باتوں کو چوں کہ بہت زیادہ نمایاں کیا گیا، اس لئے بطور خاص ان دو باتوں کے حوالہ سے وزیر اعظم اور دیگر وزراء کے بیانات کے پیشِ نظر اس حلف نامہ کا حقیقت پسندانہ جائزہ لینے کی کوشش کی گئی، اس سلسلہ میں چند اُمور قابلِ غور اور لائق توجہ ہیں:

بنیادی حقوق:

۱) سب سے پہلے ''بنیادی حقوق'' کا معیار اور پیمانہ طے ہونا چاہئے، اس کی وضاحت کی جائے کونسی باتیں بنیادی حقوق میں شامل ہیں اور کونسی باتیں شامل نہیں ہیں؟ کونسے حقوق بنیادی حقوق

کے دائرہ میں آتے ہیں اور کونسے حقوق نہیں آتے؟ لیکن چوں کہ اس طرح جملے اور الفاظ ایک مخصوص نظریہ اور سوچ کے تحت بولے اور لکھے جاتے ہیں، اس لئے ان کی تعریف اتنی مبہم اور مجہول ہوتی ہے کہ اُس کا کوئی معیار ہی واضح نہیں ہوتا، جیسے ''اظہارِ خیال کی آزادی'' کا بہت زیادہ ہوّا کھڑا کیا جاتا ہے کہ آدمی کو بولنے اور لکھنے کی آزادی ہونی چاہیے، لیکن اس کی حد کیا ہو؟ اس کی وضاحت نہ ہونے کی بناء پر آدمی ''دل آزاری'' کی سرحد میں داخل ہوتا ہے اور زبان درازی کرنے لگتا ہے، پس آج اگر ''بنیادی حقوق'' کا دائرہ متعین نہ ہو تو بات پھر صرف طلاق ثلاثہ اور تعدد ازدواج تک محدود نہیں رہے گی، آگے چل کر آئندہ کوئی بھی ذاتی مفادات کے لئے بنیادی حقوق کے دائرہ کو ربر کی طرح جب چاہے، جتنا چاہے اور جیسا چاہے پھیلاتا اور بڑا کرتا رہے گا، اس لئے کہ مذہب بے زار ناہنجار افراد ہر مذہبی برادری میں ہوتے ہیں، آج بعض مسلم خواتین طلاق ثلاثہ کے نظام اور سسٹم کو اپنے ''بنیادی حقوق'' کے خلاف سمجھتی ہیں، کل کے دن کوئی سرپھرا مسلمان فریضہ نماز کو لے کر عدالت میں اپنے بنیادی حقوق کو دہائی دے سکتا ہے اور کہہ سکتا ہے کہ پانچ وقت نمازوں کی پابندی سے میرے کاروبار اور روزگار پر اثر پڑتا ہے اور میرے ''معاشی حقوق'' متاثر ہوتے ہیں، اس لئے عدالت ایسے مذہبی سسٹم پر روک لگائے، کوئی کہہ سکتا ہے کہ روزہ رکھنے سے میری صحت خراب ہوتی ہے اور میں اپنے ''غذائی حقوق'' سے محروم رہتا ہوں، اس لئے میرے ساتھ انصاف کیا جائے، ایسے مواقع پر اگر عدالت حکومت کی رائے طلب کرے تو کیا حکومت ''بنیادی حقوق'' کے نام پر ان مذہبی عبادات کی مخالفت کرے گی؟؟

۲) اصل مسئلہ یہاں ''بنیادی حقوق'' کا نہیں ہے، مذہب سے وابستگی اور اس کے قوانین کی پیروی اور پابندی کا ہے، اگر آپ نے زندگی گذارنے کے لئے مذہبی قوانین اور تعلیمات کو اپنے لئے ''نمونہ عمل'' بنایا ہے اور ''راہ عمل'' کی حیثیت سے اُن کا انتخاب کیا ہے تو آپ کا یہ رویہ بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ مذہب کے قوانین اور تعلیمات کے سامنے آپ کی آزادی اور آپ کے بنیادی حقوق کوئی معنیٰ نہیں رکھتے، مذہب کی غلامی کا طوق از خود آپ نے پہنا ہے، اُس کی پیروی اور پابندی کے زنجیریں اور ہتکڑیاں آپ نے خود ہی اپنے ہاتھوں اور پیروں میں ڈالی ہے، اس لئے ضروری ہے

آپ اپنے لئے اتنی ہی آزادی غنیمت سمجھیں جتنی کہ آپ کو مذہب میں دی گئی اور آپ کے لئے بنیادی حقوق وہی ہے اور اُتنے ہی ہیں جس کی تشریح مذہب میں کی گئی، بے لگام آزادی اور پابندی دونوں ایک جگہ نہ جمع ہوئے ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں، دونوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہوگا، اگر کوئی مذہب کا پیروکار مذہبی قوانین کو اپنی شخصی آزادی کے منافی اور اپنے بنیادی حقوق کی پامالی کا ذریعہ سمجھتا ہے تو اُس کے لئے مذہب سے باہر جانے کا راستہ بالکل کھلا ہوا ہے، زبردستی اُس کو باندھ کر نہیں رکھا گیا۔

مذہب سے وابستگی کی یہ حقیقت دوسری مذہبی برادریوں میں کہاں تک اور کس حد تک ہے، اُس سے قطعِ نظر اسلام میں تو مذہب سے وابستگی کی یہ نوعیت پوری طرح موجود ہے، قبولِ اسلام کا معنی ہی یہ ہے کہ غیر مشروط طریقہ پر اپنے آپ کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور تعلیمات کے حوالہ کر دے، اس لئے قرآن مجید میں فرمایا گیا:

وما کان لمؤمن ولا مؤمنة اذا قضی اللّٰہ ورسوله امراً ان یکون لھم الخیرة من امرھم۔

جب اللہ اور اُس کے رسول کسی معاملہ کا فیصلہ کر دے تو سوائے اُس فیصلہ کو قبول کرنے اور تسلیم کرنے کے کسی مومن مرد اور مومن عورت کے لئے کوئی اختیار باقی نہیں رہتا۔

ایک جگہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

فلا وربک لا یؤمنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدو فی انفسھم حرجاً مما قضیت ویسلمو تسلیماً

آپ کے پروردگار کی قسم! وہ لوگ ایمان والے نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ لوگ اپنے اختلافی اور نزاعی معاملات میں آپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کو اپنا حَکَم نہ بنالیں، نہ صرف حَکَم بنائیں بلکہ بحیثیت حَکَم آپ کے فیصلوں کو پوری خوش دلی سے تسلیم کریں اور اپنے دلوں میں ذرہ برابر تنگی اور کجی محسوس نہ کریں۔

اس لئے اسلام کے نابغۂ روزگار فلسفی اور بلند پایہ شاعر علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:

تقدیر کے پابند حیوانات و جمادات

مومن فقط احکام الٰہی کا پابند

۳) یہ بات بھی بطور خاص محل نظر ہے کہ ''بنیادی حقوق'' کے نام پر صرف مسلم پرسنل لاء قوانین پر ہی تان کیوں توڑی جاتی ہے؟ ہمارے ملک میں مختلف برادریوں کی بہت ساری سماجی رسوم و روایات ہیں، جن کی کوئی مذہبی بنیادیں نہیں ہیں، ان رسوم وروایات سے ''بنیادی حقوق'' نہ صرف متاثر ہوتے ہیں بلکہ بُری طرح پامال ہوتے ہیں، یہاں تک کہ نوزائیدہ اورنوعمر بچوں کی زندگیاں بھی داؤ پر لگ جاتی ہیں، ابھی گذشتہ چند دنوں پہلے جین مت کی ماننے والی ۱۳/سالہ آرادھنا نامی لڑکی مسلسل ۶۸/دن اُپواس رکھنے کی وجہ سے ۴/اکتوبر ۲۰۱۶ء کو زندگی سے ہاتھ دھوبیٹھی ،قومی کمیشن برائے اطفال کی نوٹس کی وجہ سے پولیس نے کیس تو درج کیا،لیکن یہ مان کر کہ یہ ایک مذہبی روایت اور رسم ہے،لڑکی کسی طرح کے کوئی دباؤ اور تناؤ میں نہیں تھی ،اس لئے بغیر کسی کارروائی کے یہ کیس ختم کردیا گیا۔ (دیکھئے روزنامہ اعتماد ۲۶/اکتوبر ۲۰۱۶ء)اسی طرح جین مذہب میں ''سنتھارا'' ایک مذہبی رسم ہے، اس رسم کے تحت جین مذہب کا ماننے والا ایک شخص اپنی موت تک بھوکا پیاسا رہنے کا عہد کرتا ہے،وہ اپنی موت تک کچھ کھاتا پیتا نہیں، یہاں تک کہ بھوک و پیاس کی وجہ سے اس کی موت ہوجاتی ہے،۱۰/ اگست ۲۰۱۵ء میں راجستھان ہائی کورٹ نے اس مذہبی رسم کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے تعزیراتِ ہند کی دفعہ 306 کے تحت اس رسم کے ادا کرنے والے کو مستوجبِ سزا جرم قرار دیا اور اس کو خودکشی میں مدد کرنے کے مماثل بتایا،جین مذہب کی برادری نے اس فیصلہ کو اپنی مذہبی روایات میں مداخلت سمجھتے ہوئے اُس کو ٹھکرادیا، معاملہ سپریم کورٹ میں جاپہونچا، چنانچہ ۳۱/اگست ۲۰۱۵ء کو سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان نے راجستھان ہائی کورٹ کے فیصلہ پر حکم التواعائد کردیا،جین مذہب کی ایک ۸۲/سالہ خاتون ''بدنی دیوی'' جس کے مون برت کی وجہ سے یہ مقدمہ شروع ہوا تھا ،عدالتی کارروائیوں سے متاثر ہوئے بغیر یہ خاتون راجستھان ہائی کورٹ کے فیصلہ کے بعد خاموش طریقہ پر اپنا مون برت جاری رکھی تھی ، پھر جب سپریم کروٹ کی طرف سے حکم التواء حاصل ہوگیا تو یہ خاتون علانیہ طریقہ پر اس رسم کو پورا کررہی تھی ، یہاں تک ۵/ستمبر ۲۰۱۵ء کو''سنتھارا'' رسم پر عمل کرنے کی وجہ سے

اس بوڑھی اور معمر خاتون کا انتقال ہو گیا۔ (ملاحظہ ہو روز نامہ منصف حیدر آباد، مورخہ ۶؍ستمبر ۲۰۱۵ء ملخصاً)

ہندوؤں کے یہاں ''جنم اشٹی'' ایک تہوار ہے، مہاراشٹرا میں اس تہوار کے موقع پر دہی ہانڈی توڑنے کی رسم ادا کی جاتی ہے، اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ مخروطی شکل میں نہایت اونچا انسانی اہرام بنایا جاتا ہے، اس کو پرمڈ بنانا بھی کہتے ہیں، اس رسم میں کم عمر لڑکوں سے لے کر نو جوانوں اور بڑی عمر کے لوگ حصہ لیتے ہیں، اس رسم میں چوں کہ انسانی جان کا خطرہ تھا، اس لئے سپریم کورٹ نے اس رسم پر مکمل پابندی تو نہیں لگائی البتہ مذہبی جذبات کو محسوس کرتے ہوئے یہ فیصلہ دیا کہ دہی ہانڈی رسم کے لئے اہرام کی اونچائی ۲۰؍فٹ سے زیادہ نہ ہو اور ۱۸؍سال سے کم عمر لڑکوں کو انسانی پیرامڈ کا حصہ نہ بنایا جائے، فیصلہ کے وقت عدالت نے یہ دلچسپ اور طنزیہ ریمارک کیا: ''ہم نے شری کرشن کے مکھن چرانے کے بارے میں سنا ہے لیکن کرتب دکھاتے نہیں سنا'' (ملاحظہ ہوں: روزنامہ سہارا، روزنامہ اعتماد، مورخہ ۱۸؍اگست ۲۰۱۶ء ملخصاً) چند مہینوں پہلے سوشیل میڈیا میں ایک کلپ وائرل ہوگئ، اس میں دکھایا گیا کہ مذہبی رسم کے تحت نہایت نامعقول اور بے رحم طریقہ پر نوزائیدہ معصوم بچوں پر گرم گرم دودھ ڈالا جارہا ہے۔

ان دو تین مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہندوستانی معاشرہ میں مذہبی رسوم وروایات کی جڑیں کتنی گہری اور مضبوط ہیں، کیا ان غیر معقول اور خطرات سے بھر پور رسوم وروایات سے ''بنیادی حقوق'' متاثر نہیں ہوتے؟؟ لیکن محض متعلقہ مذہبی برادریوں کے مذہبی جذبات کی رعایت میں حکومت اور عدالت چاہتے ہوئے بھی ان غیر انسانی رسموں کو بالکلیہ ختم نہیں کرسکتی، طلاق ثلاثہ جیسے تسلیم شدہ پرسنل لاء قوانین کو ایشو بنا کر بعض وزراء یہ بیان بازی کرتے ہیں: ''مذہبی عقیدہ / عمل'' کی بنیاد پر مہذب سماج میں کسی کے ساتھ امتیاز نہیں ہونا چاہئے، جب یہ کہا جاسکتا ہے تو یہ بھی کہا جانا چاہیے: ''فرسودہ رسموں کی بنیاد پر بنیادی حقوق سے کسی کو محروم نہیں رکھا جاسکتا اور نہ معصوم لوگوں کی زندگیوں کو خطرہ میں ڈالا جاسکتا ہے'' پھر یہ کہ جب بغیر کسی مذہبی بنیادوں پر قائم رسموں کی روک تھام یا اُن پر کنٹرول کرنے کے سلسلہ میں حکومت اور عدالتیں دوسروں کے مذہبی جذبات کو محسوس کرسکتی ہے اور اُن کی رعایت کرتی ہیں تو پرسنل لاء قوانین جن کی اپنی مسلمہ حقیقت اور حیثیت ہے اور جو معقول اور

مضبوط بنیادوں پر مبنی ہیں، ان کے بارے میں کوئی فیصلہ لیتے وقت ملک کی دوسری بڑی اکثریت مسلمانوں کے جذبات واحساسات کا کیوں پاس ولحاظ نہیں رکھا جاتا۔

گذشتہ سال ٹاملناڈو کی ایک رضاکارانہ تنظیم کی طرف سے سپریم کورٹ میں درخواست داخل کی گئی اور مطالبہ کیا گیا مذہبی اغراض کے تحت جانوروں کی قربانی پر روک لگائی جائے، اس لئے کہ یہ جانورں پر ظلم ہے، عدالت نے اس درخواست کو مسترد کرتے ہوئے کہا:

''ہم معذرت خواہ ہیں، ہم عوام کی صدیوں قدیم روایات سے آنکھیں بند نہیں کرسکتے، ہم اس طرح کے مسائل کا جائزہ نہیں لے سکتے تمام عقائد کے ماننے والوں کے مابین ہم آہنگی اور توازن ہونا چاہیئے''

عدالتی بنچ نے دفعہ 28 کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

''اگر کسی جانور کو کسی طبقہ کی جانب سے مذہبی تعلیم کے تحت ہلاک کیا جاتا ہے تو اُسے جانور پر ظلم تصور نہیں کیا جائے گا، اس قانونی مشق میں خود مذہبی طریقہ کار پر عمل آوری کا حق دیا گیا ہے''

(ملاحظہ ہوں: روزنامہ سیاست حیدرآباد مورخہ ۲۹؍ستمبر ۲۰۱۵ء)

سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان کے اس فیصلہ سے بخوبی اور باسانی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، مذہبی مسائل اور معاملات کتنے زیادہ حساس اور نازک ہوتے ہیں، مگر حیرت ہے کہ جانوروں کی قربانی سے متعلق دستوری دفعات کی تشریح کی جاتی ہے، اُس کے بارے میں غلط فہمیوں کو دور کیا جاتا ہے اور مذہبی طریقۂ کار پر عمل آوری کے حق تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن مسلم پرسنل لاء قوانین سے متعلق داخل کردہ درخواستوں کی سماعت کے وقت معزز جج صاحبان کا رویہ اس کے بالکل خلاف ہوتا ہے، اس موقع پر یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ یہ قوانین مسلمانوں میں چودہ سو سال سے چلے آرہے ہیں، ہم صدیوں پرانے ان قوانین سے آنکھیں بند نہیں کرسکتے اور نہ ہی دستور کی دفعہ 25-26 کا حوالہ دے کر بتایا جاتا ہے کہ ملک کے ہر شہری کو اپنے مذہب کی پیروی کرنے کا حق حاصل ہے بہرحال ایسے ہی مواقع پر عدالتوں کے ان دوہرے رویوں کی وجہ سے زبانِ حال سے یوں کہنا پڑتا ہے ؎

بنے ہیں اہل ہوس ، مدعی بھی ، منصف بھی
کسے وکیل کریں ، کسے منصفی چاہیں

۴) عورت صنفِ نازک ہونے کی وجہ سے کمزور ذات مانی جاتی ہے، چاہے کسی بھی مذہب اور برادری سے اس کا تعلق ہو، وہ دوسروں کے لئے ماں اور بہن کا درجہ رکھتی ہے،''بنیادی حقوق'' صرف مسلم خواتین کے لئے نہیں ہیں، ان سے زیادہ ہماری ہندو ماؤں اور بہنوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہیے ،اس لئے ۲۰۱۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق مسلم خواتین کی بہ نسبت دوسری مذہبی برادریوں کی خواتین میں طلاق کی شرح بہت زیادہ ہے ہندو برادرانِ وطن میں طلاق کا عمل عدالت کے ذریعہ پورا کیا جاتا ہے، مہنگے انصاف اور فیصلوں میں حد درجہ تاخیر کی وجہ سے یہاں کے عدالتی نظام کو جھیلنا اور برداشت کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، اس کے لئے جس نے بھی کہا بالکل بجا کہا:

''یہاں کی عدالتوں کی سیڑھیاں چڑھنے والے کو عمرِ نوح ،صبرِ ایوب اور قارون کا خزانہ چاہیے''

اس لئے ہمارے برادرانِ وطن میں اپنی عورتوں کو طلاق دینے سے زیادہ ایسی ہی چھوڑے رکھنا کا رواج بہت زیادہ ہے، نہ وہ بالکلیہ طور پر اپنے شوہر سے علاحدگی اختیار کرسکتی ہے اور نہ کسی دوسرے آدمی سے شادی کر کے اپنی ازدواجی زندگی کا دوسرا نیا اور کامیاب سفر شروع کرسکتی ہے ، ہماری ان چھوڑی اور لٹکائی ہوئی ہندو ماؤں اور بہنوں کی زندگی جیتے جی ایک عذاب بن کر رہ جاتی ہے، نہ وہ عزت ووقار سے جی سکتی ہے اور نہ سکون واطمینان سے مرسکتی ہے، کہتے ہیں کہ شوہر اور بیوی گاڑی کے دو پہیوّں کی طرح ہے، اگر ان دو پہیوّں میں کوئی ایک اپنے مزاج ، برتاؤ اور سلوک کے اعتبار سے'' اَن فٹ'' ہو تو اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ازدواجی زندگی کے سفر کو ہمیشہ کے لئے دشوار اور ناہموار بنالیا جائے ،اس کا آسان اور معقول حل یہ ہے مہذب اور شریفانہ انداز میں خوشگوار طریقہ پر کوئی ایک پہیّہ ہی بدل دیا جائے ،جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا:''**فَأَمۡسِكُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ أَوۡ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعۡرُوفٍ وَلَا تُمۡسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعۡتَدُوا**'' تم اپنی عورتوں کو بھلائی کے ساتھ روکے

رکھو یا بھلائی کے ساتھ رخصت کردو، انھیں تکلیف دینے کے لئے مت روکو۔ (البقرۃ: ۲۳۱)

ہمارے معزز وزیر اعظم بہت جذباتی انداز میں مسلم خواتین کے لئے بنیادی حقوق کی دُہائی دیتے ہیں لیکن انھیں ہم مذہب مظلوم اور ستم رسیدہ ہندو ماؤں اور بہنوں کا خیال کیوں نہ آتا، اصل بات یہ ہے کہ وہ اپنے ''اکثریتی ووٹ بینک'' پر نگاہ رکھ کر اور بنیادی حقوق کا بہانہ بنا کر مسلم پرسنل لاء قوانین کو نشانہ بناتے ہیں، لیکن ''کہیں پہ نگاہ، کہیں پہ نشانہ'' کے مصداق یہ نشانہ کہیں اور لگے یا نہ لگے اُن کی ذاتی زندگی پر ضرور لگ جاتا ہے، جب وہ جذباتی انداز میں دورانِ تقریر سوال کرتے ہیں، ''مسلم ماتاؤں اور بہنوں کو رکھشا ملنی چاہیے کہ نہیں ملنی چاہیے'' تو سامعین میں بعض لوگ جواب میں کہتے ہوں گے مسلم ماتاؤں اور بہنوں کو یقیناً رکھشا ملنی چاہیے، لیکن اُن سے پہلے یشودا بین کو انصاف ملنا چاہیے اور ان کی سکھشا ہونی چاہیے، ایسے لوگوں کے لئے کہا گیا:

الزام دوسروں کو دیتے تھے

قصور اپنا نکل آیا

صنفی مساوات اور عزت وقار کا مسئلہ:

مسلم پرسنل لاء کی مخالفت میں حکومت کی طرف سے، سپریم کورٹ میں داخل کردہ حلف نامہ میں دوسر بات بڑی شدومد کے ساتھ یہ اٹھائی گئی کہ طلاق ثلاثہ اور تعداد ازدواج جیسے قوانین صنفی مساوات کے خلاف ہیں، ''صنفی مساوات'' یہ جملہ بھی کہنے اور بولنے کی حد تک تو بہت ہی خوبصورت اور متاثر کن ہے، لیکن اپنی حقیقت میں اتنا ہی زیادہ خلاف عقل اور نا قابل عمل ہے، اس لئے کہ اس جملہ میں بھی بہت سی باتوں کی وضاحت اور صراحت ہونی چاہئے، مثلاً

۱) سب سے پہلے یہ تو معلوم ہو کہ ''صنفی مساوات'' کس چڑیا کا نام ہے؟ اس کا معنی و مفہوم کیا ہے؟ اگر اس کا تصور یہ ہے کہ مرد اور عورت سے متعلق ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں برابری اور مساوات ہونا چاہیے تو یہ ایک نہایت ''احمقانہ و بچکانہ'' تصور ہے، صنفی مساوات کے اس نامعقول اور نا قابل قبول تصور کو اگر تھوڑی دیر کے لئے مان بھی لیا جائے تو آئندہ یہ مطالبہ بھی ہوسکتا ہے کہ بچوں کی ولادت کا بوجھ صرف عورت ہی کیوں اٹھائے؟ دردِ زہ کی تکلیف صرف وہ کیوں برداشت کرے؟ مرد جب جنسی

تسکین حاصل کرتا ہے تو اس کے تکلیف دہ نتیجہ کو قبول کرنے میں میں وہ بھی برابر کا شریک اور حصہ دار ہونا چاہئے، کیا ایسے موقع پر ''صنفی مساوات'' کی منطق کو قبول کرلیا جائے گا؟؟ جب خود خالق کائنات نے مرد اور عورت دونوں صنفوں کو الگ الگ سانچہ اور ڈھانچہ میں بنایا اور پیدا کیا ہے، ان کی تخلیق اور بناوٹ میں برابری اور مساوات نہیں رکھی ہے، تو مجھے اور آپ کو کیا حق پہونچتا ہے کہ صنفی مساوات، صنفی مساوات کی رٹ لگا کر دونوں کے حقوق واختیارات میں برابری ومساوات پیدا کرنے کی حماقت کریں، اللہ تعالیٰ علیم وخبیر ہے ان دونوں کی فطرت اور صلاحیت سے وہ خوب واقف ہے، اس لئے قانونِ الٰہی میں دونوں کی فطرت اور صلاحیت کے مطابق دونوں کی ذمہ داریاں الگ رکھی گئیں پھر ان ہی ذمہ داریوں کے حساب سے دونوں کے لئے حقوق کی فہرست بھی بالکل الگ ہے، یہ بات تو ناقابلِ فہم ہے کہ مرد اور عورت کی فطرت اور صلاحیت الگ ہو، ذمہ داریاں بھی الگ الگ ہوں البتہ دونوں کے حقوق واختیارات میں مساوات وبرابری ہو۔

دنیا میں چھوٹا سا چھوٹا نظام چلانا ہو تو متعلقہ افراد کی ذمہ داریوں اور اُن کے حقوق واختیارات میں فرق وامتیاز لازماً رکھا جاتا ہے، جیسے خود ہمارے موجودہ وزیر اعظم ہیں، حکومت کا نظام چلانے کے لئے ان کے یہاں معمولی چوکیدار سے لے کر اعلیٰ عہدیدار تک مرد وخواتین پر مشتمل افراد کی پوری ٹیم ہے، کیا'' صنفی مساوات'' کے نام پر سب کے حقوق واختیارات اور سب کی تنخواہیں یکساں ہیں؟؟ ''صنفی مساوات'' کی بات بالکل ایسی ہی ہے کہ کوئی سیکل کے پہیوں کے بارے میں کہنے لگے ان کا حق سیکل کی سیٹ اور ہینڈیل سے زیادہ ہے، اس لئے کہ زمین پر سب سے زیادہ وہی گھسے جائے ہیں، تو کیا ایسا کہنے کی وجہ سے سیکل کے پہیوں کی جگہ بدل دی جائے گی؟؟ کائنات بھی ایک نظام اور سسٹم کے تحت ہے، مرد اور عورت اس نظام کے کُل پرزے ہیں، اگر مساوات کے نام پر ان دو پُرزوں کے الگ الگ مقام پر رکھنے کے بجائے ایک جگہ پر کردئے جائیں تو کائنات کا نظام چوپٹ ہوجائے گا، جیسے ایک چھوٹی سی سیکل کا معمولی پُرزہ اپنی جگہ سے ہٹ جانے پر ہوتا ہے، اسلام میں مرد کو مرد ہونے کی حیثیت سے اور عورت کو عورت ہونے کی حیثیت اُن کا مستحقہ مقام دیا گیا اور ان کے درمیان حقوق واختیارات کی تقسیم کی گئی، دنیا میں جب جب بھی اور جہاں جہاں بھی مرد اور عورت سے متعلق

حقوق وذمہ داریوں میں مساواتِ مرد وزن رصنفی مساوات کی دہائی دے کر قانون الٰہی کی خلاف ورزی کی گئی اُس کے بھیانک اور بُرے نتائج سامنے آئے، مغربی ممالک اس کی نمایاں اور واضح مثال ہے وہاں کا خاندانی نظام چوپٹ ہوگیا، سماجی زندگی کے تانے بانے بکھر کر رہ گئے۔

۲) ''صنفی مساوات'' کی بات کرنے کا مقصد شاید یہ ہو کہ عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا جائے، وہ بھی اپنی مرضی ومنشا کے مطابق شادی کے بندھن کو ختم کرسکیں اور قیدِ نکاح سے آزاد ہوسکیں، طلاق نہایت ناگزیز اور پے چیدہ صورتحال میں دوافراد کے درمیان ازدواجی زندگی کے انتہائی اہم ترین معاہدہ کو بہت ہی غور وفکر اور سوچ وچار کے ایک طویل مدتی عمل کے بعد ختم کرنے کا ایک انتہائی نازک ترین فیصلہ ہے، جذباتیت کی رَو میں یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا، عورت چوں کہ اپنی فطرت اور مزاج کے اعتبار سے کہ بہت زیادہ جذباتی ہوتی ہے اور کوئی بھی اہم فیصلہ کرتے وقت وہ جلد بازی کا مظاہرہ کرتی ہے، اس لئے اصولی طور پر اس اہم اور نازک فیصلہ کا اختیار عورت کو نہیں دیا گیا، البتہ بعض خاص حالات میں مردوں کے یک طرفہ ظلم وتشدد سے چھٹکارا پانے کے لئے عورت کے لئے خلع کے مطالبہ کا حق رکھا گیا اور ''تفویض طلاق'' کی تدبیر وترکیب بھی اُس کے لئے موجود ہے، ۲۰۱۱ء کی مردم شماری رپورٹ کے مطابق مسلمانوں میں طلاق کی شرح بہت کم بتائی گئی، اس کی وجہ قانون شریعت میں عورتوں کو طلاق کے حق واختیار کا نہ ہونا ہے، برابری اور مساوات کے نام پر مردوں کے ساتھ اگر عورتوں کو بھی طلاق کا حق دیا جائے تو طلاق کے واقعات بہت زیادہ ہوجائیں گے، چنانچہ جن ملکوں میں عورتوں کو طلاق کا حق دیا گیا وہاں صورت حال کچھ ایسی ہے کہ اُن ممالک میں نکاح کم اور طلاق زیادہ ہوتے ہیں، اس سلسلہ میں ایک امریکی جج نے اپنے ملک کی صورتِ حال یوں بیان کی ہے:

> ''طلاق اور تفریق کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور اگر یہی حالت ہی جیسی کہ امید ہے تو غالباً ملک کے اکثر حصوں میں جتنے شادی کے لائسنس دیے جائیں گے اتنے ہی طلاق کے مقدمے پیش ہوں گے.....'' (پردہ ص: ۸۴ رمولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ)

۳) حکومت کے ذمہ داران کی طرف سے ''طلاقِ ثلاثہ'' کے پس منظر میں بیانات اور گفتگو کے

دوران عورتوں کے لئے عزت اور وقار کی بات بھی بہت زیادہ زور وشور سے کہی گئی، جو لوگ اس طرح کی بات کہتے ہیں انھیں پہلے اپنے گھر کی خبر لینا چاہیے، اپنے سماج میں مذہبی بنیادوں پر عورتوں کے خلاف امتیازی سلوک کے خلاف آواز اٹھانا چاہیے، مظلوم وستم رسیدہ خواتین کی حالتِ زار پر توجہ دینا چاہیے، اس وقت سامراجی نظام کی وجہ سے یہ عام ماحول ہے کہ اپنے جرائم اور غلطیوں کو چھپانے کے لئے دوسروں کو نشانہ بنایا جائے، جیسے بعض دہشت گرد ممالک نے بدامنی اور خون ریزی پر مبنی اپنی کاروائیوں پر پردہ ڈالنے کے لئے امن وامان کی بحالی وبازیابی کے نام پر پُرامن ممالک میں فتنہ وفساد کا بازار گرم کررکھا ہے، بالکل اسی طرح ہندوسماج میں خواتین سے بدترین ناانصافی اور اُن کی ذلت ورسوائی کی طرف سے توجہ ہٹانے کے لئے مسلمانوں میں طلاق کے نظام کو نشانہ بنایا گیا بہرحال ''سوپ بولے تو بولے کہ سوراخ ہے، چھلنی بھی بولنی لگی تمہارے اندر کئی ایک سوراخ ہیں''۔

ہمارے برادرانِ وطن کے یہاں دیوی داس کے نام سے خواتین کا ایک طبقہ ہے، اس میں عورتیں مندروں کی خدمت کے لئے وقف ہوجاتی ہیں، اس عمل کے پیچھے ہندو مذہب کا عقیدہ اور فلسفہ یہ ہے کہ جس علاقہ اور بستی سے کسی کنواری غیر شادی شدہ لڑکی ''دیوداسی'' بنادیا جاتا ہے، اس بستی اور گاؤں پر کوئی مصیبت نہیں آتی اور وہاں امن وامان باقی رہتا ہے، برادرانِ وطن میں خواتین کا یہ طبقہ نہایت مظلوم ہے، عزت اور وقار کی زندگی سے یہ خواتین ناآشنا ہوتی ہے، دھرم کے آدھار پر ان کی عزت اور وقار کو مندروں کی بھینٹ چڑھادیا جاتا ہے، قانونی پابندیوں کے باوجود یہ ظالمانہ اور جاہلانہ رسم ملک کی بعض ریاستوں میں آج بھی موجود ہے، ۱۹۹۰ء میں کئے گئے ایک سروے کے مطابق ۴۵ر فیصد سے زیادہ دیوداسی خواتین جسم فروشی کرنے پر مجبور ہیں، پڑوسی ریاست کرناٹک کے ۱۰ر اور مدھیہ پردیش کے ۱۴ر اضلاع میں دیوداسی کا رواج آج بھی پایا جاتا ہے، دیوداسی نظام سے جڑی مجبور ولاچار خواتین کی حالتِ زار کا مزید اندازہ جناب محمد مشتاق فلاحی کے ایک مضمون سے ہوتا ہے ،اُس میں انھوں نے لکھا ہے:

> ''دہلی یونیورسٹی کی پروفیسر وملا تھوڑاٹ کہتی ہیں کہ: دیوداس بنی عورتوں کو اس کا بھی حق نہیں رہتا کہ وہ کسی کی ہوس کا شکار ہونے سے انکار کرسکے، ایک سروے

کے مطابق صرف اے پی اور تلنگانہ میں تقریباً ۳۰؍ ہزار دیوداسیاں ہیں جو مذہب کے نام پر جسمانی ظلم کا شکار ہوتی ہیں ...‘‘ (روزنامہ منصف ۳۰؍اکتوبر ۲۰۱۶ء اتوار ایڈیشن)

جولوگ طلاق ثلاثہ کا ہنگامہ کرتے ہوئے مسلم خواتین کے لئے عزت اور وقار کی دہائی دیتے ہیں، انھیں اپنے ہم مذہب ان مجبور و بے بس دیوداسی خواتین کا خیال ہونا چاہیے، ان بہنوں کو ذلت آمیز وحقارت انگیز ماحول سے نکال کر انھیں عزت واحترام کا مقام دینا چاہیے، دیوداسی خواتین کی یہ آہ اور فریاد ہمارے ملک کے وزیر اعظم اور ان کے رفقاء کے نرم و نازک پردۂ سماعت کو کاش اپنی طرف متوجہ کر سکے۔

اے جانِ وفا یہ ظلم نہ کر
غیروں پہ کرم ، اپنوں پہ ستم

کیا پرسنل لاء قوانین دستور کے تابع ہونا چاہیے؟؟

طلاق ثلاثہ اور تعدادِ ازدواج جیسے پرسنل لاء قوانین پر بحث کے دوران یہ بیانات بھی سامنے آئے کہ ان قوانین کو دستور کے تابع ہونا چاہیے، مرکزی وزیر فینانس جناب ارون جیٹلی نے بہت پُر زور انداز میں یہ بات کہی، ارون جیٹلی صرف مرکزی وزیر فینانس ہی نہیں بلکہ ممتاز ماہر قانون اور سرکردہ وکیل ہے، اگر انھوں صرف مرکزی وزیر کی حیثیت سے یہ بیان دیا ہے تو یہ اُن کی مجبوری ہے، اس لئے کہ کسی مسئلہ پر حکومت کے موقف —صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر— کی تائید وحمایت اور اس کی ترجمانی کرنا ایک وزیر کے لئے ضروری ہے، لیکن اگر وہ ماہر قانون کی حیثیت سے اپنے بیان کا از خود تحلیل وتجزیہ کرتے تو انھیں اپنے بیان کی کمزوریوں اور خامیوں کا بھرپور احساس ہوتا مثلاً:

۱) انسانی زندگی میں ’’فرد کی آزادی‘‘ کی بڑی اہمیت ہے، اس کے بغیر کوئی مکمل طریقہ پر باوقار اور باعزت زندگی نہیں گذار سکتا، غلامی کا احساس اُس کو کچوکے لگاتے رہتا ہے، اس لئے دستور اور قانون کے نام پر تمام پابندیوں اور حد بندیوں کے باوجود کچھ معاملات اور مسائل ایسے ہونے چاہیے جس میں آدمی کو اپنی آزادی کا کچھ نہ کچھ احساس ہو، چاہے یہ آزادی مذہب اور رسم ورواج کے

نام پر ہو یا اظہارِ خیال کے نام پر ہو، اگر تمام مسائل اور معاملات کو دستور کے تابع اور قانون کا پابند بنالیا جائے تو اس سے انسانی زندگی میں ''فرد کی آزادی'' کا تصور ختم ہوجایائے گا، عام طور پر مذہبی قوانین اور تعلیمات میں بہت زیادہ پابندی اور جکڑ بندی سمجھی جاتی ہے اور اس حوالہ سے اسلام کو بہت زیادہ بدنام بھی کیا جاتا ہے، لیکن خود شرعی قوانین اور اسلامی تعلیمات میں فرد کی آزادی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا، ہر بات پر ''شریعت، شریعت'' کا حوالہ دے کر مجبور اور بے بس نہیں کیا گیا، مثلاً اسلام میں لباس سے متعلق تعلیمات ہیں، اس میں اصولی طور پر ایک قاعدہ اور ضابطہ تو بنادیا گیا وہ ستر چھپانے والا ہو، ایسا لباس نہ ہو جس سے ننگے پن کا اظہار ہو اور نہ دوسری قوموں کا مذہبی شعار ہو، اس سے ہٹ کر لباس کا رنگ کیا ہونا چاہیے؟ اُس کی تراش خراش کیسی ہونی چاہیے؟ اس کو آدمی کے مزاج اور طبیعت پر چھوڑ دیا گیا، اسی طرح ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کھجوروں کے درختوں کے تخم بارے میں پوچھا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ''انتم اعلم باموردنیا کم'' تم اپنی دنیاوی معاملات کو اچھی طرح جانتے ہو، پس جب مذہبی قوانین میں تمام تر پابندیوں کے باوجود ''فرد کی آزادی'' کا کچھ نہ کچھ خیال رکھا گیا ہے تو ملکی قوانین میں بھی اس کا بھرپور خیال ہونا چاہیے بالخصوص ایک جمہوری اور آزادی ملک میں اس کی بھرپور رعایت ہونی چاہیے نہ یہ کہ پرسنل لاء قوانین کی بنیاد پر رہی سہی اور بچی کچھی فرد کی آزادی کو ختم کرتے ہوئے اُس کو بھی دستور کا تابع بنادیا جائے، اسی لئے دستور سازوں نے مذہبی آزادی کے دفعات رکھ کر مذہبی قوانین کے دائرہ میں فرد کی آزادی کو ملحوظ رکھا، دستور میں مذہب کی کوئی خاص اور متعین تعریف نہیں کی گئی کہ اس کو قبول کرنے پر کوئی شہری مذہب کا پیروکار سمجھا جائے گا اور اس کی بنیاد پر مذہبی آزادی سے متعلق حقوق حاصل ہوں گے۔

۲) ہمارا ملک مختلف مذاہب کا گلدستہ اور مختلف تہذیبوں کا گہوارہ ہے، مذاہب اور تہذیبوں کی رنگارنگی اس ملک کی امتیازی خوبی اور خصوصیت ہے، دستور کی دفعہ 25-26 کے ذریعہ ملک کے ہر شہری کو کسی بھی مذہب کو قبول کرنے، اُس پر عمل کرنے اور اُس کی تبلیغ کرنے کا حق دیا گیا ہے، اس طرح ملک کی اس امتیازی خوبی کو آئینی حیثیت حاصل ہے، اب اگر پرسنل لاء قوانین کو دستور کا تابع اور پابند بنادیا جائے تو کیا شہریوں کو اپنے مذہبی قوانین پر عمل کرنے کی آزادی کا حق باقی رہے گا؟ پھر جب

یہ حق ختم ہوجائے گا تو کیا ملک کی امتیازی خصوصیت ''وحدت میں کثرت اور کثرت میں وحدت'' باقی رہے گی؟؟ اس کے علاوہ دیگر مذہبی برادریوں کے پرسنل لاء قوانین سے قطع نظر مسلم برادری کے پرسنل لاء قانون کوخصوصی طور پر دستوری ضمانت دی گئی، چنانچہ ۱۹۳۷ء میں ''شریعت ایکٹ'' کے نام سے ایک قانون منظور کیا گیا، اس میں وضاحت کی گئی، نکاح، طلاق، وراثت، متبنی، پرورش وغیرہ عائلی مسائل میں مسلمانوں کے باہمی مقدمات کوان ہی کے پرسنل لاء کے مطابق حل کیا جائے اوراس کی روشنی میں فیصلے کیے جائیں گے۔

دوسرے یہ کہ کوئی بھی رائے پیش کرنے سے پہلے یہ دیکھنا بھی نہایت اہم اورضروری ہے کہ وہ رائے قابل عمل بھی ہے یانہیں؟ ورنہ خوبصورت الفاظ میں اور بلند بانگ دعوؤں کے ساتھ کسی بھی رائے کے اظہار سے دل بہلائی کا سامان تو ہوسکتا ہے لیکن بادی النظر میں اُس رائے کی عملی صورت گری ہی ناممکن ہے، بقول غالب ؂ ''دل کے بہلانے کوغالب یہ خیال اچھا ہے''

مرکزی وزیر فینانس کی یہ رائے بالکلیہ طور پر ناقابل عمل ہے، اس لئے کہ پورے ملک میں دوہزار سے زائد ذات برداریاں ہیں، ان میں ہرایک کا اپنا پرسنل لاء ہے، اسی پر پرسنل لاء کے مطابق ان تمام ذات برادریوں کے ذاتی معاملات ومسائل کا فیصلہ ہوتا ہے اور ان کے مذہبی رسوم وروایات ادا کیے جاتے ہیں، اب اگر مرکزی وزیر کی رائے پرعمل کرتے ہوئے پرسنل لاءقوانین کو دستور کا تابع کردیا جائے تو کیا یہ ذات برادریاں باسانی اور بخوشی اُس کوقبول کرلیں گی؟؟ چنانچہ اس بیان کے منفی اثرات کومحسوس کرتے ہوئے قبائلی تنظیموں کے ذمہ داروں اور رہنماؤں نے اس بیان کو مسترد کردیا اور کہا کہ ''یکساں سیول کوڈ'' ہمارے لئے بھی ناقابل قبول اور ناقابلِ عمل ہے۔

۳) ایک جمہوری ملک میں مذہب کا دائرہ اور اُس کا عمل دخل پہلے ہی محدود ہوتا ہے، ملکی قوانین کی وجہ سے ہرشخص اپنے تمام مذہبی قوانین اور تعلیمات کی پیروی نہیں کرسکتا، جیسے قانون شریعت کا ''کریمنل لاء'' ہے، جرائم کی روک تھام اور سدباب کے لئے اس کومفید، مؤثر اور نتیجہ خیر مانا جاتا ہے، اس لئے جب ملک میں نہایت وحشیانہ اور بہیمانہ طریقہ پر عصمت ریزی کے واقعات پیش آئے ہیں تو دائیں بازو کے بعض شدت پسند سیاست داں بھی ان واقعات کے خاتمہ کے لئے شرعی قانون کے نفاذ

کی خواہش کرتے ہیں، لیکن ایسے ظالمانہ واقعات کے سد باب کے لئے ملک کا اپنا ''کریمنل لاء'' موجود ہے، اس لئے باوجود خواہش اور آرزو کہ جرائم کی روک تھام کے لئے شرعی قانون کو نافذ نہیں کیا جاسکتا، پس جب ہمارے ملک میں مذہبی قوانین کی پابندی لے دے کہ چند شخص معاملات اور عائلی مسائل تک محدود رہ گئی، اس کے باوجود ان قوانین کو دستور کا تابع بنانا گویا اس کے دائرہ کو مزید تنگ کرنا ہے، اس تنگی کی وجہ سے اپنے اپنے مذہبی قوانین کی پابندی کرنے والے شہریوں میں بے چینی، برہمی اور بغاوت کی لہر پیدا ہوسکتی ہے، اس کے بعد ملک میں جو حالات پیش آئیں گے اور جو واقعات رونما ہوں گے وہ ؎ ''تنگ آمد بہ جنگ آمد'' کے مصداق ہوں گے۔

غرض یہ کہ یہ وہ حقائق ہیں، جن کی روشنی میں مسلم پرسنل لاء کے خلاف مرکزی حکومت کے حلف نامہ کی حقیقت اور معقولیت کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے اور مسلم پرسنل لاء کے خلاف مرکزی وزراء کے بیانات کی نوعیت اور حیثیت بھی واضح ہوتی ہے، اس حلف نامہ کے ذریعہ حکومت نے یونیفارم کوڈ کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی ہے، تاکہ قانون شریعت کو ''دستور کے پنجرہ'' میں بند کیا جاسکے اور مسلمان صرف شہری حقوق سے فائدہ اٹھانے کی حد تک آزاد وخودمختار رہ سکیں، البتہ شرعی حقوق سے استفادہ کے سلسلہ میں وہ دستور کے پابند اور تابع رہے، غلامی نمایہ آزادی ملک کی دوسری بڑی اکثریت کے لئے نہ کل منظور تھی، نہ آج ہے اور نہ آئندہ ایسی پُرفریب آزادی اُس کے لئے قابل قبول ہوگی، شاعرِ مشرق علامہ اقبال نے اپنی دور اندیشی اور دور بین نگاہ سے موجودہ حالات کا بہت پہلے اندازہ لگایا تھا، انھوں نے کہا ؎

ہے مملکت ہند میں ایک طُرفہ تماشا
اسلام ہے محبوس، مسلمان ہے آزاد

آہ! کس چیز کی جستجو تجھے آوارہ رکھتی ہے
منزل بھی تو ، راہبر بھی تو، راہرو بھی تو

نشانِ منزل!

زندگی نام ہے حرکت وعمل کا نہ کہ جمود وتعطل کا

زندگی کیا ہے؟ ایک فلسفہ ہے، جس کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے لوگوں نے اپنی زندگیاں کھپا دیں، کچھ تو وہ لوگ ہیں جن کے نزدیک زندگی کا فلسفہ قرآن مجید کے الفاظ میں اس طرح ہے: **وَ مَا هِيَ اِلاَّ حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوْتُ وَ نَحْيَا وَ مَا يُهْلِكُنَا اِلاَّ الدَّهْرُ** دنیاوی زندگی بس اسی کا نام ہے کہ زندہ رہیں اور مرجائیں اور مرنا بھی حکمِ الٰہی ومشیتِ خداوندی سے نہیں، بلکہ گردشِ زمانہ کی موت مرنا ہے۔ (سورۃ الجاثیہ: ۲۴) ایسے لوگ "دھریہ" کہلاتے ہیں، انہیں دین مذہب اور اللہ ورسول سے کوئی مطلب وسروکار نہیں ہے، ان کے نزدیک کائنات کا ہر عمل اور موت وزندگی کی ہر حرکت حالات وزمانہ کی مرہونِ منت ہے، جب تک زمانہ ہے کائنات کی یہ رنگارنگی اور زندگی کی بھاگ دوڑ ہے، پھر جب حالات اور زمانہ ختم ہوجائے گا ہر چیز اپنے آپ فنا ہوجائے گی، زندگی کا فلسفہ اور خلاصہ ان کے یہاں بس اتنا ہے کہ کھاؤ پیو، موج مستی کرو اور دنیا سے چلے جاؤ، نہ آخرت میں باز پرس وجوابدہی کا احساس اور نہ حساب وکتاب کا عقیدۂ واعتقاد۔

کسی دن صبح آپ شہر کے کسی مصروف ترین چوراہے یا شاہراہ پر نکل جائیں اور شاہراہ کے ایک جانب ہوکر ایک سرسری اور اچٹتی نگاہ آپ انسانوں کے سیل رواں پر ڈالیں، اِدھر سے اُدھر گذرنے والا مختلف گاڑیوں اور ٹھیلہ بنڈیوں کا ریلا آپ کو نظر آئے گا، اس میں خوشنما وخوبصورت اور آرام دہ کاروں میں سوار برسرروزگار اعلیٰ عہدیدار اور اہل ثروت مالدار بھی نظر آئیں گے، غریب پسینہ میں شرابور، محنت ومزدوری سے چور رکشا راں اور ٹھیلہ بنڈی والے خستہ حال افراد بھی، سماج کا ہر فرد اپنی حیثیت اور قسمت کے مطابق زندگی کی گاڑی کھینچ رہا ہے، کوئی پٹرول وڈیزل کے ساتھ تو کوئی اس کے بغیر ہی سہی۔

حرکت وعمل کے اس مجسم نمونہ اور مشاہدہ کو دیکھ کر بعض لوگ زندگی کا فلسفہ معدہ اور پیٹ بتاتے ہیں اور بس! اس کے آگے کچھ نہیں، مطلب یہ کہ زندگی کی یہ روانی اور بھاگ دوڑ صرف اس وجہ سے ہے کہ انسان اور اس کے اہل وعیال کو کھانے کے دو لقمے اور روٹی کے دو ٹکرے مل جائیں، ایسے لوگ روزگار اور کمائی کے سلسلہ میں خود کو آزاد اور خود مختار سمجھتے ہیں، حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی باتیں انہیں غیر ضروری پابندیاں اور خواہ مخواہ کی حد بندیاں معلوم ہوتی ہیں، کسی بھی ذریعہ سے روپیہ پیسہ بٹورنے اور اپنے لیے مال ودولت جمع کرنے کو وہ اپنا پیدائشی حق سمجھتے ہیں، اگر چہ وہ رشوت، دھوکہ وفریب اور دھونس و جمائی کے ذریعہ ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام ایک دینِ حق ہے، قانونِ فطرت ہے، زندگی کا کامل ومکمل دستور ہے، زندگی سے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر مذکورہ بالا دونوں فلسفہ سے بالکل الگ اور جداگانہ ہے، اسلام کے فلسفۂ زندگی میں جمود وتعطل کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں، اسلام، زندگی میں "جہدِ مسلسل اور عملِ پیہم" کا داعی اور حامی ہے، مگر اتنا بھی نہیں کہ انسان شتر بے مہار اور بے لگام ہوجائے، زندگی میں حرکت وعمل کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنی ذمہ داریوں اور حقوق کی ادائیگی کے ساتھ زندگی کو رواں دواں رکھے، اس کی حرکت وعمل میں خالق کی اطاعت ہو، مخلوق کی راحت ہو اور خود اپنے لیے آرام واطمینان اور باوقار زندگی کا سامان ہو، اسلامی نقطۂ نظر سے زندگی نام ہے بندگی کا، فرمانِ باری تعالیٰ ہے: میں نے تمام انسان اور جنات کو صرف میری عبادت کے لیے پیدا کیا۔ (سورۃ الذاریات:۵۶) عبادت وبندگی زندگی کے ہر شعبہ اور میدان میں خدا تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس کی فرمانروائی تسلیم کرنے کو کہتے ہیں۔

زندگی میں جمود وتعطل سستی وکاہلی کا نام ہے، سستی وکاہلی وقت کی ناقدری اور صحیح استعمال نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہے، وقت کی قدر وقیمت کا احساس وشعور جس میں ہو اس کی زندگی حرکت وعمل سے عبارت ہوتی ہے اور وہ اپنے زمانہ کا کامیاب انسان کہلاتا ہے، اسلام میں وقت کی اہمیت اور اس کی رعایت اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام کا نظامِ عبادت اوقات کے ساتھ مربوط ومخصوص ہے، نمازوں کے اوقات متعین ہیں، فجر کی نماز ظہر کے وقت نہیں پڑھی جاسکتی، روزوں کے واسطے رمضان کا مہینہ خاص ہے، حج اور قربانی کے لیے چند مخصوص ایام ہیں، غرض یہ کہ کوئی ایسی عبادت

اور فریضۂ بندگی نہیں کہ جس کے لیے وقت متعین نہ ہو، قرآن مجید میں "سورۃ العصر" کے نام سے ایک مختصر سورت موجود ہے، اس میں زمانہ کی قسم کھائی گئی، کسی چیز کی قسم کھانا اس کی اہمیت اور عظمت کو بتلانا ہوتا ہے، چنانچہ روایات میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپس میں ملتے تو اس سورت کا مذاکرہ کر لیتے ،تا کہ وقت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت ذہن میں تازہ رہے۔

اس سورت کے علاوہ قرآن مجید کی ایسی بہت سی آیات ہیں جن میں با مقصد زندگی گذارنے اور اپنی زندگی کا محاسبہ کرنے کی طرف توجہ دلائی گئی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ** (سورۃ الحشر: ۱۸) اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور ہر نفس کو چاہیے کہ وہ دیکھ لے اور غور کر لے اس چیز کو جو کچھ وہ آگے بھیج چکا ہے یا بھیج رہا ہے، ایک جگہ ارشادِ ربانی ہے: اور (قیامت کے دن) اعمال نامہ کھول کر رکھ دیا جائے گا، مجرم لوگ ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے اس کو دیکھیں گے، پھر کہیں گے کہ ہائے! ہماری بربادی اس کتاب (اعمال نامہ) کو کیا ہو گیا کہ یہ ہمارے اعمال کو محفوظ کرنے اور شمار کرنے میں نہ چھوٹی چیز چھوڑا ہے نہ بڑی چیز، پورا کچا چٹھا اس نے ہمارا پیش کر دیا۔ (سورۃ الکھف: ۴۹ مفہوم) نیک اور صالح لوگوں کے سیدھے ہاتھ میں یہ اعمال نامہ حوالہ کیا جاتا ہے، پھر جس کے سیدھے ہاتھ میں اعمال نامہ دیا جائے اس کے بارے میں قرآن مجید کا بیان ہے کہ ایسا شخص خوشی خوشی اپنا اعمال نامہ حاصل کرے گا اور کہے گا کہ مجھے معلوم تھا کہ ایک دن مجھے اپنے کیے کا حساب و کتاب دینا ہے، پھر وہ عیش و عشرت اور مزے کی زندگی میں رہے گا، اس پر اللہ تعالیٰ کے بہت سارے انعامات اور ڈھیر ساری نعمتوں کی بارش و نوازش ہوگی، اسی طرح نافرمان اور برے لوگوں کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، جب یہ لوگ اپنا اعمال نامہ لیں گے تو کہیں گے: اے کاش! یہ اعمال نامہ مجھے نہیں ملتا تو اچھا تھا، مجھے کیا خبر تھی کہ ایک دن اپنے کالے کرتوتوں کا حساب و کتاب دینا ہے، پھر اللہ کے حکم سے دردناک عذاب اس کا بدلہ اور کربناک زندگی نافرمان لوگوں کا حصہ ہوگی (مفہوم آیات: ۱۸ تا ۳۲ سورۃ القیامۃ) حساب و کتاب اور اعمال نامہ کے پیش کیے جانے کے موقع پر خوشی و مسرت اور افسوس و پچھتاوے کے اس پس منظر میں شاعر اسلام علامہ اقبالؒ کا یہ کہنا بہت ہی مناسب اور موزوں معلوم ہوتا ہے کہ:

یہ گھڑی محشر کی ہے تو عرصۂ محشر میں ہے
پیش کر غافل، عمل کوئی اگر دفتر میں ہے

غور کیا جائے اور سمجھنے کی اگر کوشش کی جائے تو بآسانی اندازہ ہوگا کہ روزِ محشر میں حساب و کتاب اور اعمال نامہ کا تعلق بھی وقت سے ہے، اس لیے کہ اعمال کا صدور اوقات میں ہی ہوتا ہے، وقت کا صحیح، بہتر اور مناسب استعمال اگر ہو تو اچھے اور نیک اعمال ہمارے نصیب میں ہوں گے، وقت ایک عظیم نعمت اور بیش بہا دولت ہے، جو جتنی زیادہ اس کی حفاظت اور قدر کرے گا کامیابی و کامرانی، سرخروئی اور سرفرازی اس کے قدم چومے گی اور جو شخص اپنی زندگی میں جتنا زیادہ غافل اور کاہل ہوگا ناکامی، نا امیدی اور احساسِ کمتری اس کا مقدر رہوگی۔

یوں تو جینے کو سبھی جیتے ہیں مگر
زندگی نام ہے احساس بیداری کا

....

اپنے وقت کی حفاظت دوسروں کے وقت کی رعایت دانش مندی کی علامت ہے

وقت کی ناقدری ـــــــ زندگی کی ناکامی

رسول اللہ ﷺ نے مختلف انداز اور پیرایۂ بیان میں وقت کی قدر و قیمت کو واضح فرمایا ہے، ارشادِ گرامی ہے: ''دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے متعلق بہت سے لوگ دھوکہ وغفلت میں پڑے ہوئے ہیں کہ یہ نعمتیں ہمیشہ باقی اور میسر رہیں گی، ایک صحت وتندرستی، دوسرے فرصت، جب تک آدمی صحت منداور تندرست ہوتو اس کو اپنی صحت کی قدر نہیں ہوتی اور نہ وہ اس کو باقی رکھنے کے لیے تدابیر اختیار کرتا ہے، جیسے ہی کسی بیماری نے آگھیرا اور اس کے صحت مند وتنومند جسم کو اپنا ٹھکانہ وآشیانہ بنایا تو ڈاکٹر وحکیم کا طواف شروع ہوتا ہے اور صحت کی بقاء کے لیے ہر طرح کی مصیبت اور جھمیلے جھیلنے کے لیے تیار، اسی طرح جب آدمی کو فرصت ہوتی ہے تو وہ اس کو کسی کام میں لائے بغیر یوں ہی بے کاری اور وقت گذاری کے طور پر ختم کر دیتا ہے، لیکن جب کاموں کا ہجوم ہو تو وہ الجھن و پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے، کئی اہم اور ضروری کام کرنے سے رہ جاتے ہیں، اس لیے عقل ودانش کا تقاضہ یہ ہے کہ فرصت کے اوقات میں پیش بندی اور منصوبہ سازی کے طور پر ضروری امور کو پہلے نمٹا لیا جائے، ایک دوسری جگہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو، بڑھاپے سے پہلے جوانی کو، بیماری سے پہلے تندرستی کو، فقر وتنگدستی سے پہلے مالداری کو، تفکرات میں پھنسنے سے پہلے فراغت کو اور موت سے پہلے زندگی کو۔ (ترمذی) آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میدانِ حشر میں انسان اپنی جگہ سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھے گا جب تک کہ وہ پانچ باتوں کا جواب نہ دے لے، ان میں ایک سوال اس کی عمر کے بارے میں بھی ہوگا کہ جو اس نے گذاری، حدیث میں مسلمان کی بہتری اور اچھائی کی علامت لایعنی فضول باتوں اور کاموں سے دوری کو بتایا گیا: **مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْ کُهٗ مَالَا يَعْنِيْهِ۔**

وقت کی قدر و قیمت اور اس کی اہمیت کا احساس جتنا زیادہ ہوگا زندگی میں حرکت اتنی ہی زیادہ

ہوگی ،یہی وجہ ہے کہ سلفِ صالحین اور بزرگانِ دین کی مبارک زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں وقت کا حد درجہ اہتمام اور پاس ولحاظ تھا، رات کے پچھلے پہر سے خالق کی عبادت وریاضت سے صبح زندگی کا آغاز ہوتا ،دن میں خلق خدا کی تعلیم وتربیت اوراصلاح وتزکیہ کے لیے پندونصیحت کی مجلسیں چلتی ،دوپہر کے وقت کچھ وقفہ بدن کوراحت دلانے اورطبیعت سستانے کے لیے آرام وقیلولہ کا ہوتا، کچھ وقت سنتِ نبوی ﷺ کے مطابق اپنے اہل وعیال اور بیوی بچوں کے ساتھ دلجوئی میں گذرتا، پھر رات کا ابتدائی حصہ کتابوں کی تصنیف وتالیف میں لگتا، غرض یہ کہ زندگی میں حرکت وعمل کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ،امام طبریؒ ،ابن حجر عسقلانیؒ ،ابن تیمیہؒ،امام نوویؒ،علامہ سیوطیؒ، حافظ ابن کثیرؒ اور دیگر اساطین علم کی گرانقدر تالیفات وتصنیفات کے صفحات شمار کیے گئے تو ایک ایک دن میں ۲۵ تا ۳۰ صفحات پڑتے ہیں۔ اندازہ لگایئے کہ اپنی دیگر تمام انسانی ضرورتوں کے باوجود ان بزرگوں نے وقت کا کتنا منظم اور منصوبہ بند انداز میں استعمال کیا، اس کے نتیجہ میں علم وتحقیق کا قیمتی ذخیرہ ہمیں دیکھنے اور پڑھنے کو ملا ہے، ماضی قریب کے مشہور عالمِ دین حضرت مولانا مفتی شفیع صاحبؒ جن کی تفسیر ''معارف القرآن'' کو اللہ تعالیٰ نے خاص مقبولیت عطا فرمائی ہے، ان کے بارے میں ان کے لائق وفائق فرزندِ ارجمند جلیل القدر عالمِ دین حضرت مولانا مفتی تقی عثانی دامت برکاتہم لکھتے ہیں:

> حضرت والد صاحبؒ کو وقت کی قدر وقیمت کا بڑا احساس تھا اور آپ ہر وقت اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مشغول رکھتے اور حتی الامکان کوئی لمحہ فضول جانے نہیں دیتے تھے، آپ کے لیے سب سے زیادہ تکلیف کی بات یہ تھی کہ آپ کے وقت کا کوئی حصہ ضائع چلا جائے،...... مجھے یاد ہے کہ جب حضرت والد صاحبؒ نے مجھے پہلے پہل ہاتھ کی گھڑی حجاز سے لاکر دی تو ساتھ ہی فرمایا کہ یہ گھڑی اس نیت سے اپنے پاس رکھو کہ اس کے ذریعہ اوقاتِ نماز کی پابندی کرسکو گے، میں بھی گھڑی اس لیے اپنے پاس رکھتا ہوں کہ وقت کو تول تول کر خرچ کرسکوں۔(اے انسان! وقت کی قیمت پہچان

ص:۱۳۰ازمؤلف مولانا محمد رضوان القاسمیؒ)

وقت کی پہچان اوراس کی قدردانی کی وجہ سے کامیابی وسربلندی کی منزلیں جلد طے پاتی ہیں، مثلاً یورپی اقوام ان میں اگرچہ بہت سی بیماریاں اور برائیاں ہیں لیکن وقت کی پابندی اوراہتمام کی خوبی وخصوصیت نے انہیں اپنے اندر برتری وفوقیت کا احساس دلارکھا ہے، مولانا عبدالماجد دریابادیؒ اپنے اخبار ہفت روزہ ''صدق جدید'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

ڈیلی میل (لندن) مورخہ ۳؍مارچ میں ایک گننے والے نے گن کراور جوڑ کر بتایا ہے کہ برطانیہ میں اس وقت کھانے پینے کی سامان کی دوکانیں چھ لاکھ ہیں، ان کے سامنے ہروقت گھر کی گرہستی والی خاتون کوایک گھنٹہ روزانہ انتظار میں کھڑارہنا ہوتا ہے، گرہستی والیوں کی تعداد اس وقت ایک کڑور ہے، تواس حساب سے قوم کے دس کڑور گھنٹوں کے سال بنایئے تو ۱۱۴؍سال ہوتے ہیں، گویا قوم کے ۱۱۴؍سال کی روزانہ اضاعت، زندہ قوم کی ایک ایک چیز زندہ ہوتی ہے، اپنے منٹوں اور گھنٹوں کا یہ حساب رکھنا برطانوی قوم کی موت وپستی کی نہیں زندگی وحرکت کی دلیل ہے۔

یہ بالکل الگ سوال ہے کہ جس چیز کووہ کام کی سمجھ رہے ہیں خود اس کا کیاوزن اورکیاوقعت آخرت کی میزان میں ہے، ہم آپ توکبھی نہیں سوچتے بیٹھتے ہیں کہ ہمارے وقت کا روزانہ کتنا حصہ، کتنے گھنٹے اورمنٹ اورسکنڈ محض بیکاری کی نذر ہوتے رہتے ہیں، دین وآخرت ہی نہ سہی دنیا کے ہی کس کارآمد مشغلہ میں ان کا شمار ہوسکتا ہے، یہ شطرنج اور یہ تاش، یہ فلش اور برج، یہ کیرم اور........ آخرکس حساب میں لکھے جائیں گے، یہ گھوڑ دوڑ کے دیکھنے اورطرح طرح کی بازیوں میں عمرعزیز جتنی گھڑیاں بے دردی سے صرف ہورہی ہیں، یہ زندگی کے کن مرحلوں کو طے کریں گی؟ اور یہ محض ہنسی اورتمسخر کی محفلیں، یہ سرگرم غیبتیں اوردل آزاریاں، یہ تہمتیں

> اور مبالغہ آرائیاں آخر کس کام آنے والی ہیں؟ اخلاق کو کہاں تک سنوارتی ہیں؟ ہر روز ہم میں سے ہر فرد کا کتنا وقت ضائع ہوتا ہے اور پھر ہر ہفتہ، ہر مہینہ، ہر سال اس کی میزان کہاں تک پہنچتی ہے؟ بھگتنا بہر حال ہر شخص کو اپنا ذاتی حساب ہوگا، ورنہ قوم کی قوم، ملت کی ملت کے تضییعِ وقت کا حساب جوڑنے کوئی بیٹھے تو حساب لگے یا نہ لگے بہر حال سر تو چکرانے ہی لگے گا۔ (حوالۂ سابق:۶۱)

زندگی میں جمود وتعطل، بے کاری، سستی وکاہلی کا شکار وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جو گھنٹوں اس فکر اور سوچ میں گذار دیتے ہیں کہ مجھے کیا کرنا ہے؟ جن کے ہفتے اور مہینے صرف اسی میں گذر جاتے ہیں کہ "میں یہ کروں گا، میں وہ کروں گا" ایسے دوست "خیالی پلاؤ" تو خوب پکا سکتے ہیں، لیکن عملی زندگی کا حقیقی مزہ اور لطف انہیں اس خیالی پلاؤ سے میسر نہیں ہوتا، بھلا ان "کاغذی گھوڑوں" (خیالی منصوبوں) سے کیا فائدہ اور کیا قیمت جو زندگی کی بھاگ دوڑ میں حصہ ہی نہ لے سکیں، زندگی کو خدا تعالیٰ کی نعمت اور اس کی امانت سمجھنے کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی زندگی میں حرکت وعمل کو لائے، جمود وتعطل قریب نہ آنے پائے، اس کا سب سے بہتر اور آسان نسخہ وقت کی قدر، اس کی پہچان، اس کی حفاظت اور اس کا صحیح استعمال ہے، وقت کا صحیح استعمال تب ہی ہوگا جب ہمارا ایک "ٹائم ٹیبل" ہو، اس کے مطابق ہم اپنی روزمرہ مصروفیتوں کا ایک شیڈول بنائیں اور اسی کے حساب سے زندگی کی گاڑی کو آگے بڑھائیں، شاعر نے شاید اسی کو کہا ہے ؎

عصر حاضر میں یہی ہے کامرانی کی سبیل
سامنے نظروں کے اپنے وقت کی رفتار رہے

............روزنامہ منصف ۷؍ ۲؍ مئی ۲۰۰۵ء............

رواداری کے نام پر مذہبی آوارگی

مذہب اور تہذیب کی ہمہ رنگی ہمارے ملک کی امتیازی خوبی اور بنیادی خصوصیت ہے، لیکن ہر معاملہ کی طرح نفع ونقصان کا پہلو اس میں بھی ہے، نفع کا پہلو تو یہ ہے کہ اس تکثیری و ہمہ رنگی سماج میں ایک دوسرے کے خیالات ونظریات کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے، پھر جس کے پاس ان مختلف خیالات ونظریات کو خوبی اور خرابی کے معیار پر پرکھنے اور جانچنے کی صلاحیت ہوتی ہے اس کے سامنے حق و باطل کی تمیز، صحیح اور غلط کا فرق دو اور دو چار کی طرح واضح ہوتا ہے، اسی طرح باہمی غلط فہمیاں اور بدگمانیاں ایک دوسرے سے تعلق اور سلوک و برتاؤ کی وجہ سے ختم ہوتی ہیں، پھر یہ کہ ایک دوسرے کی خوبیوں اور اچھائیوں کو قبول کیا جاتا ہے، اس طرح معاشرہ میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور قومی یکجہتی کا ماحول رہتا ہے۔

تکثیری اور ہمہ رنگی سماج کا نقصان دہ پہلو یہ ہے کہ اس میں سچائی رسوم وروایات میں گم ہو کر رہ جاتی ہے، حقیقت خرافات میں کھو جاتی ہے، مذہبی رسوم ورواج اتنے خلط ملط ہوتے ہیں کہ ملّی شناخت اور مذہبی تشخص خطرہ میں رہتا ہے، اکثریت چوں کہ ناخواندہ اور ان پڑھ لوگوں کی ہوتی ہے اس لیے ان کے سامنے حق و باطل کا واضح معیار نہیں ہوتا، وہ غلط وگمراہ رسوم وروایات کو بھی اپنے دین ومذہب کا حصہ بنالیتے ہیں، مسلمانوں میں بدعات وخرافات کا راستہ اسی ملی جلی تہذیب اور مخلوط سماج سے کھلا ہے، مسلم معاشرہ میں بہت سی برائیاں اور بیماریاں ہندو سماج سے درآمد ہوئی ہیں، مثلاً شادی بیاہ کے موقع پر جہیز اور گھوڑے جوڑے کی رقم، بیوہ خواتین سے نکاح کو عیب سمجھنا، عورتوں کو وراثت سے محروم کرنا وغیرہ ـــــ پھر یہ کہ بعض مرتبہ حالات اور واقعات کچھ ایسے رونما ہوتے ہیں کہ مذہبی عصبیت اپنا رنگ دکھاتی ہے، لوگوں کے اندر اپنے مذہب کے تعلق سے بے جا احساس برتری پیدا ہوتا ہے، پھر باہمی تعلقات میں دڑار پڑتی ہے، رفاقتیں رقابتوں میں بدل جاتی ہیں، ایک دوسرے کے اندر

مخالفت اور نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں، اس کے بعد ملک میں وہی کچھ ہوتا ہے جس کا آئے دن ہر ہوشمند مشاہدہ کرتا ہے اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی جو ملک کے لیے طرۂ امتیاز تھی اس کی جگہ فرقہ پرستی ملک کی پیشانی پر بدنما داغ بن جاتی ہے۔

اسی ہمہ رنگی سماج کے نقصان دہ پہلو کا ایک رخ یہ بھی ہے کہ آدمی دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے ساتھ رواداری کے جوش وجذبہ میں اپنے مذہب کے حقائق کو بھول جاتا ہے، مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کے متعلق خود اس کے مذہب کے حدود سے تجاوز کرتا ہے، اس کی مثال بالخصوص وہ مسلمان ہیں جو حکومت کے حلقوں اور اقتدار کے ایوانوں میں مسلمانوں کے نمائندے سمجھے جاتے ہیں، جو کسی اہم سرکاری عہدہ یا وزات کی کرسی پر براجمان ہیں، مذہبی رواداری میں ہندو دیوتاؤں کے سامنے نیاز مندانہ جھکتے ہیں، عبادت و بندگی کے سارے آداب بجالاتے ہیں، پھر اپنی اس خودساختہ "مذہبی رواداری اور بھائی چارگی" کو فروغ دینے کے لیے دیگر مذاہب کے مذہبی تہواروں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں ۔" بامسلمان اللہ اللہ بابرہمن رام رام" مسلمانوں میں "صلح کل" کے حامی اور داعی لوگ اکبر الہ آبادی مرحوم کی زبان میں اپنا حال کچھ یوں بیان کرتے ہیں ؎

عنایت مجھ پہ فرماتے ہیں شیخ وبرہمن دونوں
موافق اپنے پاتے ہیں میرا چلن دونوں
ترانے میری ہم آہنگ دیر وکعبہ ہیں یکساں
زباں پر میری موزوں ہوتی ہے حمد اور بھجن دونوں
مجھے ہوٹل کبھی خوش آتا ہے اور ٹھاکر دوارا بھی
تبرک ہے مرے نزدیک پرشاد ومٹن دونوں

یہ "دانشور" اور "روشن خیال" حضرات اپنے عمل سے دوسروں کو بھی یہ پیغام دیتے ہیں کہ ؎

مئے ہوٹل میں پیو چندہ بھی دو مسجد میں
شیخ بھی خوش رہیں اور شیطان بھی بیزار نہ ہو

گذشتہ دنوں برادران وطن کے ایک مذہبی تہوار "بونال" کی تیاریاں اور اس کی سرگرمیاں ختم

ہوئی ہیں ، ملک میں شاید ہی کوئی مہینہ یا موسم ہو جس میں اہلِ وطن کا کوئی مذہبی تہوار نہ ہوتا ہو، ان تہواروں کے موقع پر دیگر ابنائے وطن کی طرح مسلمانوں کی جانب سے بھی مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کے مناظر اور مظاہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

مذہبی رواداری کے بارے میں اسلامی احکام وتعلیمات کی وضاحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ مخلوط سماج میں رہنے والے ہر مسلمان کی ضرورت ہے، اس لیے کہ مذہبی تہواروں کے وقت سرکاری دفاتر میں، تعلیمی اداروں میں، پڑوسی اور دوستی کے حلقوں میں تحائف کے تبادلہ کے موقع پر اور شرکت کے مسئلہ پر یا کسی بھی طرح کے سلوک وبرتاؤ کے لیے ایک سچا اور پکا مسلمان اپنے آپ سے یہ سوال کرتا ہے کہ اس مرحلہ پر دین اسلام میری کیا رہنمائی کرتا ہے؟ کیوں کہ یہ محض خوش عقیدگی نہیں بلکہ حقیقت ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں اسلام کی رہبری موجود ہے، وہ شاہراہِ زندگی کے ہر موڑ اور چوارہے پر ''سگنل'' اور ''سنگِ میل'' کا کام دیتا ہے، اسلام کی اس جامعیت اور کاملیت کے پس منظر میں مذہبی رواداری کے متعلق چند واضح اسلامی تعلیمات پیشِ خدمت ہیں:

۱- مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا بنیادی نقطہ " آزادیٔ مذہب " اور " آزادیٔ عمل " ہے، اس لیے کہ جیسے انسانوں میں شکل وشباہت اور جسمانی ساخت وبناوٹ کا اختلاف ہے، اسی طرح فکر ونظر اور دین ومذہب میں بھی انسانوں کا اختلاف ایک روشن حقیقت ہے، ضروری نہیں کہ تمام انسان صرف ایک ہی نظریہ یا عقیدہ کے پابند وپیروکار ہوں، کسی کی سوچ وفکر باپ دادا کی پیروی اور آبائی وخاندانی رسوم ورواج کی بجا آوری پر مطمئن وقانع ہے تو کوئی اپنے ''علم وفہم'' کے لحاظ سے تین خداؤں کی عبادت وبندگی کو صحیح سمجھتا ہے اور کچھ لوگ اپنے افکار وخیالات کے مطابق ساڑھے تین کروڑ معبودوں کی عبادت پر یقین رکھتے ہیں، غرض یہ کہ ہر گروہ اپنی فکری اور نظریاتی نتیجہ پر شاداں وفرحاں ہے: كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ۔

ایک جمہوری اور سیکولر سماج میں جہاں میں امن وآشتی کے فروغ اور تحفظ کے لیے ''مذہبی آزادی'' ہر شہری کا بنیادی اور فطری حق ہے، اس بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر اور اس کی تعلیمات بالکل واضح اور روشن ہیں، دین ومذہب میں آزادی کے حق کو اسلام میں تسلیم کیا گیا ہے، قرآن مجید میں ارشاد ہے:

لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ''تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے'' (سورۃ الکافرون:٦)

۲- مذہبی رواداری کے لئے آزادیٔ مذہب اور آزادی عمل کی بات جب ہی صحیح اور حقیقت پر مبنی ہوگی جب کسی مذہب کو قبول کرنے میں کوئی زور زبردستی نہ ہو، چنانچہ اسلام میں یہ بھی جائز اور روا نہیں کہ کسی دوسرے شخص کو زور زبردستی مذہب کا پابند اور پیروکار بنایا جائے: لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (سورۃ البقرۃ:٢٥٦) دین و مذہب کے معاملہ میں زور وزبردستی نہ ہونا اور مذہبی آزادی کے حق کا منطقی نتیجہ ''آزادیٔ عمل'' ہے، جب انسان کو اپنے عقیدہ و یقین کی آزادی حاصل ہے تو وہ اپنے عمل میں بھی آزاد وخود مختار رہنا چاہے گا، گویا مذہبی آزادی اور عمل کی آزادی دونوں میں ''چولی دامن'' کا ساتھ ہے، اسلامی شریعت وقانون میں آزادیٔ عمل کا بھی حق تسلیم کیا گیا ہے، ہر شخص کو اپنے اعمال کا جوابدہ بنایا گیا ہے، قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا فرمان ہے: لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ''ہمارے اعمال ہمارے لیے اور تمہارے اعمال تمہارے لیے'' (سورۃ البقرۃ:١٣٩) ایک جگہ فرمایا گیا کہ ہمارے کاموں کے تم جوابدہ نہیں اور تمہارے کرتوتوں کے بارے میں ہم سے باز پرس نہیں ہوگی: قُلْ لَّا تُسْأَلُوْنَ عَمَّا أَجْرَمْنَا وَلَا نُسْأَلُ عَمَّا تَعْمَلُوْن (سورۃ السباء:٢٥)

۳- پھر یہ کہ مختلف مذاہب اور نظریات کے حامل سماج میں بعض مرتبہ ایک دوسرے کے خلاف مخالفانہ جذبات ہوتے ہیں، مذہبی جوش میں وہ ایک دوسرے کے معبودوں کو برا بھلا کہتے ہیں، اسلام میں اس طرزِ عمل سے منع کیا گیا ہے، قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ''تم مشرکین کو گالی مت دو اس لیے کہ وہ بغیر جانے بوجھے محض دشمنی اور عداوت میں اللہ کو گالی دیں گے'' (سورۃ الانعام:١٠٩)۔ غرض یہ کہ آزادیٔ مذہب اور آزادیٔ عمل کے حوالہ سے باہم گالی گلوچ سے ممانعت کے بارے میں اسلام کی یہ روشن تعلیمات اور رہنمایانہ اصول ہیں، جو ایک جمہوری اور سیکولر سماج میں قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی باقی رکھنے میں بنیادی رول ادا کرتے ہیں۔

۴- قومی یکجہتی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کا عملی نمونہ خود پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ نے اپنی مبارک زندگی میں پیش فرمایا، جب آپ ﷺ ہجرت کے موقع پر مدینہ تشریف

لائے، اس وقت آپ ﷺ نے باہر کے حملہ آوروں سے مدینہ کی حفاظت وسلامتی اور متفقہ دفاع کے لیے مدینہ کے تمام قبائل کو جمع فرمایا، اس سلسلہ میں دستاویزی طور پر جو تحریری معاہدہ مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان ہوا اس میں واضح انداز میں یہ فقرہ موجود ہے: ''یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک گروہ ہیں، یہودیوں کے لیے ان کا دین ہے اور مسلمانوں کے لیے ان کا دین'' ایک جگہ آپ ﷺ نے واضح طور پر فرمایا کہ غیر مسلموں کا خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے اموال ہمارے مالوں کی طرح ہیں: **دِمَائُھُمْ کَدِ مَائِنَا وَأَمْوَالُھُمْ کَأَمْوَالِنَا** مطلب یہ کہ انسانی جان ومال کے تحفظ وبقاء کے لیے اسلام میں دین ومذہب، رنگ ونسل اور زبان وتہذیب کی کوئی تفریق وتخصیص نہیں، تمام انسانوں کا خون اور مال اسلام میں یکساں ہے اور قابل عظمت واحترام ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دورِ خلافت اور اس کے بعد اسلامی سلطنتوں میں بھی مذہبی آزادی، رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی عملی مثالیں تاریخ میں ملتی ہیں، مثلاً: سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں بیت المقدس فتح ہوا آپؓ وہاں تشریف لے گئے، بعض راہبوں نے آپؓ سے ایک چرچ میں نماز پڑھنے کی خواہش کی، لیکن حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے گریز کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ آئندہ مسلمان اس جگہ زبردستی مسجد بنالیں، اسی طرح سلطنتِ بنوامیہ کے فرماں رواں مروان بن عبد الملک نے اپنے زمانہ میں دمشق کی جامع مسجد سے متصل چرچ کی چھوٹی سی زمین کو جامع دمشق میں شامل کر دیا تھا، پھر جب حضرت عمر بن عبد العزیز نے خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تو عیسائیوں نے اپنے چرچ کی زمین کے تعلق سے مقدمہ دائر کیا، حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے جامع مسجد دمشق میں شامل کردہ چرچ کی زمین پر تعمیر شدہ عمارت کو منہدم کرنے کا حکم دے دیا لیکن بعد میں خود عیسائی حضرات اس زمین کے بدلہ دوسری جگہ قبول کر لی، اس کے علاوہ اسلامی حکومت کے تحت مخلوط سماج میں ہر فرد کو اپنے مذہب کے ''پرسنل لا'' قوانین کی پابندی اور پیروی کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے، نکاح وطلاق کے متعلق فیصلے وہ اپنے مذہب کے مطابق کر سکتے ہیں، کھانے پینے اور خرید وفروخت کے متعلق اسلام کا قانونِ حلال وحرام ان پر نافذ نہیں ہوگا، شراب مسلمانوں پر حرام ہے، لیکن جن کے مذہب میں یہ ممنوع نہیں ہے ان کے لیے شراب پینے پر پابندی

نہیں ہوگی ،خنزیر اور مردار اسلام میں حرام ہے ،لیکن غیر مسلم اس کے کھانے اور خرید وفروخت میں آزاد ہوں گے۔

مذہبی روادی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی سے متعلق اسلام کی ان روشن تعلیمات اور واضح ہدایات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا یہ کتنا معقول اور قابل قبول تصور ہے،صرف ایک سچے مسلمان کے لئے نہیں بلکہ ہر انصاف پسند انسان کے لئے یہی تصور قابل عمل ہے، اگر کوئی ''روشن خیال'' اور دانشور قسم کے ''مسلمان'' ان اسلامی تعلیمات کو چھوڑ کر اپنی پراگندہ ذہنیت کے مطابق مذہبی رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں تو ایسی رواداری کا اسلام سے ذرہ برابر کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ یہ رواداری اسلام کی حقیقت کو مجروح کرنے اور اُس کی حقانیت کو مشکوک بنانے کی ایک دیدۂ ودانستہ کوشش ہے اور اس سے بڑھ کر رواداری کے نام پر ''مذہبی آوارگی'' ہے، اللہ تعالیٰ ہر مسلمان کو ایسی مذہبی آوارگی سے محفوظ رکھے۔

..................روزنامہ منصف، ۱۰/اگست ۲۰۰۷ء..................
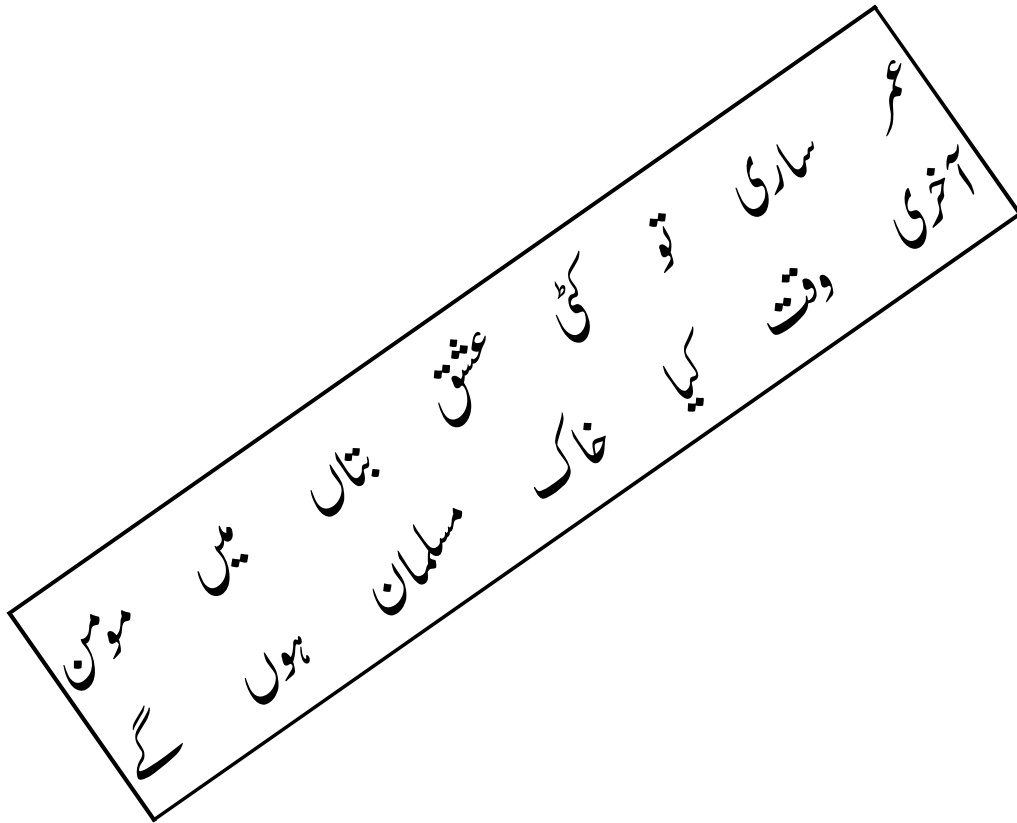
مذہبی رواداری ـــــــ حدود دائرہ کار

دنیا میں کوئی بھی چیز اپنی حد اور دائرہ میں اچھی اور بھلی لگتی ہے، یہاں تک کہ خوشی اور مسرت کے موقع پر جب آدمی کے جذبات حد اور دائرہ سے نکل کر بے قابو ہو جائیں تو پھر یہی خوشی و مسرت کا موقع غم اور ماتم میں بدل جاتا ہے، مذہبی رواداری، ایک اچھی چیز اور بھلی بات ہے، مذہبی تشدد اور تعصب کے موجودہ ماحول میں اس کی اہمیت اور افادیت پہلے سے بڑھ کر ہے، لیکن دوسری چیزوں کی طرح مذہبی رواداری کی بھی ایک حد اور دائرہ ہے، اگر یہ حد اور دائرہ سے باہر ہو جائے تو بجائے فائدہ کے الٹا نقصان وہ ثابت ہوتی، اسلام افراط وتفریط سے پاک عدل اور اعتدال کا مذہب ہے، قرآن مجید میں مسلمانوں کو ''امت وسط'' فرمایا گیا، اس لئے مذہبی رواداری کے معاملہ میں اتنی زیادہ وسعت اور گنجائش نہیں رکھی گئی کہ مذہب کی حقیقت موم کی سی ہو جائے اور دین وشریعت ''فٹ بال'' بن جائے کہ جب چاہے، جدھر چاہے اور جیسا چاہا اچھال دیا، اور نہ اتنی سختی اور شدت رکھی گئی کہ تعصب اور فرقہ پرستی کو ہوا ملے، اسلامی تعلیمات میں غور وتدبر کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلام میں مذہبی آزادی اور اُس سے متعلق تمام حقوق کو وضع کرنے کے علاوہ مذہبی رواداری کے حدود وقیود بھی متعین کئے گئے، ان حدود وقیود کو سمجھنے سے معلوم ہوگا کہ مذہبی رواداری کا موقع محل کیا ہے اور کیا ہونا چاہیے؟

چناں چہ ''خدمت خلق'' مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کا سب سے بہتریں موقع اور محل ہے، یہاں ''وحدت ادیان'' کی بنیاد پر نہیں بلکہ ''وحدت آدم'' کی بنیاد پر اسلام کی رفاہی وفلاحی تعلیمات ہیں، چناں چہ اسلام نے انسانیت کی فلاح وبہبودی کے متعلق اپنی تعلیمات اور ہدایات میں کسی خاص قوم، رنگ ونسل، مذہب وملت اور طبقہ وپیشہ کی کوئی تقسیم وتفریق نہیں کی، مثلاً: اللہ کے رسول ﷺ نے پوری مخلوق کو اللہ کا کنبہ فرمایا اور مخلوق کے ساتھ جو اچھا برتاؤ کرے اس کو اللہ تعالیٰ کے نزدیک

سب سے زیادہ پسندیدہ اورمحبوب قرار دیا:اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عَیَالِہٖ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ لوگوں میں بہترین شخص وہ ہے جو لوگوں کے لیے نفع رسانی کا کام کرے: خَیْرُ النَّاسِ مَنْ یَّنْفَعُ النَّاسَ پھر یہ کہ آپ ﷺ نے پڑوسیوں کے ساتھ حسن سلوک اوران سے اچھے برتاؤ کی تعلیم وتلقین کی، اسی سلسلہ میں احادیث کی اہم مشہوراورمستند کتابوں میں مستقل ابواب ہیں، آنحضرت ﷺ نے قسم کھاکرفرمایا کہ وہ شخص مؤمن ومسلمان نہیں جس کی ایذارسانی اور تکلیف سے اس کا پڑوسی محفوظ نہیں، پڑوسیوں میں ظاہر ہے کہ مسلم اورغیرمسلم ہرمذہب کے پیروکار بستے ہیں، اس لیے یہ اسلامی تعلیمات تمام پڑوسیوں کے لیے ہیں۔

انسانیت کی فلاح وبہبودی اورفرقہ وارانہ ہم آہنگی سے متعلق اسلام کی روشن تعلیمات صرف نظریاتی نہیں ہیں، بلکہ خودرسول اللہ ﷺ، خلفائے راشدین اورمسلم حکمرانوں نے ان کا عملی نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا، ایک یہودی کے گھر میں اس کا لڑکا بیمار ہوا، آپ ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے، دیکھا کہ لڑکا بالکل قریب المرگ ہے اورموت وزیست کی حالت میں ہے، آپ ﷺ نے اس کوکلمۂ شہادت کی تلقین کی، لڑکے نے اپنے باپ کی طرف نظریں اٹھائیں، یہودی باپ نے لڑکے سے کہا: بیٹا! ابوالقاسم (حضرت محمد ﷺ) کی بات مان لو، لڑکے نے کلمۂ شہادت پڑھا اورتھوڑی دیر بعد اس کی روح پرواز کرگئی، اس کے بعد رسول اللہ ﷺ خوشی کے عالم میں یہ کہتے ہوئے یہودی کے گھر سے باہرآئے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَنْقَذَہٗ مِنَ النَّارِ اللہ ہی کے لیے حمد وثنا ہے جس نے لڑکے کوجہنم کی آگ سے بچالیا، اس واقعہ میں جہاں رسول اللہ ﷺ نے پڑوسی ہونے کی حیثیت سے یہودی گھرانے کے ساتھ حسن سلوک کی عملی تعلیم دی، وہیں رسول اورپیغمبر ہونے کے ناطے اپنے فرضِ منصبی کوبھی پورافرمایااوردنیامیں کسی انسان کے لیے اس سے بہتراور برتر بھلائی اورصحیح خیرخواہی کیاہوسکتی ہے کہ اس کوہدایت مل جائے اوروہ آخرت میں دوزخ کے عذاب سے بچ جائے، یہی تو انسان کی سب سے بڑی کامیابی ہے: فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّۃَ فَقَدْ فَازَ۔ (سورۃ آل عمران:۱۸۵)

پس انسانیت کی فلاح وبہبودی سے متعلق نیکی وتقویٰ اورخیروبھلائی کےتمام کاموں اورسرگرمیوں میں

اسلام نے مذہب وملت کا کوئی فرق وامتیاز نہیں رکھا ، رفاہی خدمات اورخیراتی کام ہی اصل میں مذہبی رواداری اور بھائی چارگی کا موقع ومحل ہیں،اس لیے کہ ان میں انسان بحیثیتِ انسان دوسروں کے کام آتا ہے ،وہ اپنے اندر کوئی مذہبی تحفظات نہیں رکھتا اوریہی وہ کام ہیں جن سے انسانوں کے دکھ درد کو سمجھا اور بانٹا جاسکتا ہے، مذہب وملت سے پرے ہوکران کے ذریعہ قومی یکجہتی اورفرقہ وارانہ ہم آہنگی کو پروان چڑھایا جاسکتا ہے،اور یہ رفاہی خدمات باہمی تعاون اورتال میل کو قائم کرنے اوررکھنے میں مفیداورمعاون ثابت ہوتی ہیں۔

اس کے برخلاف خالص مذہبی رسوم اورتہواروں میں شرکت کرنے والوں میں مذہبی رواداری اورفرقہ وارانہ ہم آہنگی سے زیادہ اپنی شہرت ونا موری اورریا کاری کا جذبہ ہوتا ہےاور سچی بات بھی ہے کہ جوشخص ان مواقع پراپنے مذہبی حدودکا پابند نہ ہووہ اپنے مذہب کامخلص اورخیرخواہ نہیں ہوسکتا، پس جس چیز کی وجہ سے دنیا میں اس کی شناخت قائم ہےاورملّی تشخص باقی ہے، جب وہ اس کا خیرخواہ اورمخلص نہیں رہاتو پوری انسانیت کامخلص کیسے ہوسکتا ہے؟اس لیے خالص مذہبی تہواروں اورتقاریب کے موقع سے رواداری اور بھائی چارگی کے نام نہاد مظاہرے رواداری نہیں بلکہ مذہب بیزاری اورمذہبی آوارگی کے نمونہ ہیں،خدافراموشی اورخودفریبی کی مثالیں ہیں ،ایک سچے اور پکے مسلمان کا یہ شیوہ اورشعار ہونا چاہیے کہ وہ جہاں بھی ہو،جس کے بھی ساتھ ہواور جوبھی موقع ہووہ توحید کاعلمبردار اورایک وحدہٗ لاشریک کا پرستار بن کررہے،وہ بامسلمان اللہ اللہ تو رہتا ہی ہے،اس کو بابرہمن بھی اللہ اللہ ہی رہنا چاہیے نہ کہ رام رام۔

دنیا کے دوسرے مذاہب کے درمیان اسلام کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے،وہ اپنے عقائدونظریات اورتعلیمات کے تعلق سے بہت ہی غیرت منداورحساس واقع ہوا ہے،اس تعلق سے اسلام میں ذرّہ برابربھی لچک نہ رکھی گئی اورنہ اس کو برداشت کیا گیا،چنانچہ قرآن مجید میں سب سے زیادہ قوت اورشدت کے ساتھ شرک کی مذمت وبرائی بیان کی گئی ،شرک کے معاملہ میں ذرا بھی نرمی اوررواداری نہیں برتی گئی ،رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ایک مرتبہ مکہ کے مشرکین آئے ،اس وقت توحید کی دعوت علیٰ الاعلان زوروں پرتھی ،مشرکین مکہ نے آپ ﷺ کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ کچھ دن وہ اپنے جھوٹے معبودوں کو

چھوڑ کر آپ ﷺ کی دعوتِ توحید کے مطابق ایک اللہ وحدہٗ لاشریک کی عبادت کریں گے اور کچھ دن آپ ﷺ ان کے معبودوں کی عبادت کریں، تا کہ روز روز کا جھگڑا واختلاف ختم ہو جائے، اس پر سورۃ الکافرون نازل ہوئی، جس میں مشرکین مکہ کی اس پیش کش کو سختی کے ساتھ مسترد کر دیا گیا اور آنحضرت ﷺ کے زبانِ مبارک سے اعلان کروایا گیا کہ اے نبی! کہہ دیجیے اے کافرو! تم جن کی عبادت کرتے ہو میں ان کی عبادت نہیں کروں گا، صرف شرک ہی نہیں بلکہ جہاں شرک کا شبہ، شائبہ اور مشابہت پیدا ہوتی ہے اس کا بھی اسلام میں خاتمہ کر دیا گا، مثلاً: نمازِ جنازہ، اس میں رکوع وسجود اس لیے نہیں رکھے گئے کہ اس سے میت کی عبادت و بندگی کا شبہ پیدا ہوتا ہے، اسی شرک کی ممانعت ومذمت کی بناء پر مجسمہ سازی سے روکا گیا، ایک معمولی اور چھوٹی سی نیکی اگر کی جائے اور اس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کی رضاء وخوشنودی پیش نظر رہے تو یہ نیکی بھی منہ پر ماردی جاتی ہے، پس ایک غیرت مند شوہر کو اپنی ہر جائی بیوی پر جو غیرت آسکتی ہے خدا کی آتشِ غضب بندوں کے مشرکانہ اعمال وافعال پر اس سے زیادہ بھڑکتی ہے، اسی لیے صبح وشام کی زندگی میں لمحہ بہ لمحہ دعائیں سکھلائی اور دل نشین کرائی گئیں تا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی بڑائی ویکتائی اور اس کے اختیار واقتدار کا احساس باقی رہے۔

اسلام قبول کرنے کے بعد اس کے پیروؤں کی اپنی الگ شناخت وپہچان بنتی ہے، ان کا الگ ملی تشخص قائم ہوتا ہے، اسلام میں اس دینی ومذہبی پہچان اور ملی تشخص کی حفاظت پر بھی زور دیا گیا اور ہر ایسی چیز سے روکا گیا جو اس کے لیے خطرہ بنتی ہو، مثلاً ملی تشخص کو سب سے بڑا خطرہ کسی دوسری قوم اور مذہب سے مشابہت اختیار کرنے میں ہوتا ہے، بالخصوص مراسم عبودیت وبندگی میں ذرّہ برابر مشابہت اور شرکت سے کسی بھی شخص کی ملی شناخت شدید مجروح ہوتی ہے، چنانچہ اسلام میں سورج کے نکلنے، ڈوبنے اور نصف النہار پر ہونے کے وقت نماز پڑھنے سے اس لیے منع کیا گیا کہ اس سے دوسری قوموں سے مشابہت اور مماثلت ہے، جو ان اوقات میں عبادت وپوجا پاٹ کرتے ہیں۔ (سنن نسائی باب النہی عن الصلوٰۃ بعد العصر) ماہِ محرم میں یوم عاشوراء کے موقع سے مسلمانوں کو دو روزے رکھنے کا حکم دیا گیا، تا کہ یہودیوں کی مخالفت ہو، کیوں کہ وہ ایک روزہ رکھتے تھے، ایک مرتبہ مسلمانوں نے موسمِ بہار کی آمد اور اس کے اختتام پر ایرانیوں کی طرح تہوار منانے کی اجازت چاہی،

لیکن آپ ﷺ نے اجازت نہیں دی۔ (مشکوٰۃ بحوالہ سنن ابی داؤد حدیث نمبر: ۱۴۳۹)

غور کرنے کا مقام ہے کہ جس دین و مذہب میں عقیدۂ توحید کی یہ نزاکت ہو کہ اس میں تھوڑی سی بھی لچک گوارہ نہیں اور مسلمانوں کے ملی تشخص کی یہ اہمیت ہو کہ اس میں ادنیٰ درجہ کی مماثلت اور مشابہت کی اجازت و گنجائش نہیں تو یہ پھر مسلمان کے لئے کیسے جائز ہو سکتا ہے کہ وہ ایسے تہواروں جو خالص مذہبی ہیں، جن کی جڑ میں مشرکانہ عقائد پیوست ہیں اور وہ اپنی اس شرکت کو مذہبی رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا نام دیں۔

پس جس مسلمان کو مذہبی رواداری کا موقع و محل، فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا اسلامی تصور معلوم ہو اور عقیدۂ ایمان کی نزاکت اور اپنے ملی تشخص کی اہمیت کا احساس اس کو ہو تو وہ مذہبی تہواروں کے موقع سے رواداری و فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے نام نہاد مظاہروں اور ہنگاموں سے دور رہے گا، اس دوری کی وجہ سے کسی کے ناراض ہونے یا روٹھ جانے کا غم و افسوس بھی نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دو عالم سے خفا میرے لیے ہے

..................روزنامہ منصف: ۱۷/ اگست ۲۰۰۷ء..................

> ”خالص مذہبی تہواروں اور تقاریب کے موقع سے مذہبی روادای اور بھائی چارگی کے پُرفریب مظاہرے، رواداری نہیں بلکہ مذہب بیزاری، فکر آوارگی اور ذہنی آلودگی کے بدترین نمونے ہیں، خدا فراموشی اور خوفریبی کی شرمناک مثالیں ہیں“

عقل اور عقیدت کی جنگ

اللہ تعالیٰ کی کن کن نوازشوں کو یاد کیا جائے اور کونسی نعمتوں کا شکر ادا کیا جائے؟ اس لیے کہ ہمارا انگ انگ اس کے انعامات واحسانات اور عنایات میں جکڑا ہوا ہے اور اس کی رحمت بے کراں میں ڈوبا ہوا ہے، عقل ودانائی، یہ انسان پر اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، یہ اگر نہ ہوتو انسان اپنے سماج میں پاگل ومجنون کہلانے لگے، اس کی باتیں سنی ان سنی کردی جائیں، اس کی ادائیں اور حرکتیں کھیل تماشہ اور وقت گذاری کا ذریعہ بن جائیں، اگر کوئی شخص صاحبِ عقل ہو، لیکن عقل استعمال کرنے کا دائرہ اور ''عقل لڑانے'' کا موقع ومحل معلوم نہ ہوتو یہی خداداد نعمت اس کے لیے مصیبت ہوتی ہے اور نقصان ومحرومی کا ذریعہ بنتی ہے، اس لیے صرف عقل نہیں بلکہ عقل کا محلِ استعمال معلوم ہونا اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

عقل کے دائرۂ کار اور محلِ استعمال سے واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے عقل اور عقیدت میں جنگ برپا ہوتی ہے، دونوں میں تصادم اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے، کچھ لوگ دین ومذہب کے معاملہ میں اپنی عقل لڑاتے ہیں اور مذہب کی جو چیز ان کے عقلی معیار پر کھری اور پوری اترتی ہے اس کو قبول وتسلیم کرتے ہیں، اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عقائد ونظریات کے بارے میں تو اس طرح کی سوچ وفکر صحیح ہے، مثلاً ہندو مذہب میں بت پرستی، عقیدہ ونظریہ پر مبنی ہندو تہوار اور عیسائی مذہب میں عقیدۂ تثلیث اسی طرح دیگر مذاہب بدھ مت، جین مت، سکھ مت وغیرہ کے نظریات ہیں، ان میں آباء واجداد کی تقلید اور اندھی عقیدت کے بجائے عقل وشعور سے کام لینے کی ضرورت ہے، لیکن جہاں تک دین اسلام کی بات ہے تو اس کے بارے میں معلوم رہے کہ یہ عدل واعتدال کا مذہب ہے، اس میں ہر چیز کو اس کے دائرہ کار اور محلِ استعمال میں رکھ کر اس کی اہمیت وافادیت کو تسلیم کیا گیا۔

اسلامی عقائد ونظریات کو قبول وتسلیم کرنے کے سلسلے میں نہ صرف عقل کے استعمال کرنے کی

اجازت دی گئی بلکہ دعوت دی گئی کہ وہ ان عقائد کو سمجھنے کے لیے عقل و دانائی سے کام لیں، مثلاً خدا تعالیٰ کے وجود، اس کی توحید، رسالت و نبوت اور مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا، ان امور کی وضاحت وتشریح کے لیے قرآن مجید میں جا بجا کائنات میں پھیلی اور بکھری ہوئی قدرت کی نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی، زمین وآسمان کی تخلیق اور سورج و چاند کے ذریعہ گردش ایام کے نظام پر غور وفکر کی دعوت دی گئی، ایسی قرآنی آیات میں اکثر جگہ اُوْلِی الْاَلْبَابِ (عقل والے) کا جملہ آیا ہے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاتَّقُوْنِ یَا اُوْلِی الْاَلْبَابِ (سورۃ البقرۃ: ۱۹۷) اے عقل رکھنے والو مجھ سے ڈرو! ایک جگہ ارشاد ہے: وَمَا یَتَذَکَّرُ اِلاَّ اُولُو الْاَلْبَابِ عقل مند لوگ ہی نصیحت قبول کرتے ہیں، قرآن مجید میں اس طرح کی آیات سے بعض لوگوں کو یہ دھوکہ اور مغالطہ ہوا کہ اسلام عقل والوں کا مذہب ہے، جب کہ حقیقت اور سچائی یہ ہے کہ اسلام غیر مشروط خود سپردگی کا نام ہے، بلا چون و چرا اور بغیر پس وپیش کے رب کی بندگی وغلامی اور رسول کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے کا نام ''اسلام'' ہے، چاہے شریعت کا کوئی حکم عقل کے پلے پڑے یا نہ پڑے، مومن اپنا سر تسلیم خم کر دیتا ہے کہ ؎ ''مؤمن فقط احکامِ الٰہی کا پابند'' اگر اسلام واقعی عقل وخرد کا مذہب ہوتا تو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم یہ طعنہ نہیں دیتی کہ تمہاری اتباع و پیروی کرنے والے ہم میں بے وقوف اور کم عقل والے لوگ ہیں: وَمَا نَرٰی اتَّبَعَکَ اِلاَّ الَّذِیْنَ ھُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِیَ الرَّأْیِ (سورۃ ھود: ۲۷)۔ خود رسول اللہ ﷺ کے سفر معراج کا انکار بھی عقل کی بنیاد پر کیا گیا، کیوں کہ مشرکین مکہ کی عقلوں میں یہ بات نہیں سما سکی کہ ایک ہی رات میں مسجد حرام سے بیت المقدس اور وہاں سے سات آسمانوں کا سفر کیسے ممکن ہوسکتا ہے؟ پس اسلام میں عقل پسندی کی حوصلہ افزائی تو کی گئی لیکن عقل کی ''پرستش'' نہیں سکھائی گئی، انسان کی بہتری اور سلامتی بھی اسی میں ہے کہ وہ عقل کو اس کے دائرہ اور حدود میں رکھے، جو چیز عقل کے دائرے میں نہیں ہے بلکہ اس کے آگے کی چیز ہے اس کو عقل کی ترازو میں تولنے کی حماقت نہ کرے۔

پس اسلام میں حدود متعین کر دیے گئے کہ کہاں عقل کا استعمال ہو اور کہاں نہ ہو، مثلاً غیب کی باتوں سے جن اُمور کا تعلق ہے، جیسے جنت، جہنم، عذابِ قبر، فرشتے وغیرہ انہیں عقلی معیار پر پرکھنے اور جانچنے کی اجازت نہیں، اسی طرح معجزات ہیں، یہ چوں کہ رسول کی صداقت وسچائی کے لیے خود ان

کے دستِ مبارک پر اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے خلافِ حقیقت اور خارقِ عادت کسی واقعہ کا ظہور فرماتے ہیں، اس لیے ان معجزات کو بھی عقل کی ترازو میں نہیں تولا جاسکتا ہے، یہ نری حماقت اور کھلی جہالت نہیں تو اور کیا ہے کہ خدا تعالیٰ کی لامحدود قدرت کو آپ اپنی محدود عقل میں ٹھونسنے کی کوشش کریں، پھر جب وہ سمانہ سکے تو بجائے اپنی کوتاہ عقلی وکم عقلی کے اقرار کے اللہ تعالیٰ کی عظیم تر قدرت ہی کا انکار کر بیٹھے، اس کے علاوہ شریعت کے وہ احکام اور تعلیمات ہیں جن کو فقہ کی اصطلاح میں ''امر تعبدی'' کہتے ہیں یعنی محض اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنا ہے، اگرچہ ظاہری طور پر اس حکم کی کوئی علت اور وجہ سمجھ میں نہیں آتی، ان میں بھی عقل نہیں لڑائی جائے گی، البتہ حکماءِ اسلام اور فلاسفۂ اسلام نے عقلی اور فلسفیانہ انداز میں شرعی احکام کی جو تشریحات کی ہیں اور ان کے فوائد پر روشنی ڈالی ہے وہ محض ایمان ویقین میں اضافہ اور پختگی کے لیے ہے، نہ اس لیے کہ وہ ایمان ویقین اور تسلیم ورضاء کی بنیاد ہیں، اس سلسلہ میں دنیاءِ اسلام کی نابغۂ روزگار شخصیات امام غزالیؒ کی کتاب ''احیاء العلوم'' اور حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب ''حجۃ اللہ البالغۃ'' اسلامی علوم کے ذخیرہ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔

غیبی امور، معجزات اور شرعی احکام کو عقل کے دائرہ کار سے اس لیے باہر رکھا گیا کہ ان کا تعلق ''وحی'' سے ہے، ان کے بارے میں تمام معلومات اور تفصیلات رسول اللہ ﷺ نے بذریعہ وحی ہم کو بتائی ہے، عقل کی صلاحیتوں کی پرواز جہاں ختم ہوئی ہے وہاں سے وحی کے علوم کا آغاز ہوتا ہے، اس لیے جو لوگ غیبی امور اور بعض شرعی احکام کو خلاف عقل سمجھتے ہیں درحقیقت وہ خلاف عقل نہیں ''ماوراء عقل'' (عقل سے آگے کی چیز) ہوتے ہیں، بعض لوگ خود کو ''دانشور'' اور ''روشن خیال'' کہلوانے کے شوق میں ان دیکھی کسی چیز پر ایمان لانے اور اس کا یقین کرنے کو ''اندھی عقیدت'' کہتے ہیں، خود مسلمانوں کی صف میں ایسے نام نہاد دانشور اور روشن خیال پیدا ہوئے جنہوں نے غیبی امور کا انکار کیا، عقل وفلسفے کے مطابق ان کی اور معجزات کی ایسی تاویلات اور تشریحات پیش کی کہ غیبی امور اور معجزات کی حقیقت ختم ہوکر رہ گئی، مذہب سے متعلق غیب کی باتوں پر ایمان لانے اور ان پر یقین کرنے کو ''اندھی عقیدت'' بتانا دراصل اپنے فہم وفراست اور عقل وخرد کے دیوالیہ ہونے کا ثبوت دینا ہے، اس لیے کہ دنیا کا ہر شخص اپنی جگہ ''اندھا عقیدت مند'' ہے، وہ بہت سی ایسی چیزوں کو مانتا

اور تسلیم کرتا ہے جس کو اس نے کبھی دیکھا نہیں اور نہ اس کا مشاہدہ کیا، مثلاً ہر شخص اپنی روح کا یقین رکھتا ہے اور اس کے وجود کو تسلیم کرتا ہے، جب کہ اس کو معلوم ہی نہیں کہ اس کی کیا ہیئت ہے اور کیسی شکل وصورت ہے؟ بن دیکھے ''ہوا'' پر آدمی یقین رکھتا ہے جب کے ہوا اپنے جسم و جان کے ساتھ نظر ہی نہیں آئی۔۔اس کے علاوہ دنیا کے بہت سارے ممالک ہیں جن کے متعلق آدمی صرف سنتا ہے وہاں کبھی گیا نہیں اور دیکھا نہیں لیکن وہ ان کے وجود کا قائل ہے، غرض یہ کہ دنیاوی معاملات اور روزمرہ زندگی کے مسائل پر غور کرنے سے ''اندھی عقیدت'' کی بات ہر جگہ صادق آتی ہے۔

بہر حال صحیح عقل مندی اور سچی عقیدت مندی یہ ہے کہ انسان دونوں کے درمیان توازن اور اعتدال قائم رکھے، اپنی سوچ و فکر سے دونوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط نہ کرے، جہاں عقل مندی سے کام لینا ہے وہاں ''اندھی عقیدت'' کا مظاہرہ نہ کرے اور جہاں عقیدہ کا معاملہ ہے وہاں ''عقل نہ لڑائے'' اسی میں دنیا و آخرت کی بھلائی و کامیابی ہے اور عقیدۂ و ایمان کی سلامتی بھی۔

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اُسے تنہا بھی چھوڑے

"اسلام میں عقل سے کام لینے کی حوصلہ افزائی تو کی گئی لیکن عقل کی ''پرستش'' نہیں سکھائی گئی، انسانی زندگی کی بہتری، اعمال کی درستگی اور عقیدۂ و ایمان کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ وہ ہر جگہ ''عقل کے گھوڑے'' نہ دوڑائے"

عقل ودانائی کا ناروا استعمال

اللہ تعالیٰ کے بے شمار انعامات واحسانات میں ایک اہم انعام عقل ودانائی ہے، عقل مند انسان زندگی کے کسی بھی مسئلہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں بہت جلد کامیاب ہوتا ہے اور مشکل سے مشکل تر معمّوں کو معمولی چٹکیوں میں حل کرلیتا ہے، جس کے اندر فہم وفراست کا مادہ ہو، حق وباطل کی پہچان اور صحیح وغلط کی تمیز اُس کے لئے آسان ہوتی ہے، اس کے علاوہ یہ بات بھی اہم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کس بھی نعمت کی قدر وقیمت اور اُس کی اہمیت کا صحیح اندازہ اُسی وقت ہوسکتا ہے، جب آدمی کو یہ بھی معلوم ہو کہ وہ نعمت کہاں استعمال کی جائے؟ کیسے استعمال کی جائے؟ اور کتنی استعمال کی جائے؟ جیسے ''نمک'' ایک معمول کے استعمال کی چیز ہے، اگر یہ میٹھی چیز میں استعمال کیا جائے تو میٹھا بدمزہ ہوجائے گا اور کھانے میں ضرورت سے زیادہ پڑ جائے تو کھانا کھانے میں کوئی لطف اور مزہ نہیں آئے گا۔

اس لئے اسلامی تعلیمات میں جہاں بندوں پر اللہ تعالیٰ کے ان گنت انعامات واحسانات کا تذکرہ ہوتا ہے وہیں اس کی بھی وضاحت کی گئی کونسی نعمت کب، کہاں اور کتنی استعمال کی جائے؟ چنانچہ عقل ودانائی کے بارے میں اسلام کا معتدل اور متوازن موقف یہ ہے کہ اس کا ناجائز اور ناورا استعمال نہ ہو بالخصوص غیبی امور اور معجزات کو عقل کی ترازو میں نہ تولا جائے چنانچہ جن لوگوں نے عقل کے متعلق اسلام کے معتدل اور متوازن موقف کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی انھوں نے اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام پر اعتراضات کرنے شروع کردیے، وہ شدید غلط فہمی کا شکار ہوئے، نوبت یہ آئی کہ انہیں نہ صرف اپنی عقل ودانائی کی ''فاتحہ'' پڑھنی پڑی، بلکہ اپنے دین وایمان کی بھی خیر منانی پڑی، اس سلسلہ میں ایک دومثالوں کا ذکر فائدہ سے خالی نہ ہوگا۔

اسلامی تاریخ میں ''باطنیہ'' نامی فرقہ گذرا ہے، اس فرقہ کا لیڈر عبداللہ القیر اوانی خالص عقلی نقطۂ نظر سے سگی بہن اور بیٹی سے نکاح کرنے کی پرزور وکالت کرتا ہے اور اس کی حرمت پر حیرت وتعجب کا اظہار کرتا ہے، یہ شخص اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے:

’’اس سے زیادہ تعجب کی بات اورکیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص عقل کا دعویدار ہونے کے باوجود ایسی حماقتیں کرتا ہے کہ اس کے پاس نہایت خوبصورت بہن یا بیٹی موجود ہوتی ہے اور خوداس کی بیوی اتنی حسین نہیں ہوتی مگر وہ اس خوبصورت بہن یا بیٹی کو اپنے او پر حرام قرار دے کر اسے کسی اجنبی سے بیاہ دیتا ہے، حالاں کہ ان جاہلوں کو اگر عقل ہوتی تو وہ یہ سمجھتے کہ ایک اجنبی شخص کے مقابلہ میں اپنی بہن اور بیٹی کے وہ خود زیادہ حقدار ہیں، اس بے عقلی کی وجہ دراصل صرف یہ ہے کہ ان کے آقا نے ان پر عمدہ چیزوں کوحرام کردیا ہے‘‘

(الفرق بین الفرق ص:۲۹۸ مطبوعہ مصر بحوالہ اسلام اور جدت پسندی، مؤلف مولانا تقی عثمانی)

اس گھناؤنی عبارت کی گندگی اور خباثت کی جتنی بھی لعنت وملامت کی جائے کم ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وحی الٰہی کی رہنمائی سے آزاد اور انسانی اقدار واخلاق سے عاری خالص عقل کی بنیاد پر عبداللہ القیر وانی کی اس عبارت کورَد کرنے کا کوئی جواب اور دلیل آپ نہیں پائیں گے، اس لیے کہ بات بالکل سیدھی اور آسان ہے کہ جو بہن یا بیٹی اپنے ہاتھوں سے لذیذ، مزیدار اور چٹخاروں سے بھرپور پکوان کے ذریعہ آدمی کے کھانے کی بھوک کو مٹاسکتی ہے تو وہ اس کے ’’جنسی بھوک‘‘ کی تسکین کیوں نہیں کرسکتی؟ بہرحال یہ عقل کی ’’پرستش‘‘ اور ’’پوجا‘‘ کی ایک شرمناک مثال ہے، صدیوں پہلے باطینہ نے یہ بات کہی تھی آج مغربی ممالک میں سگی بہن سے شادی کرنے کی آوازیں اٹھ رہی ہیں، اس طرح عبداللہ القروانی کا خواب شرمندۂ تعبیر ہورہا ہے۔

دوسری مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے رفع اور نزول سے متعلق اسلامی عقیدہ کی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں ہمارا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہود کے جبر وتشدد سے بچا کر بحفاظت اپنی جانب اٹھالیا، آپؑ کی طبعی وفات نہیں ہوئی بلکہ آپؑ آسمانوں میں انسانی جسم کے ساتھ زندہ ہیں، پھر آپؑ قیامت کے قریب دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے (نازل ہوں گے) اور ۴۰ رسال باحیات رہ کر طبعی طور پر وفات پائیں گے، دنیا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دوبارہ آمد سے

متعلق ہر بات کی تفصیل موجود ہے، مثلاً یہ کہ کب اتریں گے؟ کہاں اتریں گے؟ کیسے اتریں گے؟ کب تک رہیں گے؟ کیا کیا کریں گے؟ اور اس وقت دنیا کے کیا حالات ہوں گے؟ اور کیا واقعات پیش آئیں گے؟ ان سارے امور کی تفصیل ''باب نزول عیسیٰ ابن مریم'' کے عنوان سے حدیث کی کتابوں میں موجود ہے، اس عقیدہ کی وضاحت وتشریح کے سلسلہ میں علماءِ اسلام کی مستقل کتابیں اور رسائل ہیں جن میں اس عقیدہ سے متعلق آیات، احادیث اور آثار کا احاطہ کیا گیا، ملاحظہ ہوں ''علاماتِ قیامت اور نزولِ مسیح'' مرتب مولانا رفیع عثمانی ''حیات ونزولِ عیسیٰ کا عقیدہ چودہ صدیوں کے اکابر کی نظر میں'' مصنفہ حضرت مولانا محمد یوسف لدھیانویؒ۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسمانی زندگی اور دوبارہ آپ کی تشریف آوری خالص اللہ تعالیٰ کی عظیم اور لامحدود قدرت کا معاملہ ہے، اس میں بھی لوگوں نے عقل کے گھوڑے دوڑانے شروع کردیے، چنانچہ قادیانیت کے بانی اور پیشوا مرزا غلام احمد قادیانی نے جہاں اسلام کے بنیادی اصول اور عقیدۂ ختم نبوت کا انکار کیا وہیں اس شخص نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسمان پر زندگی اور قربِ قیامت دنیا میں دوبارہ تشریف آوری کے اسلامی تصور کو بھی جھٹلایا، مرزا صاحب عقل کی بنیاد پر لکھتے ہیں:

> اگر ہم فرضِ محال کے طور پر قبول کرلیں کہ حضرت مسیح (عیسیٰ علیہ السلام) اپنے جسم خاکی کے سمیت آسمان پر پہونچ گئے تو اس بات کے اقرار سے ہمیں چارہ نہیں کہ وہ جسم جیسا کہ تمام حیوانی وانسانی اجسام کے لیے ضروری ہے، آسمان پر بھی تاثیر زمانے سے ضرور متاثر ہوگا اور یہ مرورِ زمانہ لابدی اور لازمی طور پر ایک دن ضرور اس کے لیے موت واجب ہوگی، پس اس صورتِ حال میں تو حضرت مسیح کی نسبتاً ماننا پڑتا ہے کہ اپنی عمر کا دورہ [دوران] آسمان پر ہی فوت ہوگئے ہیں...... (ازالہ اوہام، ص: ۲۵-۲۶)

آسمانوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے متعلق قادیانی لٹریچر میں اس طرح کے اشکالات اور شبہات ملتے ہیں کہ آپ علیہ السلام اپنی بشری تقاضوں اور انسانی ضرورتوں کو کیسے پورا کررہے ہوں گے؟ آپ کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا، وہاں پر آپ زکوٰۃ کس کو دیتے ہوں گے؟ قرآن مجید کا فیصلہ ہے كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ہر نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے، کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام انسان نہیں تھے؟ وغیرہ

وغیرہ۔(تفصیل ملاحظہ ہومحمدیہ پاکٹ بک ص:۵۴۰)

پھر یہ کہ کسی چیز سے حددرجہ مرعوبیت آدمی کی ذہنی وفکری صلاحیتوں کو مغلوب ہی نہیں مفلوج کردیتی ہے، وہ اس سے ہٹ کر اپنی الگ جداگانہ رائے قائم نہیں کرسکتا، ایسا ہی کچھ حال مرزاصاحب کا ہوا، ان کے دَور میں جدید سائنس وٹکنالوجی اور علوم وفنون کی ترقی جو کچھ بھی ہو اور جیسی بھی ہو لیکن ان سے مرزاصاحب حددرجہ مرعوب تھے، یہی مرعوبیت ان کے لیے عقیدۂ نزول مسیح کے انکار کا محرک بنی، ان سائنسی اور فلسفی علوم سے اپنی حددرجہ مرعوبیت کا اظہار مرزاصاحب یوں کرتے ہیں:

''اس فلسفی الطبع زمانہ میں جو عقلی شائستگی اور ذہنی تیزی اپنے ساتھ رکھتا ہے ایسے عقیدہ (نزول مسیح) کے ساتھ دینی کامیابی کی امید رکھنا ایک بڑی بھاری غلطی ہے......ہم ایسی تعلیمات کو جو عقل وتجربہ اور طبعی اور فلسفہ سے بکلی مخالفت اور نیز ہمارے نبی کریم ﷺ کی طرف سے ثابت نہیں ہوسکتیں ......تعلیم یافتہ لوگوں میں ہرگز نہیں پھیلا سکتے......(ازالہ اوہام،ص:۱۳۵)

مرزاصاحب کا یہ اقتباس عقل وفلسفہ کی غلامی میں اپنی مثال آپ ہے، عقیدۂ نزولِ مسیح کے بارے میں مرزاغلام احمد قادیانی کی غلطی اور قادیانی فرقہ اور دیگر لوگوں کی گمراہی کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اس عقیدہ کو باری تعالیٰ کی عظیم تر قدرت اور لامحدود اختیارات کے پس منظر میں دیکھنے اور تسلیم کرنے کے بجائے اپنی محدود اور نارسا عقل کی ترازو میں تولنے اور ناپنے کی احمقانہ کوشش کی، دوسرے یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت اور پوری زندگی معجزانہ ہے، آپؑ کی ولادت معجزانہ طریقہ پر ہوئی، والدہ کو گود میں آپؑ نے گفتگو کی، اسی طرح دیگر اور معجزات ہیں جن کا قرآن میں تذکرہ ہے، جب آپؑ بطور معجزہ ان تمام امور کا واقع ہونا قبول وتسلیم کرتے ہیں تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی آسمان پر زندگی پھر دوبارہ زمین پر نزول کو بطور معجزہ تسلیم کرنے میں کیا پریشانی اور دشواری ہے؟؟ تیسرے یہ کہ قانون کا حوالہ اور دہائی صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول پر کیوں دی جاتی؟ جب کہ آپ کی ولادت کیا عام قانونِ قدرت اور نظامِ اسباب کے مطابق تھی؟ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ کی طرح وہاں قانون کا حوالہ کیوں اور کس لیے نہیں دیا جاتا؟ اصل بات یہ ہے کہ ہم اور آپ قانونِ قدرت

اور نظامِ اسباب کے پابند ہیں، اللہ کی ذات اس سے بے نیاز ہے، وہ اگر چاہے تو بھڑکتے اور دہکتے آگ کے شعلوں کو گل گلزار بنا دے، پہاڑ کی چٹان سے اونٹنی کو پیدا کرے، قدرتی طور پر نظام کی خلاف ورزی کی صورت میں باز پرس اور سوال ہم سے ہوگا نہ کہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے، اس لیے کہ وہ خود نظامِ قدرت کا حاکم و مالک ہے: **لاَیُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ** (سورۃ الانبیاء: ۲۳)۔

غرض یہ کہ جو شخص عقل کے دائرۂ کار اور اس کے محلِ استعمال سے واقف نہیں ہوگا وہ عقل اور عقیدت کے درمیان فاصلہ نہیں رکھ پائے گا، اس کے نتیجہ میں عقل اور عقیدت کے درمیان جنگ برپا ہوگی اور اس شخص کا ذہن و دماغ اس جنگ کا کھلا اور وسیع میدان ہوگا، اس لیے سچی عقل مندی اور دانشمندی یہی ہے کہ آدمی عقل کے استعمال سے زیادہ اس کے حدود کو جانے، سمجھے اور اس کو باقی رکھے، عقیدہ کی درستگی اور فکر و نظر کی سلامتی بھی اسی میں ہے کہ جو چیز آدمی کے لیے عقیدہ اور نظریہ کی حیثیت رکھتی ہے وہ اس کو محض عقل و فلسفہ کے طور پر قبول نہ کرے بلکہ اس کو اپنے عقیدۂ و نظریہ پر دل سے اطمینان ہو، اس کا دل گواہی دے رہا ہو کہ میں سچائی اور حق و انصاف کی راہ پر ہوں، اس موقع سے شاعر اسلام علامہ اقبالؒ کا یہ کہنا بالکل بجا اور برمحل معلوم ہوتا ہے کہ: ؎

خرد نے کہہ بھی دیا لاالٰہ تو کیا حاصل
دل مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

عقل کے فتنہ اور اس کے شر سے محفوظ رہنے کے لیے قرآن مجید کی یہ دعا بہت ہی پیاری اور جامع ہے: **رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً اِنَّکَ اَنْتَ الْوَھَّابُ**۔ (سورۃ آل عمران: ۸)

......روزنامہ منصف ۱۴؍ڈسمبر ۲۰۰۷ء......

"جو لوگ وحی الٰہی کی بنیاد پر ثابت شدہ اور تسلیم شدہ نظریات و تعلیمات کو عقل کی ترازو میں تولتے ہیں، وہ احمقانہ انداز میں قطرہ کا سمندر سے اور رائی کا پہاڑ سے موازنہ کرتے ہیں"

داستانِ قدم ـــــ ایک شکستۂ پاء کے قلم سے

حادثات، صدمے اور غم کے واقعات، غفلت اور معصیت سے جگانے اور بیدار کرنے کا ''الارم'' ہوتے ہیں، تاکہ گنہ گار انسان غفلت کی نیند سے بیدار ہو اور اُس کی زندگی میں نیکی وتقویٰ کا انقلاب آئے جو اُس کی زندگی کا رُخ اور دَھارا موڑ دے، گذشتہ دنوں ایک حادثہ کی وجہ سے اس حقیر کے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی، ہوا یوں کہ یہ حقیر صبح نیند سے بیدار ہوکر گھر کی چھت پر جارہا تھا کہ اچانک کسی ضرورت سے پلٹا اور سیڑھیاں اترنے لگا، آنکھوں میں ابھی نیند کا خمار تھا، اس لیے غفلت وغنودگی اور جلد بازی میں پیر پھسلا، آواز کے ساتھ ہڈی ٹوٹی اور میں توازن کھوکر نیچے گر پڑا، پانچ ماہ بسترِ مرض پر پڑا رہا، اللہ تعالیٰ کی شفقت ومہربانی اور شانِ رحیمی وکریمی سے صحت یابی ہوئی، والدین، اہلِ خانہ وخاندان، اساتذہ وبزرگان، دوست واحباب اور چاہنے والوں کی پرخلوص اور پرسوز دعائیں کام آئیں، خدا کرے کہ بیداری کا یہ ''الارم'' اس غفلت شعار اور گنہ گار بندہ کو جگائے رکھے اور اُس کی زندگی اصلاح وسدھار کی راہ پر لگ جائے۔ آمین

یہ حادثہ میری زندگی کا ناقابلِ فراموش واقعہ ہے، اس لیے کہ کوئی نقل وحرکت نہیں تھی، بے مصرف بھاگ دوڑ کی مصروفیت ختم ہوگئی، روزمرہ کی زندگی گویا ہمہ وقت چلنے والی مشین تھی کہ اچانک ایک پرزہ کی خرابی کی وجہ سے جام سی ہوگئی، بس ایک کمرہ میں بند، چارپائی سے چمٹے مجبوری اور معذوری کے دن پورے کیے جارہے تھے اور وقت گذاری ہورہی تھی، انسان پر تعجب ہے کہ دینی مجلسوں میں شرکت کے لیے وقت کی کمی کا بہانہ بناتا ہے اور دینی اعمال کی ادائیگی بالخصوص رمضان المبارک میں اعتکاف کے لیے اپنی شدید مصروفیت کا حوالہ دیتا ہے، لیکن ذرا اِدھر حادثہ ہوا کہ ۲۰ رمنٹ، آدھا گھنٹہ اور چند دن نہ بیٹھنے والا مہینوں گھر بیٹھ جاتا ہے ـــــ یہ حادثہ چونکہ پیر (قدم) سے متعلق ہے، اس لیے پیر اور قدم کے بارے میں نصیحت وموعظت کے کچھ پہلو اور اسباق

مجھے یاد آئے، مخلص ومہربان دوستوں اور کرم فرماؤں کی ذرّہ نوازی پر خیال ہوا کہ اپنے دینی واسلامی بھائیوں کو بھی میں شریکِ درس کروں اور انھیں اپنا ہم سبق بناؤں۔

غفلت وکوتاہی کی مذمت: پہلا سبق یہ کہ زندگی میں بے ہوشی، مدہوشی اور غفلت وغنودگی کی مذمت ومضرت معلوم ہوئی، ہوشیاری اور بیدار مغزی کی اہمیت وضرورت کا احساس ہوا، جیسے غفلت وغنودگی میں اینٹ وگارے کی سیڑھیوں پر قدم رکھنا نقصان دہ ہے، ایسے ہی اگر انسان زندگی کی مختلف سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگے تو اُس کو اپنی غفلت وغنودگی کی بڑی قیمت چکانی پڑتی ہے، زندگی کی بھی سیڑھیاں ہیں، تعلیم، تجارت، ملازمت اور شریکِ حیات کا انتخاب وغیرہ، ان سیڑھیوں پر قدم رکھتے وقت آدمی پوری طرح ہوشیار اور بیدار مغز رہے، ورنہ ذراسی غفلت وغنودگی، مدہوشی اور لاپرواہی سے زندگی اُس کے لیے وبالِ جان ہوجاتی ہے، بندۂ مومن کا شیوہ اور شعار یہ ہو کہ وہ زندگی کی کسی بھی سیڑھی پر قدم رکھنے یا کسی بھی منزل کی جانب قدم اٹھانے سے پہلے بہت ہی احتیاط اور توجہ سے کام لے، اس کو دینی بصیرت اور مومنانہ فراست سے بھی تعبیر کیا گیا ''اتقوا فراسة المؤمن، فانه ینظر بنور الله'' مؤمن کی فراست سے ڈرو، اس لیے کہ وہ معاملات اور مسائل کو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی روشنی میں حل کرتا اور سلجھاتا ہے۔

پھر یہ کہ آدمی کو اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے قدم سنبھال کے رکھنے کی ضرورت ہے، اس لیے کہ قدم کے پھسلنے کے نقصان میں آدمی کی شخصیت اور حیثیت کا بڑا دخل ہے، ایک سابق امریکی صدر کے بارے میں خبر آئی تھی کہ ادھر ''مابدولت'' کا پیر پھسلا اور اُدھر شیرز مارکٹ میں زبردست گراوٹ آگئی، قدم پھسلنے کے نقصان میں پھسلنے والی کی شخصیت اور ساکھ کو کتنا بڑا دخل ہوتا ہے؟ یہ بات ایک بوڑھی خاتون نے اپنے دانشمندانہ جواب سے اچھی طرح سمجھائی، امامِ اعظم ابوحنیفہؒ ایک مرتبہ راستہ سے تشریف لے جارہے تھے، دیکھا کہ ایک بوڑھی خاتون بھی گیلے راستہ سے گذر رہی ہیں، امام صاحب نے از راہِ محبت وہمدردی کہا کہ ''اما جان! ذرا سنبھل کے چلنا، پیر پھسل نہ جائے'' امام صاحبؒ کی معاشرہ میں عوامی پہچان تھی اور آپؒ کی خاص علمی شان تھی، بوڑھی خاتون نے امام صاحب کو پہچان کر کہا ''بیٹا! میرا قدم پھسلنے سے صرف میرا اپنا نقصان ہے، تم سنبھل کے رہو، اس لیے کہ

تمہارا قدم پھسلنے سے پوری قوم کا نقصان ہوگا، بوڑھی خاتون کے اس جواب سے امامِ اعظم ابوحنیفہؒ کو اپنے مقام ومنصب کے ساتھ اُس کی نزاکت وذمہ داری کا بھی احساس ہوا۔

جو لوگ دینی اور دنیوی امور میں قیادت وسیادت کے منصب پر فائز ہیں، انہیں بہت ہی ''پھونک پھونک'' کر قدم رکھنا اور قدم اٹھانا چاہیے، عربی کا محاورہ ہے کہ ''زلة العالم زلة العالَم'' عالِم کا پھسلنا عالَم کا پھسلنا ہے، پس ثابت قدمی ایک عالم کی سب سے بڑی اور بنیادی ضرورت ہے، اس لیے کہ عالم کا قدم پھسلنے کے بعد وہ بہت کم اپنی غلطی کو محسوس کرتا ہے، اگر احساس ہو بھی جائے تو اعتراف کی ہمت وجرأت شاید ہی کرے، پھر یہ کہ اگر اس موقع پر نفسانیت اور انانیت کو راہ مل جائے تو اُس کو اپنی غلطی کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ''دلائل'' کے انبار لگا دینا کچھ مشکل نہیں، اس کی پاداش میں اللہ تعالیٰ اُس کے علم وفہم اور عقل ودانائی کے باوجود اُس کو گمراہ کر دیتے ہیں، وَاَضَلَّهُ اللّٰہ عَلٰی عِلْمٍ، ایسے مخلص علماء بہت کم ہیں، جنہوں نے ٹھوکر کھائی، پھر ان کے اخلاص، دیانت وامانت کے بدولت توفیقِ الٰہی نے دستگیری کی، انھیں اپنی غلطی وکوتاہی کے اعتراف واقرار اور اُس سے رجوع کرنے میں کوئی شرم اور عار محسوس نہیں ہوئی، دنیا میں جتنے بھی گمراہ، بے دین اور ملحد فرقے موجود ہیں یا گذرے ہیں، ان کے پیشواؤں اور پیروکاروں میں ایک بڑی تعداد صاحبانِ علم کی بھی ہے، جن کے علم اور معلومات کا بڑا شہرہ اور دبدبہ تھا، لیکن ان لوگوں نے اپنے علم سے حق کی تحقیق اور ترویج کے بجائے باطل کی تائید اور توسیع کا کام لیا، مثلاً حکیم نورالدین بھیروی، قادیانی گروہ کا اہم شخص ہے، یہ اپنے وقت کا بڑا صاحبِ علم اور شاہی طبیب تھا، اس شخص کو قادیانیت کا دماغ سمجھا جاتا ہے، مرزا غلام احمد قادیانی کو اپنے جھوٹے دعوؤں کی جتنی تعبیرات اور جھوٹی پیشین گوئیوں کی جو جو تاویلات اور توجیہات سوجھتی تھیں، وہ سب حکیم نورالدین کے دماغ کی پیداوار ہوتیں، ان لوگوں کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ ''ضلوا فاضلوا'' خود بھی گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، اس کے علاوہ امتِ مسلمہ کی تاریخ میں سیاسی اور عوامی قائدین کے غلط اقدام کرنے اور غلط قدم اٹھانے کے واقعات بھی ہیں، جن کی سزا عام لوگوں کو جھیلنی پڑی اور شاید بعض غلطیاں ایسی بھی ہیں کہ ان کی سزا اب بھی ہم پا رہے ہیں۔

تاریخ نے ایسا بھی دور دیکھا ہے
لیڈروں نے خطا کی ، قوموں نے سزا پائی
(معذرت کے ساتھ)

قدم سے متعلق قرآنی آیات واحادیث: اس حادثہ کے موقع پر ''قدم'' سے متعلق قرآن وحدیث کی ہدایات بھی ذہن نشین ہوتی رہیں، قرآن مجید میں شیطان کے نقش قدم پر چلنے سے منع کیا گیا، کیونکہ اُس سے بے حیائی اور بُرائی کے کاموں کو کرنے کی تحریک اور ترغیب ملتی ہے۔ ''**یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ فَاِنَّہٗ یَاْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْکَرِ**'' (سورۃ النور:۲۱) پھر اخیر زمانہ میں شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مسلمانوں میں اتنی زیادہ بڑھ جائے گی کہ وہ اپنے سے پہلے معتوب اور مغضوب قومیں یہود ونصاریٰ کے ''ہم قدم'' نظر آئیں گی، شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی اس لیے ہوتی ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی اطاعت وفرمانبرداری میں ثابت قدم نہیں ہوتا، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کے نیک اور برگزیدہ بندوں کی دعا موجود ہے کہ ''بارِ الٰہا! ہمارے قدم کو جمادے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مددونصرت فرما'' **وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَی الْقَوْمِ الْکَافِرِیْنَ** (سورۃ آل عمران:۱۴۷)، پس جیسے میدانِ جہاد میں کفار کے مقابلہ کے وقت ثابت قدمی ضروری ہے، اسی طرح نفس سے مقابلہ اور جہاد کے وقت ثابت قدم رہنا ضروری ہے، حدیث میں نفسانی خواہشات سے مقابلہ اور ان کی مخالفت کو ''جہادِ اکبر'' فرمایا گیا، شریعت کی پابندی اور پیروی کے سلسلہ میں نفس کے چونچلوں، بہانوں اور اُس کی حیلہ سازیوں کو نظرانداز کرنا اور ہمیشہ نفس کی غلامی سے آزاد رہنا ہی دراصل دین وایمان پر ثابت قدم رہنے کی بنیاد ہے۔

جب دنیا میں مسلمان شرعی احکام کی پابندی، ایمان کی سلامتی اور نفسانی خواہشات کی قربانی میں ثابت قدمی کے ساتھ اپنی زندگی پوری کرے گا تو روزِ قیامت حشر کے میدان میں اللہ تعالیٰ کے حضور سوال وجواب کے وقت اُس کے ''قدم'' نہیں ڈگمگائیں گے اور نہ لڑکھڑائیں گے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن کسی شخص کے قدم اپنی جگہ سے اُس وقت تک نہیں ہٹیں گے جب تک کہ چار عمومی سوال جواب اُس سے نہ کرلیے جائیں، ایک یہ کہ عمر کیسے گذاری؟ دوسرے یہ کہ

جوانی کہاں گنوائی؟ تیسرے یہ کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟ چوتھے یہ کہ علم پر کتنا عمل کیا؟ (الترغیب والترھیب ۴/ ۲۱۴) دین وایمان پر ثابت قدمی جہاں حصولِ جنت کا ذریعہ ہے وہیں ماں کی خدمت دخولِ جنت کا ایک اہم راستہ ہے، ماں کی خدمت انسان کی سب سے بڑی سعادت اور اُس کی نیک بختی کی علامت ہے،''ماں'' کا مقدس لفظ پیار ومحبت،شفقت ومہربانی اور قربانی کا اتاہ سمندر ہے، باخلاق وباکردار، ماں کی عظمت سے آشنا انسان، زندگی کے کتنے ہی مراحل طے کرلے اور ترقی کی بلندیوں پر پہونچ جائے لیکن وہ ماں کے محبت بھرے سایہ اور پیار کے آنچل سے بے نیاز نہیں ہوسکتا،رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''**الجنۃ تحت اقدام الامھات**''ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔

اس کے علاوہ اگر انسان کے جذبات پاکیزہ ہوں، اُس کے ارادے وعزائم نیک ہوں اور وہ اعمالِ صالحہ کا خوگر ودلدادہ ہوتو وہ اپنے جسمانی اعضاء سے اجروثواب کی محفوظ''سرمایہ کاری''اور نفع بخش''ذخیرہ اندوزی'' کرسکتا ہے،مثلاً زبان کو ذکرِالٰہی سے تر رکھے،لوگوں کو بھلائی کی تلقین کرے، ہاتھوں سے صدقہ وخیرات کرے وغیرہ، اسی طرح قدم (پیر) کی نیکی یہ ہے کہ وہ نمازوں کی ادائیگی کے لیے اٹھے اور چلے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ہر وہ قدم جو نماز کی ادائیگی کے لیے چل پڑے، اس کے بدلہ ایک نیکی ہے،''**وبکل خطوۃ مشیھا الی الصلوۃ صدقۃ**''مساجد کا رُخ کرنے میں مسلمان جتنے قدم چلتا ہے ہر قدم کے بدلہ نیکی ہے۔انصارِ صحابہؓ کے ایک قبیلہ بنوسلمہ کے گھر مسجدِ نبوی سے دور تھے، ان حضرات نے مسجد کے قریب میں منتقل ہونے کا ارادہ کیا، رسول اللہ ﷺ کو اس کی اطلاع ہونے پر آپ ﷺ نے ان سے فرمایا کہ جتنی دور تم اپنے گھروں سے چل کر آؤ گے، ہر ہر قدم پر تمہارے لیے نیکیاں لکھی جائیں گی۔''**دیارکم تکتب اٰثارکم**''۔

حضرت ابی بن کعبؓ کہتے ہیں کہ ایک صاحب تھے جو میرے علم کے مطابق مسجد سے سب سے زیادہ دور رہتے تھے،لیکن اس باوجود ان کی کوئی نماز نہیں چھوٹتی تھی، ان سے کہا گیا یا میں نے خود اُن سے کہا کہ اگر آپ سواری خرید لیتے تو تاریکی اور سخت گرمی میں سواری کے ذریعہ مسجد آنے میں سہولت ہوجاتی، ان صحابیِ رسول نے جواب میں کہا کہ مسجد کے قریب گھر ہونے سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوگی کہ مسجد کی طرف میرا پیدل چل کر آنا اور واپس اپنے گھر لوٹنا دونوں چیزیں بطورِ ثواب

لکھی جائے، اس وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اس کا پورا ثواب جمع کر دیا، ایک روایت میں ہے کہ تمہارے لیے وہی ہے جس کی تم نے نیت کی (ریاض الصالحین باب کثرۃ طرق الخیر) ایک جگہ اللہ کے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی باتیں نہ بتاؤں جن کے کرنے سے گناہ معاف ہو جائیں اور درجات بلند ہوں، صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ ضرور فرمایئے اللہ کے رسول! آپ ﷺ نے فرمایا: ایک یہ کہ سخت سردی میں وضو کرنا، دوسرے یہ کہ مساجد کی طرف زیادہ قدم چلنا، ''و کثرۃ الخطا الی المساجد'' تیسرے یہ کہ ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا۔ ان تین باتوں کی پابندی تمہارے لیے اللہ کے راستہ میں جہاد کرنے برابر ہے۔ (ایضاً)

اسی طرح جو مسلمان اپنے جسمانی اعضاء و جوارح کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری اور خوشنودی کے کاموں میں لگائے رکھتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب و مقبول بندہ ہوتا ہے، پھر اس کے کان، ہاتھ، آنکھ اور پیر وغیرہ کی تمام حرکات و سکنات اللہ کی توفیق اور مرضی کے مطابق ہوا کرتے ہیں، حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو بندہ ہمیشہ نوافل کی ادائیگی کے ذریعہ میرا قرب پانے کی کوشش کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اُس کو چاہنے لگتا ہوں، جب میں اُس کو چاہتا ہوں تو اُس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اُس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، اُس کا ہاتھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ باندھتا ہے اور اُس کا پیر بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے، اگر وہ مجھ سے مانگے تو میں اُس کو عطا کرتا ہوں اور اگر وہ میری پناہ و حفاظت میں آنا چاہے تو میں اُس کو پناہ دیتا ہوں۔ (ریاض الصالحین، باب فی المجاھدۃ) ایک دوسری جگہ حدیثِ قدسی میں اللہ تعالیٰ اپنے محبوب بندہ کے ساتھ محبت و تعلق کا اظہار یوں فرماتے ہیں کہ: جب بندہ مجھ سے ایک بالشت قریب آتا ہے تو میں ایک گز اُس سے قریب ہوتا ہوں، جب وہ مجھ سے ایک گز قریب آتا ہے تو میں ایک ہاتھ اُس سے قریب ہوتا ہوں، پھر جب وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اُس کے یہاں دوڑ کر جاتا ہوں۔ (حوالہ سابق)

اطاعت و فرمانبرداری اور احکامِ الٰہی کی پابندی اور پاسداری کا انعام آخرت میں تو ملے گا ہی لیکن دنیا میں بھی بندۂ مومن کو اس کی برکات و ثمرات نظر آئیں گی، وہ اپنے سر سے اوپر کی نعمتوں کو بھی

استعمال کرے گا اور پاؤں کے نیچے والی نعمتوں کو بھی وہ برتے گا، زمین وآسمان کی نعمتیں (بارانِ رحمت اور پیداوار) اُس کو میسر ہوں گی، قرآن مجید میں اہلِ کتاب یہود ونصاری سے کہا گیا کہ:

''وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ''(سورة المائد:٦٦)، اگر یہ لوگ تورات وانجیل اور رسولِ اکرم ﷺ کے واسطہ سے ان کی طرف اتاری گئی، کتاب قرآن مجید کے احکام کو ٹھیک ٹھیک قائم کرتے تو اس کے بدلہ میں وہ اپنے اوپر اور اپنے پاؤں کے نیچے سے کھاتے۔ اسی طرح نافرمانی اور بے راہ روی کی سزا آخرت میں یوں ہوگی کہ اوپر اور نیچے سے عذاب ہوگا، نافرمان اور گمراہ شخص پوری طرح عذاب کے گھیرے میں ہوگا۔'' يَوْمَ يَغْشَاهُمُ الْعَذَابُ مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ وَيَقُوْلُ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ''(سورة العنكبوت: ۵۵)، اُس دن عذاب اُن کو اُن کے اوپر سے اور ان کے پیر تو ں تلے انہیں ڈھانپ لے گا، پس اگر آدمی اپنے اعضاء وجوارح سے دنیا کے کام کاج کرنے کے ساتھ اُس کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وفرمانبرداری میں لگائے اُس کی نافرمانی اور ناراضگی سے ان کو بچائے رکھے، وہ اپنے اس عمل اور مجاہدہ کی بناء پر بارگاہِ خداوندی میں قربت ومعیت کا مقام پائے گا، اپنے پروردگار کے نیک اور مقبول بندوں میں وہ شامل ہوگا، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے قدموں کو گناہوں سے دور رکھے، قدم کا گناہ یہ بھی ہے کہ آدمی کی چال اور رفتار سے غرور وتکبر جھلکتا اور چھلکتا ہو، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ اکڑفوں چال سے نہ زمین کا سینہ شق ہوسکتا ہے اور نہ پہاڑ کی چوٹی سر ہوسکتی ہے، قرآن مجید کا بیان ہے کہ'' وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا، اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا''(سورة بنی اسرائیل: ۳۷)، اپنے قدم کے ذریعہ گناہ کی دعوت دینا بھی پیر کا غلط استعمال ہے۔ قرآن مجید میں اس سے منع کیا گیا'' وَلَا يَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ''(سورة النور: ۳۱) عورتیں اس انداز سے نہ چلیں کہ ان کی پازیب کی جھنکار سے ان کے پوشیدہ زیب وزینت اور بناؤ سنگار کا اظہار ہو اور ایسا معلوم ہو کہ پیدل چلنی والی خواتین کا قدم زمین پر نہیں بازو چلنے والے مردوں کے دلوں پر پڑ رہا ہے۔

قدم سے متعلق اشعار: بیماری کے دنوں میں قدم (پیر) سے متعلق آیات واحادیث کے استحضار

کے علاوہ قدم (پیر) کے بارے میں کچھ اشعار بھی سامنے آئے، ان کا ذکر بھی شاید دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا، تاکہ قدم سے متعلق نصیحت وموعظت کے کچھ پہلو ان کے ذریعہ معلوم ہوں، جن بزرگوں اور دوستوں کو شہر حیدرآباد فرخندہ بنیاد کی گلی کوچوں، سڑکوں اور راستوں کا حال معلوم ہے اور وہ یہاں کے سرکاری محکموں کے کام کے انداز سے واقف ہیں، ان کے لیے شاعر کا یہ پیغام خود ان کے دل کی آواز ہے کہ: ؎

بہت سنبھل کے گذرنا عدیل دنیا سے
قدم قدم پہ یہ ٹوٹی ہوئی سڑک ہے میاں

اتار چڑھاؤ صرف سمنٹ اور ڈانبر کی سڑکوں پر نہیں ہوتے بلکہ ''شاہراہِ زندگی'' کے مختلف موڑ اور چوراہوں ـــــــ دین وایمان، تعلیم، تجارت، ملازمت ـــــــ پر بھی نشیب وفراز ملتے ہیں، وہاں پر قدم سنبھال کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ شاعر کہتا ہے۔ ؎

قدم قدم پہ نشیب وفراز ملتے ہیں
رہِ حیات میں انسان باحتیاط چلے

اگر آئینہ نما فرش ہو تو آدمی بے ڈھپ اور بے ڈھنگے انداز میں نہیں چل سکتا، اس لیے کہ ذراسی غفلت اور غلطی سے وہ پھسل جائے گا، اس موقع سے جو احتیاط ہوتی ہے اس سے زیادہ آدمی کو اپنی زندگی میں محتاط ہونا چاہیے، شاعر نے شاعری کے نہیں بلکہ خیرخواہی کے انداز میں یہ حقیقت یوں بیان کی ہے۔ ؎

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگہ ساری دوکانِ شیشہ ساز ہے

صحیح مقصد ومشن کے لیے آدمی کی محنت وجدوجہد کو جب شوق کے پر لگ جائیں تو کامیابی کی پرواز آسان ہوجاتی ہے اور منزلِ مقصود تک رسائی میں دیر نہیں لگتی، اپنی منزل کا شوق اور شعور اور اپنے مقصد کے لیے محنت ولگن نے ہمارے اسلاف واکابر اور بزرگوں کے کارناموں کو آج بھی زندۂ جاوید بنا رکھا ہے، شاعر کہتا ہے۔ ؎

نقشِ پائے رفتگاں سے یہ صدا آرہی ہے
دو قدم میں راہ طے ہے شوقِ منزل چاہیے

ایک دوسرے شاعر نے اس کو یوں بیان کیا ہے: ؎

دو قدم جانا جدھر دشوار تھا
شوق لے کر سینکڑوں منزل گیا

کامیابی کی منزل کو پانے اور اُس تک پہونچنے کے لیے راستہ کی دشواریاں اور پریشانیاں حوصلہ مند انسان کے لیے کوئی معنیٰ نہیں رکھتیں، حوصلہ وہمت، جوش وجذبہ اور جنون ہو تو دشوار گذار گھاٹیاں اور پُرخطر وادیاں پار کر جانا بہت آسان ہے، لیکن اس کے برخلاف کامیابی وکامرانی کے سلسلہ میں آدمی پہلے ہی سے ناامید اور مایوس ہوجائے تو یہی ناامیدی اور مایوسی اُس کے پاؤں کی بیڑیاں بن جاتی ہیں، شاعر کہتا ہے۔ ؎

ناامیدی ہے جو قدموں کو جکڑ لیتی ہے
راستہ کوئی بھی دشوار نہیں ہوتا

دنیا میں ترقی وکامیابی کے معیار اور پیمانے مختلف ہیں، کسی کے یہاں عصری علوم وفنون ہی میں آدمی کی معراج ہے، کوئی صنعت وحرفت اور معیشت میں بالا دستی کو کامیابی کی کلید قرار دیتا ہے، کسی کے نزدیک ترقی یہ ہے کہ عالمی سیاست میں نمایاں نام اور اونچا مقام مل جائے، غرض یہ کہ جتنے منہ اُتنی باتیں، حقیقت میں یہ سب ثانوی درجہ کی چیزیں ہیں، آدمی میں خوبی وکمال کا اصل معیار اور پیمانہ اُس کی سیرت وکردار، اُس کے عادات واطوار اور بلند اخلاق ہیں، اس سلسلہ میں تین چیزیں اہم اور بنیادی ہیں، ایک اپنے عقیدہ وایمان سے وفاداری، دوسرے خاکساری ونیازمندی، تیسرے اپنے خالق وپروردگار کی عبادت وبندگی، یہ تینوں باتیں شاعری کی زبان واسلوب میں یوں ادا ہوتے ہیں۔ ؎

قدم بڑھاؤ ترقی کرو ضرور ولے
رہے رسول کے قدموں پہ سر خدا کے لیے

تواضع وفروتنی کے حوالہ سے ہم سمجھ سکتے ہیں کہ پھل دار درخت جھکا ہوا ہوتا ہے، شاعر کہتا ہے۔ ؎

رفعتیں چومتی ہیں ان کے قدم
جن کی خصلت میں خاکساری ہے

عبادت و بندگی اور سحر آ گہی کے بارے میں شاعر کا کہنا ہے کہ: ؎

کامرانی تو اُسی کے پاؤں چومے گی طفیل
عجز سے سجدہ میں جو وقتِ سحر گرجائے

سہولت وعافیت پسندی، آرام طلبی اور تن آسانی انسان کو نہ صرف سست و کاہل بلکہ ـــــــ گستاخی معاف! ـــــــ بزدل بنا دیتی ہے، زندگی کی آزمائشوں کو وہ پورا کرنے سے گھبراتا اور ڈرتا ہے، قدم قدم پر بلائیں اور مصیبتیں انسانی زندگی سے بوس و کنار کرتی ہیں، باہمت اور حوصلہ مند لوگ اس کو سہہ لیتے ہیں، پست ہمت ایسے موقع پر زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں، اس لیے قربانی وشہادت اور جہاد وعزیمت کی راہ پر ایسے لوگوں کو قدم رکھنے سے پہلے بہت سوچ لینا چاہیے، ورنہ انہیں قدم ہی نہیں رکھنا چاہیے، ممتاز ادیب اور صاحبِ قلم مولانا عامر عثمانیؒ کہتے ہیں: ؎

یہ قدم قدم بلائیں یہ سوادکوئے جاناں
وہ یہیں سے لوٹ جائے جسے زندگی ہو پیاری

ایک دوسری جگہ شاعر نے یوں نصیحت کی ہے: ؎

قدم قدم پہ تجھے خونِ دل بہانا ہے
رہِ حیات میں آسانیاں تلاش نہ کر

البتہ جن کی فطرت اور سرشت میں جفاکشی، جانفشانی، جانبازی اور جانثاری ہوتی ہے وہ "اندیشہ ہائے دور دراز" کے شکار ہوئے بغیر بلاخوف وخطر آندھی وطوفان سے لڑ جاتے ہیں، ان کے پیش نظر شاعر کی یہ ہدایت ہوتی ہے کہ: ؎

چلنا ہے، چل پڑو، نکل آئیں گے راستے
آندھی کسی کے نقشِ قدم دیکھتی نہیں

انسان اپنی زندگی کا امین ہے نہ کہ مالک، اس لیے وہ من چاہی زندگی بسر نہیں کرسکتا، اور نہ وہ

مصائب ومشکلات سے گھبرا کر اپنی جان کا خاتمہ کرسکتا ہے، اس لیے اسلام میں خودکشی حرام ہے، اگر معاشرہ میں زندگی کے امانت ہونے کا تصور عام ہوجائے تو کوئی فرد اپنی زندگی میں خیانت کا گناہ اور جرم نہیں کرسکتا، زندگی میں خیانت یہ ہے کہ جس ذات باری تعالیٰ کی دی ہوئی یہ امانت ہے اُس کے احکام سے روگردانی کی جائے، اُس کی تعلیمات کو پامال کیا جائے، اُس کی نافرمانی کے کاموں میں زندگی لگائی جائے، ایسا شخص دونوں جہاں میں ناکام ہے، اس کے برخلاف جو شخص زندگی کو امانت سمجھ کر اپنے پروردگار کی فرمانبرداری اور تابعداری کرتا ہے تو کامیابی وکامرانی اُس کا مقدر ہوتی ہے، مرنے کے بعد آخرت کی پہلی منزل قبر ہی میں اُس کو سکون وچین نصیب ہوتا ہے، وہ شاعر کی زبان میں کہتا ہے کہ: ؎

حیات جس کی امانت تھی اُس کو لوٹادی
میں آج چین سے سوتا ہوں پاؤں پھیلا کر

وفاداری ایک اعلیٰ امتیازی خوبی اور خصوصیت ہے، اس کے مقابلہ میں ''دغابازی'' اور ''غداری'' لائق لعنت وملامت اور قابلِ مذمت صفت ہے، وفاداری کا تعلق آدمی کی زندگی کے کسی بھی پہلو سے ہو چاہے دین ومذہب سے اُس کا تعلق ہو، وفاداری اپنے ملک ووطن سے ہو یا اپنے طبقہ اور پیشہ سے ہو، بہرحال درجہ بندی کے ساتھ وہ اپنی جگہ قابلِ تعریف اور لائقِ تحسین ہے، اس خوبی اور خصوصیت کے حامل افراد جب دنیا سے گذر جاتے ہیں تو ان کے کام اور کارنامے اور نقوشِ قدم ان کی یاد کو باقی رکھتے ہیں، بقول شاعر: ؎

اہلِ وفا ہر راہ گذر میں نقشِ قدم چھوڑ آتے ہیں اپنے
بعد فناء بھی ذکر ہمارا ہوتا رہے گا عالم عالم

پھر یہ کہ وفاداروں کی جماعت، رفاہی ادارے، تعلیمی درسگاہیں اور دینی مراکز ومدارس کی شکل میں اپنی یادگار چھوڑ جاتے ہیں، ان کی سیر اور معائنہ کے وقت بھی ان کی یاد آتی ہے کہ: ؎

شجیع آج سیر چمن کو گئے تھے
بہت ان کے نقش قدم یاد آئے

قوم وملت کے زعماء اور قائدین کے لیے دو باتیں بہت اہم ہیں، ایک یہ کہ مؤمنانہ فراست اور دینی بصیرت انہیں حاصل ہو، تاکہ وہ اس کی روشنی میں مستقبل کے حالات کا صحیح اندازہ کرسکیں، اس لیے کہ صحیح ''پیش بینی'' پیش قدمی اور پیش رفت کا سبب ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ جب وہ کسی صحیح بات کا فیصلہ لے لیں تو بھرپور عزم وحوصلہ کے ساتھ اُس پر قائم رہیں، اپنے قدم کو پیچھے نہ ہٹائیں، جد وجہد کا کوئی مرحلہ یا میدان ہو، یا خیر وشر اور اصلاح وفساد کا کوئی معرکہ ہو، زعماء وقائدین کی فراست اور ہمت ایسے موقع پر معلوم ہوتی ہے، شاعر کہتا ہے۔ ؎

کوئی مرحلہ ہو کوئی معرکہ ہو
نظر عارفانہ قدم غازیانہ

نیکی اور بھلائی کے کاموں کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، آدمی بہت کچھ نیک کام کرنا چاہتا ہے، اُس کے ارادے اور عزائم رکھتا ہے، اس کے لیے اُس کے پاس وسائل واسباب بھی ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ نیک کام نہیں کر پاتا یا اُس سے نہیں ہو پاتے، مثلاً بہت سے مالدار فریضہ حج کی بھرپور استطاعت رکھنے کے باوجود حج کیے بغیر دنیا سے چلے جاتے ہیں، سعودی عرب میں بعض کی دوکانیں حرمین شریفین کے بالکل قریب ہوتی ہیں، لیکن ان کے قدم کعبۃ اللہ اور مسجدِ نبوی کی طرف نہیں اٹھتے، بعض مکانات مساجد کے بالکل پڑوس میں رہتے ہیں، بعض افراد مسجد کے کرایہ دار ہوتے ہیں، لیکن یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے منادی کے اعلان (اذان) پر مسجد میں جمع نہیں ہوتے، اللہ تعالیٰ کے گھر سے اس دوری کی وجہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی توفیق کا نہ ہونا ہے، اس کے برخلاف جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی توفیق شاملِ حال ہوتی ہے وہ اگرچہ غریب اسباب ووسائل کے لحاظ سے بالکل تہی دامن ہوتے ہیں مگر خوش نصیب ہیں کہ کعبۃ اللہ کے دیدار سے اور روضہ اطہر کی زیارت سے مشرف ہوتے ہیں، ان کے گھر اگرچہ مساجد سے بہت دور ہوتے ہیں، لیکن اذان کی آواز پر ان کے قدم مسجد کی طرف اٹھ جاتے ہیں، اس پس منظر میں شاعر کہنا چاہتا ہے۔ ؎

مری طلب بھی ان ہی کے کرم کا صدقہ ہے
قدم یہ اٹھتے نہیں اٹھائے جاتے ہیں

جولوگ اپنی ذات کے لیے جیتے ہیں، جن کی زندگی کی بھاگ دوڑ کا محور اور مرکز صرف ان کی اپنی ذات ہوتی ہے، ایسے لوگ مرنے کے بعد بے نام ونشان ہوتے ہیں، زمانہ کے گرد وغبار میں ان کی شخصیت غرق آلود ہو جاتی ہے، ایسی خود غرض زندگی کے مقابلہ میں مخلوق کی بھلائی اور نفع رسانی والی زندگی بہتر ہے، ایسی زندگی گذارنے والے اگر دنیا سے چلے بھی جائیں تو ان کے کام اور کارنامے بعد والوں کے لیے ''شمعِ راہ'' کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کی زندگی زمانہ کی دستبرد، وقت اور حالات کے تھپیڑوں اور حملوں سے محفوظ رہتی ہے، شاعر ایسی ہی زندگی گذارنے کی تلقین کرتا ہے۔ ؎

جسے ہوائے زمانہ کبھی بجھا نہ سکے
قدم قدم پہ وہ اک شمعِ راہ پیدا کر

علامہ شبلی کے پاؤں کا حادثہ، شعر وادب کا خزینہ

ایک ہی طرح کا حادثہ اور ایک ہی نوعیت کی مصیبت ایک سے زائد لوگوں کو اگر پہونچے تو اس میں ایک گونہ اطمینان وتسلی کا سامان رہتا ہے، بیماری کے دنوں میں دورانِ مطالعہ ''حیاتِ شبلیؒ'' حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کی سوانح حیات نظر سے گذری، یہ آپؒ کے مایۂ ناز شاگرد رشید حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کی تالیف ہے، اس میں حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے کہ ۱۷رمئی ۱۹۰۷ء میں حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کے پاؤں کا حادثہ پیش آیا، اس حادثہ کی روداد پڑھنے سے بہت سی سبق آموز باتیں اور پہلو مجھے معلوم ہوئے، نامور استاذ کے نامور شاگرد اپنے استاذِ محترم کو پیش آئے حادثہ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اس زمانہ میں شعر العجم جلدِ اوّل کے اوراق زیرِ تصنیف تھے، ۱۷رمئی ۱۹۰۷ء کی صبح دس بجے وہ میز سے اٹھ کر ہال میں تشریف لے گئے، جو ان دنوں زنان خانہ میں شامل تھا (اسی ہال میں اب دار المصنفین کا کتب خانہ ہے) یہاں تخت بچھے تھے، یہیں مولانا ایک پاؤں لٹکا کر تخت پر بیٹھ گئے، اس بنگلہ میں باغ بھی تھا، جس میں لیچیاں لگی تھیں اور کوے آکر

ان کو نقصان پہونچاتے تھے، مولانا کے اکلوتے صاحبزادے حامد صاحب
نے ان کے اڑانے کے لیے بندوق میں چھروں کے کارتوس بھر کر رکھے
تھے اور اس کو ہال ہی میں چھوڑ گئے تھے، مولانا نے اس بندوق کو اپنے ہاتھ
سے اٹھایا تو بہت وزنی معلوم ہوئی، پاس ہی مقابل میں ان کی بہو یعنی حامد
صاحب کی بیوی بیٹھی ہوئیں تھیں، ان کو یہ کہہ کر دی کہ یہ عورتوں سے اٹھ بھی
نہیں سکتی، اس دینے لینے میں ہاتھ بندوق کے گھوڑے [بٹن] پر پڑ گیا اور
بندوق سر ہوگئی [چل گئی] جس کا نشانہ مولانا کا پاؤں (قدم) تھا، گھر میں
کہرام برپا ہوگیا......''۔(حیاتِ شبلی ص: ۴۶۰،۴۶۱)

اس حادثہ کی وجہ سے ٹخنے کی ہڈی بالکل چور ہوگئی اور پاؤں کٹ کر صرف دو تسمے لگے رہ گئے، ڈاکٹر نے کہا کہ پیر کاٹنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں، اس طرح ڈاکٹر کی تجویز کے مطابق نصف پنڈلی جدا کردی گئی، علامہ شبلیؒ کے بقول ''ہرزہ گردی'' کی سزا دی گئی، اس حادثہ پر حضرت علامہ کے تأثرات صرف اپنے جذبات کا اظہار نہیں بلکہ نصیحت وموعظت کے بہترین شاہکار ہیں، اسلامی تاریخ کے بلند پایہ مؤرخ اور ممتاز سیرت نگار علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں:

''......لیکن خدا کا شکر ہے کہ ابتدائے واقعہ سے اس وقت تک
طبیعت کی طمانیت اور سکون میں کوئی کمی نہیں ہے، سوچتا ہوں تو نظر آتا ہے
کہ جو شخص سر کاٹے جانے کے قابل ہو اُس کے پاؤں کاٹے گئے تو کیا
ہوا؟ ظاہری لحاظ سے بھی تسکین ہے کہ پچاس برس سے بھی زیادہ کی کچھ عمر
پائی، بہت چلا پھرا، دوڑا، دھوپا، ملا جُلا آخر کہاں تک؟ خود پاؤں توڑ کر
بیٹھنا چاہیے تھا، نہ بیٹھا تو قسمت نے بٹھا دیا۔......''(ص: ۴۶۳)

ایک جگہ حضرت علامہ فرماتے ہیں:

''اسسٹنٹ سرجن روزانہ آتا ہے اور دن میں دوبار زخم دھوجاتا ہے، لیکن ابھی تک

تکلیف میں کمی نہیں، تکلیف گو سخت ہے، لیکن ہمارے ہی بزرگ تھے جنہوں نے سر کٹوائے تھے، پاؤں کٹنے پر کیا روؤں؟ فَصَبرٌ جَمِیلٌ......'' (ص:۴۶۵)

علمی اور تحقیقی کام کرنے والے اربابِ کمال کی دماغی صلاحیت اور قوت عام لوگوں کے مقابلہ میں بڑھی ہوئی ہوتی ہے، اس کا اندازہ علامہ شبلی نعمانیؒ کے پیر کے آپریشن کے وقت بھی ہوا، علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر نے جب عملِ جراحی (آپریشن) کے لیے بے ہوشی کی دوا پلائی ہے تو اُس وقت ایک نادر واقعہ پیش آیا، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ممتاز دماغوں کی قوت اور حواس کی جمعیت بھی ممتاز ہوتی ہے، قاعدہ ہے کہ بے ہوشی کی دوا پلا کر مریض کو گننے کے لیے کہا جاتا ہے، عموماً لوگ پچاس سے ساٹھ تک گنتے ہوئے بیہوش ہوجاتے ہیں، مگر مولانا نے اس ضعف اور ناقابلِ برداشت صدمہ پر بھی ستانوے تک گنا اور اس کے بعد بے ہوش ہوئے......''
(ص:۴۶۵)

پھر یہ کہ علماء، اُدباء اور اہلِ فن و تحقیق کو جو حادثات و مصائب پیش آتے ہیں ان کا خوش گوار پہلو یہ ہے کہ ان پر بھی علم و تحقیق کا رنگ چڑھ جاتا ہے اور پھر یہ حادثات نایاب، نادر اور نئی معلومات کے سانچے میں ڈھل کر مشتاقانِ علم و ادب کو شاد کرتے ہیں، علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''حادثہ جو ہونا تھا ہو گیا مگر بقول مولانا شیروانی ''علمی آدمیوں کی ہر بات علمی ہوتی ہے'' اس حادثہ نے علم و ادب کا ایک نیا پہلو سامنے کر دیا......''۔
(ص:۴۶۶)

حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ جہاں بلند پایہ مصنف و محقق نامور مؤرخ اور ممتاز سیرت نگار تھے، وہیں ادب اور شعر و شاعری میں آپ کی شخصیت مسلمہ تھی، عربی، فارسی اور اردو مختلف زبانوں میں آپ نے کئی قصیدے، سپاس نامے اور نظمیں لکھیں، شعر و ادب کی تمام اقسام آپ کی جولان گاہ رہی، پھر اسی

مناسبت سے آپ کے شاگردوں اور احباب کا حلقہ تھا، پیر (قدم) کے حادثہ نے خود علامہ شبلی، آپ کے شاگردوں اور حلقہ احباب کو ''مشقِ سخن'' کا نیا موقع فراہم کیا۔ حضرت علامہ شبلی نعمانی اس حادثہ پر اپنی ایک نظم میں لکھتے ہیں:

ہلنا بھی جگہ سے گرچہ اب ہے دشوار
اس پر بھی خدا کا شکر ہے احسان ہے
یعنی کہ پہونچ چکا ہوں جس منزل تک
یاں سے سفر عدم اب آسان ہے

اس قطعہ کے جواب میں علامہ کے شاگرد مولوی اقبال احمد سہیل کہتے ہیں:

شکستہ پائی تو تھی سر نوشت میں حضرت
نہ ہاتھ آئے گا کچھ اب تو ہاتھ ملنے سے
عدم کی دور ہے منزل نہ جاسکیں گے حضور
چلے گا قوم کا کام آپ کے نہ چلنے سے

ایک جگہ علامہ شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

ہر چند کہ زخم سخت جاں فرسا تھے
آثارِ ہلاک سربسر پیدا تھے
ممنون ہوں ضبط کا کہ اس حال میں بھی
گو پاؤں کٹے قدم برجا تھے
مقبول نہیں ہے بے نوائی میری
آلودہ نخوت ہے گدائی میری
تقدیر نے پاؤں کاٹنے پر بس کی
ناقص ہے ابھی بے سروپائی میری

مولوی اقبال سہیل اس نظم کے جواب میں یوں عرض کرتے ہیں:

کیجئے نہ غم شکست پاءِ مولانا
اس میں بھی تھی حکمت خدائے دانا
تھی اہل عدم کو آرزوئے پابوس
ایک پاؤں وہاں بھی چاہیے تھا جانا

حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ کے با کمال اور بافیض تلامذہ نے بھی استاذِ گرامی کی تسلی کے لیے بہت ہی جاندار الفاظ اور شاندار اسلوب میں اس حادثہ پر شاعرانہ اظہارِ خیال کیا، ''حیاتِ شبلی'' کے مصنف حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ کہتے ہیں:

تنقید مراثی کے صلہ میں استاذ
دربارِ حسینی نے سعادت بخشی
پر سر سے ابھی کام تھا لینا باقی
اس واسطے پاؤں کو شہادت بخشی

علامہ کے ایک اہلِ تعلق نواب سید علی حسن خانؒ لکھتے ہیں:

شبلی تیرے قوم پر بہت احسان ہیں
باتیں تیری دردِ قوم کی درماں ہیں
اک پاؤں اگر گیا تو کچھ رنج نہ کر
اس ایک قدم پر لاکھ سر قرباں ہیں

میر اکبر حسین صاحب (جج) حضرت علامہ شبلی کے خاص اہلِ تعلق میں سے تھے، علی گڑھ کے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے دونوں کے مراسم تھے، میر اکبر حسین صاحب مرحوم قافیہ اور تک بندی کے استاذ تھے، علامہ نے ایک ملاقات میں ایسی ہی ہنسا ہنسی میں میر صاحب کو اپنے نام کی قافیہ بندی کا چیلنج دیا۔ میر اکبر حسین صاحب مرحوم نے اس چیلنج کو قبول کیا اور ایک منظوم دعوت نامہ میں علامہ

کے نام یوں قافیہ بندی کی:

آتا نہیں مجھ کو قبلا قبلی
ہے بات یہ صاف بھائی شبلی
مل جائے یہاں جو دال دلیا
سمجھو تم اُسے پلاؤ قلیا

اُس وقت چونکہ پاؤں کے حادثہ کی وجہ سے آپؒ چلنے پھرنے سے معذور تھے، اس لیے میر صاحب کے دعوت نامے کے جواب میں اپنی معذرت یوں پیش فرمائی:

آج دعوت میں نہ آنے کا مجھے بھی ہے ملال
لیکن اسباب کچھ ایسے ہیں کہ مجبور ہوں میں
آپ کے لطف وکرم کا مجھے انکار نہیں
حلقہ درگوش ہوں، ممنون ہوں، مشکور ہوں میں
لیکن اب وہ میں نہیں ہوں کہ پڑا پھرتا تھا
اب تو اللہ کے افضال سے تیمور ہوں میں
دل بہلانے کی باتیں ہیں وگرنہ شبلی
جیتے جی مردہ ہوں، مرحوم ہوں، مغفور ہوں میں

اسی پاؤں کے حادثہ کے زمانہ میں مسجد کانپور کا سانحہ پیش آیا، اس میں بے شمار مسلمان قید کر لیے گئے، اس موقع پر علامہ شبلی نعمانی نے جیلوں میں محبوس اور محروس مسلمانوں کے لیے ہمدردی اور تسلی کا یوں اظہار فرمایا:

ہم قدم آپ کا ہونا تو بہت ہے دشوار
ان کا کیا ذکر جو اس درد میں شامل ہی نہیں
پاؤں کٹنے کا مجھے آج ہوا ہے صدمہ
یعنی افسوس میں زنجیر کے قابل ہی نہیں

پاؤں کے حادثہ کی وجہ سے حضرت علامہ شبلی نعمانیؒ نے اپنے لیے ایک مصنوعی پیر بنوایا، شروع میں یہ مصنوعی پیر بمبئی میں تیار ہوا، لیکن یہ آپؒ کے کام نہیں آیا، اس لیے کہ پیر بھاری اور وزنی تھا، اس دوران حیدرآباد میں ۱۹۰۸ء میں مشرقی یونیورسٹی کے قیام کے لیے حضرت علامہ شبلی نعمانی کی تشریف آوری ہوئی، یہاں پر سلطنتِ آصفیہ میں فوج کے سپہ سالار نواب افسر الملک بہادر نے خصوصی طور پر سرکاری کارخانے سے آپ کے لیے لکڑی کا مصنوعی پیر بنوا کر پیش کیا، پیر آپ کے لیے ہلکا اور آرام دہ تھا، مصنوعی پیر لگوانے کے بعد حضرت علامہ شبلی اس پر دلچسپ جملے اور دل خوش کن فقرے کہہ کر اپنی دل بہلائی اور احباب کی شادمانی کا سامان کرتے، چنانچہ جب نواب افسر الملک بہادر کارخانہ سے مصنوعی پیر لے کر حضرت علامہ کے ساتھ کار میں بیٹھ رہے تھے تو علامہ نے برجستہ یہ جملہ کہا کہ ''پا بدستِ دگرے، دست بدستِ دگرے''، پھر اُسی دن نواب صاحب موصوف کو ''سر'' کا خطاب ملا تھا، علامہ نے بے ساختہ کہا ''آپ نے مجھ کو پاؤں دیا تو خدا نے آپ کو سر دیا''۔

علامہ شبلیؒ کے مایہ ناز شاگرد علامہ سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> ''ایک دفعہ وہ چل رہے تھے، میں ساتھ تھا، فرمانے لگے ''میاں! پہلے گفتار و کردار نقلی تھا، اب رفتار بھی نقلی ہے''

مولانا شیروانی فرماتے ہیں:

> ''ایک بار علی گڑھ کالج میں لکچر دینے وقتِ مقررہ کے بعد تشریف لائے تو عذرِ تاخیر بیان فرما کر کہا ''یہ عذر عذرِ لنگ نہ خیال فرمایا جائے''

غرض یہ کہ حضرت علامہ شبلی نعمانی کے پیر کا حادثہ کیا ہوا، اس طرح کے اشعار اور دلچسپ جملوں اور فقروں سے علم وادب کے سرمایہ میں انوکھا و نادر اضافہ ہو گیا۔

اختتامیہ: حادثہ کے ابتدائی دنوں میں جب بھی ڈاکٹر کے یہاں جانا ہوا طبیعت اور مزاج کی جلد بازی کی وجہ سے مجھے یہ آس اور امید رہتی کہ شاید اب کی بار ''پلاسٹر'' کھل جائے گا اور چلنا پھرنا شروع ہو جائے گا، لیکن دو تین بار ''آس'' ''یاس'' میں بدل گئی، میں اللہ کے فیصلہ پر راضی رہا کہ اُس

کے فیصلہ کے مطابق ''پلاسٹر'' اپنے وقت پر کھلے گا، ''بیڈ رسٹ'' کا لمبا وقت بہت گراں گذرتا تھا کہ کیسے بیماری کے دن گذریں گے اور کٹیں گے؟ دوستوں اور کرم فرماؤں کو خوش فہمی تھی کہ کچھ علمی کام ہوگا، کتاب نہ سہی ''کتابچہ'' منظر عام پر آئے گا، لیکن اس غافل اور کاہل نے دوستوں کے حسنِ ظن کا کچھ خیال نہیں کیا اور نہ اس ناخلف اور نالائق شاگرد نے اپنے لائق وفائق استاذِ گرامی کی شاگردی کی لاج رکھی، بہرحال بسترِ مرض پر آرام کے دن دیکھتے دیکھتے گذر گئے، ایسے ہی زندگی کا سفر بھی ایک دن ختم ہوجائے گا، کم از کم بیماری میں نہ سہی باقی زندگی میں تو وقت کی قدر و قیمت اور فرصت کے لمحات کو غنیمت سمجھنے کا شعور اس حقیر کے اندر ہو، تاکہ اس کی حسرت نہ ہو کہ ؂

آہٹ بھی نہ محسوس ہوئی ختمِ سفر تک
یہ عمرِ رواں کتنے دبے پاؤں چلے ہے

آخر میں پروردگار کے حضور یہی دعا ہے کہ پیر ٹوٹے یا کٹے، پھسلے اور کچھ بھی حادثہ پیش آئے، ہر حالت میں ''ثابت قدم'' رہنے کی توفیق عطا فرما، تکلیف و مصیبت کے موقع پر اپنے دربارِ عالی وقار میں شکوۂ وشکایت کی زبان کھولنے کے بجائے صبر و تحمل کی توفیق دے، اپنی تقدیر کے فیصلہ پر راضی رہنے کی ہمت اور حوصلہ دے۔ رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا...... (سورۃ البقرۃ:۲۵۰)

حالِ دل ، احوالِ غم ، شرحِ تمنا، عرضِ شوق بے خودی میں کہہ گئے افسانہ در افسانہ ہم

عمل سے فارغ ہوا مسلماں، بنا کے تقدیر کا بہانہ

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے صادق مصدوق پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے بیان فرمایا: تم میں سے ہر ایک کا مادہ تخلیق اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس روز تک نطفہ بنا رہتا ہے (کچھ گاڑھا خون بنتا ہے) پھر چالیس دن کی مدت میں وہ مادہ تخلیق جما ہوا خون بنتا ہے، پھر اسی طرح چالیس دن کی مدت میں وہ گوشت لوتھڑا ہو جاتا ہے، اس کے بعد اللہ تعالیٰ چار باتوں کے ساتھ ایک فرشتہ بھیجتا ہے، فرشتہ اس انسانی جسم میں روح ڈالنے سے پہلے ۴؍ باتیں لکھتا ہے: اُس کا عمل، اُس کی عمر، اُس کا رزق، اور یہ کہ یہ شخص نیک بخت ہوگا یا بد بخت، اسکے بعد فرشتہ روح ڈالتا ہے (رواہ البخاری و مسلم/ معارف الحدیث ۱ / ۱۷۸ کتاب الایمان ملخصاً)

اس حدیث کی روشنی میں ایک صاحبِ موصوف کا اشکال ہے کہ جب پیدائش کے وقت ہی انسان کے نیک یا بُرے ہونے کا فیصلہ ہو چکا تو پھر وہ کیوں نیک اعمال کرے اور بُرے اعمال سے بچنے کی کوشش کرے، انسان کے نیک اور بد ہونے کے بارے میں تقدیر کا فیصلہ اٹل ہے۔

حدیث کے حوالہ سے یہ اشکال درست اور صحیح نہیں ہے، بلکہ اگر اس کو شیطانی وسوسہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا اس لیے کہ:

۱) یہ اشکال صرف اچھے اور برے اعمال ہی کے لیے کیوں پیدا ہوتا ہے؟ پیدائش کے مرحلہ میں انسان کا رزق بھی لکھ دیا جاتا ہے، اس کے باوجود رزق کے حصول کے لیے وہ بھاگ دوڑ کیوں کرتا ہے؟ آپ کے اشکال کے مطابق اس کو تو اپنے گھر بیٹھے رہنا چاہیے تھا، کیوں کہ اس کا رزق اس کی

تقدیر کے لحاظ سے طے ہو چکا ہے، پس انسان جب رزق طے ہونے کے باوجود اس کے حصول کے لیے بھاگ دوڑ کرتا ہے تو نیکیوں کے حصول کے لیے اور برائیوں سے دور رہنے کی کوشش کیوں نہ کرے؟؟ تقدیر کا بہانہ بنا کر بے عملی اور بد عملی میں مبتلا مسلمانوں کے بارے میں شاعر اسلام علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں: ؎

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا، خدا فریبی ہے کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلمان، بنا کے تقدیر کا بہانہ

۲) حدیث میں یہ بھی ہے کہ پیدائش کے وقت انسان کی عمر بھی لکھ دی جاتی ہے، اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہیے کہ جب انسان بیمار پڑ جائے تو علاج کی تدبیر نہ کرے، اس لیے کہ جب ہماری عمر طے ہو چکی ہے تو ہمیں یقیناً اُس وقت تک زندہ بھی رہنا ہے، پھر ہم کیوں خواہ مخواہ علاج کے نام پر اور ڈاکٹرس و حکیموں کی فیس میں اپنا پیسہ ضائع کریں، مگر اس کے باوجود آج ہر انسان اپنی صحت و تندرستی کے بارے میں بہت فکرمند رہتا ہے، بیماری نہ بھی ہو تب بھی اس سے بچنے اور محفوظ رہنے کہ ہر ممکن تدبیر کرتا ہے، حتی کہ بوڑھے حضرات بھی اپنے آپ کو جوان رکھنے کی پوری کوشش کرتے ہیں، پس جب انسان اپنی عمر اور زندگی ایک مقررہ وقت تک طے ہونے کے باوجود وہ صحت مندانہ زندگی گذارنے اور درازیٔ عمر کی کوشش کر سکتا ہے، تو پھر اپنے اعمال کو صحیح کرنے اور درست رکھنے کی تدبیر کیوں نہ کرے؟

۳) آپ کے اس اشکال سے جنت اور جہنم کا وجود بھی بالکل بے معنی ہو کر رہ جائے گا اور ــــ نعوذ باللہ ــــ اللہ تعالیٰ کے حق میں یہ بات جائے گی کہ وہ اپنے بندوں کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں کہ پہلے تو طے کر چکے ہیں کہ کون نیک بخت ہے اور کون بد بخت؟ اب صرف دکھانے کے لیے یہ فرماتے ہیں کہ اچھے اعمال والے جنت میں ہوں گے اور بُرے اعمال والے جہنم میں!!

۴) آپ کے اس اشکال کی وجہ سے دنیا میں ہدایت و گمراہی کی کشمکش اور انبیاء کرام کی تشریف آوری بھی بے مقصد اور بے فائدہ سمجھی جائے گی، اس لیے کہ آپ کے اشکال کے مطابق جب ہر شخص کا اپنی تقدیر کے اعتبار سے بد بخت اور نیک بخت ہونا طے ہو چکا ہے تو انبیاء کرام کی

دعوت اوران کے تبلیغی مشن کا بھی کوئی مطلب نہیں ہوگا، اس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر الزام آئے گا کہ نعوذ باللہ اپنے تقدیری فیصلہ کے باوجود اللہ تعالیٰ نے غیر ضروری طور پر انبیاء کرام کو دنیا میں بھیجا ،اورخواہ مخواہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کی کشمکش کھڑی کی ، بلاوجہ انبیاء کرام اوران کے رفقاء صحابہ کرامؓ نے ہدایت کو پھیلانے اور گمراہی کو دور کرنے میں مشقتیں جھیلیں، پریشانیاں اٹھائیں،طرح طرح کی قربانیاں دی وغیرہ۔

۵) آپ کے اشکال کو درست مان لیا جائے تو دنیا میں ہر طرف امان وسکون ہی ہونا چاہیے ہر جگہ شانتی ہی نظر آنی چاہیے،لیکن آپ خود اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ آج دنیا میں ہر جگہ جنگ وجدال اور فتنہ وفساد کا ماحول ہے، کہیں روزگار اور کاروبار کے لیے ملازمین اور تاجرین کا ہنگامہ ہے، کہیں اس کا جھگڑا ہے کہ کون ہدایت وسچائی پر ہے؟ اور کون گمراہی وضلالت پر ہے؟ کہیں سیاستدانوں اور حکمرانوں کے درمیانی محاذ آرائی ہے، پس تقدیر میں رزق ،عمل ،عمر اور نیک وبد کا مسئلہ طے ہو چکا ہے تو یہ سارے اختلافات اور جھگڑے ہی کیوں ہیں؟ ہر شخص اپنی تقدیر پر مطمئن اور خاموش کیوں نہیں ہے؟

۶) پھر یہ کہ تقدیر کے بارے میں ہمیں یہ اعتراض اس لیے ہوا کہ ہم نے انسان کو ’’مجبورِ محض‘‘ مان لیا، حالاں کہ ایسا نہیں ہے، انسان ’’نہ مجبورِ محض ہے اور نہ مختارِ کل‘‘ ہے، انسان اچھا یا برا کام کرتا ہے تو کسی نہ کسی درجہ میں اُس کے ارادہ واختیار کا دخل ہوتا ہے، اس کی ایک محسوس مثال خلیفۂ چہارم سیدنا حضرت علیؓ نے یوں بیان فرمائی، جب آپ کے یہاں ایک شخص یہی تقدیر کا مسئلہ سمجھنے کے لیے حاضر ہوا؟ آپؓ نے اس سے فرمایا: تم کھڑے ہو جاؤ، وہ شخص کھڑا ہو گیا، پھر آپؓ نے فرمایا: اپنا ایک پیر اٹھا لو، اس نے اپنا پیر اٹھالیا اور صرف ایک پیر پر کھڑا رہا آپ نے فرمایا: دوسرا پیر بھی اٹھالو، اس نے کہا میں دوسرا پیر اٹھا نہیں سکتا ،حضرت علیؓ نے فرمایا: بس یہی تمہارے سوال کا جواب ہے، تقدیر کی وجہ سے نہ انسان اتنا مجبور ہے کہ کچھ کر ہی نہ سکے اور نہ اتنا آزاد ہے کہ جو چاہے کرے، مثلاً آپ خود غور فرمائیں کہ جب آپ نیکی یا گناہ کا کام کرتے ہیں تو آپ کے سامنے دونوں راستے ہوتے ہیں، گناہ کا صدور آپ سے ہوسکتا ہے اور اگر آپ ارادہ وعزم کریں تو گناہ سے بچ بھی

سکتے ہیں، چنانچہ آپ دیکھ سکتے ہیں کتنے گنہگار، بدمعاش اور شریر قسم کے لوگ ہیں جو اپنی سچی توبہ اور مخلصانہ عزم وارادہ کے بعد گناہوں سے بالکل دور اور محفوظ رہتے ہیں، اگر وہ آپ کی سوچ کے مطابق بالکل پیدائشی گنہ گار ہوتے تو پھر وہ ہمیشہ گنہگار ہی رہتے۔

۷) اگر آپ کی سوچ کے مطابق انسان کو ''مجبورِ محض'' مان لیا جائے تو بارگاہ خداوندی میں بندہ کے اعمال کا حساب وکتاب اور سوال وجواب کا عقیدہ بھی غلط قرار پائے گا، اس لیے کہ حساب وکتاب اور سوال وجواب اُس وقت درست اور صحیح ہوگا جب اعمال کو انجام دینے میں بندہ کے ارادہ واختیار کا دخل ہو، یہ تو سراسر ناانصافی اور ظلم ہوگا کہ ایک شخص کے ہاتھ پاؤں بالکل بندھے ہوئے ہیں اور آپ اُس مجبور اور معذور سے باز پرس کررہے ہیں کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا اور فلاں کام کیوں نہیں کیا؟

۸) تقدیر درحقیقت اللہ تعالیٰ کی معرفت کا راستہ ہے، اس کے ذریعہ انسان کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت اپنی مرضی اور منشاء کا مالک نہیں ہے؟ اس کی وجہ انسان خودسر نہیں ہوتا، بعض مرتبہ آدمی کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن عین اُس کام کے انجام دیتے وقت کوئی رکاوٹ آجاتی ہے اور وہ کام نہیں ہوتا، ایسے موقع پر ہر صاحبِ اقتدار اور بااختیار شخص کے ذہن ودماغ میں اپنے سے ماوراء ایک غیر مرئی طاقت کا تصور ابھرتا ہے اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اُس کی عظیم تر طاقت وقدرت کا اقرار کرتا ہے، اس لیے حضرت علیؓ کا ارشاد ہے: **عرفت ربی بفسخ العزائم** میں نے اپنے رب کو عزائم وارادہ کے ٹوٹنے سے پہچانا، اس پہلو سے اگر تقدیر کے مسئلہ کو سمجھا جائے تو انسانوں پر اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہمیں سمجھ میں آئے گا، ظالم وجابر حکمرانوں کے ظالمانہ فیصلے اور خطرناک منصوبے اس تقدیر کی وجہ سے ناکام ہوگئے، اس لیے کہنے والے نے بہت سچ کہا اور بہت خوب کہا کہ ؎

کسی کے بُرا چاہنے سے کیا ہوتا ہے
وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

۹) تقدیر کا عقیدہ تکلیف ومصیبت کے موقع پر اللہ تعالیٰ کے نیک ومخلص بندوں کے لیے تسلی

کا ذریعہ بھی ہے، نیک آدمی کے دل میں ہمیشہ یہ خیال اور تصور جاگزیں رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کے حاکم و مالک اور آقاء و مولیٰ ہیں اور میں اس کا کمترین بندہ اور بے دام غلام ہوں، وہ مجھے جس حال میں رکھے، میں اُس پر خوش وراضی ہوں اور وہ میرے ساتھ جو معاملہ کرے اُس کے بارے میں مجھے کوئی شکوہ وشکایت نہیں، ''مرضی مولیٰ از ہمہ اولیٰ'' یہ لوگ غم کے موقع پر سینہ کوبی نہیں کرتے، مصیبتوں سے نہیں گھبراتے، ناگہانی حالات وحادثات سے ہمت وحوصلہ نہیں ہارتے، بلکہ نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ زندگی کی شاہراہ پر ترقی وکامیابی کا سفر جاری رکھتے ہیں، اس کو احادیث میں ''رضا بالقضا'' یعنی اللہ کے فیصلوں پر راضی رہنا کے الفاظ سے یاد کیا گیا اور اس کی بڑی فضیلت ہے۔

زندہ دل لوگ تقدیر کا ماتم نہیں کرتے، وہ اپنی پھوٹی قسمت کا مرثیہ نہیں پڑھتے، ایسے لوگ جوان ہمت اور بلند حوصلہ ہوتے ہیں، حسنِ تدبیر سے خود اپنی تقدیر بناتے ہیں، انہیں اس کا بخوبی احساس وادراک ہوتا ہے کہ تقدیر اور تدبیر کے درمیانی ''چولی دامن کا ساتھ'' ہے شاید اس پس منظر میں علامہ اقبالؒ کی نصیحت ہے کہ ؎

ماسوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تیری
تو مسلمان ہو تو، تقدیر ہے تدبیر تیری

اور یہ بھی کہا کہ ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

۱۰) غور کرنا چاہئیے کہ تقدیر کی وجہ سے اچھے اور برے اعمال کے سلسلہ میں آپ کا صرف ایک اشکال تھا، لیکن اس ایک اشکال کے اثرات ونتائج کتنی دور تک جاتے ہیں؟ عقائد اور زندگی کے دیگر حقائق پر اس کی کتنی گہری زد اور ضرب پڑتی ہے؟ شاید اسی کا آپ کو اندازہ نہیں تھا، ہمارے ایمان کی صحت وسلامتی اسی میں ہے کہ ہم تقدیر کے بارے میں اس طرح کے بے بنیاد اشکالات اور بے جا شکوک وشبہات کو اپنے ذہنوں سے جھٹک دیں، تقدیر کے بارے میں جو بات جتنی کہی گئی اس

کو ہم بلا چوں و چرا تسلیم کریں، تقدیر کی زیادہ تحقیق نہ کریں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تقدیر کے بارے میں بحث ومباحثہ اور کٹ حجتی سے منع فرمایا ہے، صحابی رسول حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ:

''ایک دفعہ ہم لوگ (مسجد نبویؐ میں بیٹھے) تقدیر کے مسئلہ میں بحث ومباحثہ کررہے تھے کہ اسی حال میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے (اور ہمیں بحث کرتے دیکھ کر) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت ناراض ہوئے، یہاں تک کہ چہرۂ انور سرخ (لال) ہوگیا اور اس قدر سرخ ہوا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخساروں پر انار نچوڑ دیا گیا، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے فرمایا: کیا تم کو یہی حکم کیا گیا ہے، کیا میں تمہارے لیے یہی پیام لایا ہوں کہ تم قضا وقدر کے جیسے اہم اور نازک مسئلوں میں بحث کرو، خبردار! تم سے پہلی امتیں اُسی وقت ہلاک ہوئیں جب کہ انھوں نے اس مسئلہ میں حجت وبحث کو اپنا طریقہ بنالیا۔ میں تم کو قسم دیتا ہوں، میں تم پر لازم کرتا ہوں کہ (اس مسئلہ میں) ہرگز حجت اور بحث نہ کیا کرو'' (معارف الحدیث، کتاب الایمان: ۱/ ۱۷۴)

اس حدیث سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تقدیر کا مسئلہ کتنا اہم اور نازک ہے، اس کو موضوعِ بحث بنانا ہلاکت وبربادی کا ذریعہ ہے اور یہ بالکل بجا ہے، اس لئے کہ مذکورہ حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید ناراضگی کی کیفیت اور اُس کا اثر بھی بتایا گیا، پس جب آقاء دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم ناراض ہوں تو اُس کی تباہی وبربادی میں کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اِس اُمت کی بیداری سے
ہے حقیقت جس کے دین کی احتساب ِ کائنات

احتساب وجائزہ

منصب امامت اور ہمارا سماج

اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان اور پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کی گواہی کے بعد سب سے پہلے جو فریضۂ بندگی اور عبادت مسلمان پر واجب ہے وہ نماز ہے، اسلام میں نماز کی اہمیت یہی کیا کم ہے کہ اس کو دین کا ستون اور کفر واسلام کے درمیان ''حدِ فاصل'' قرار دیا گیا، یہ وہ تحفہ ہے جو بارگاہِ الٰہی سے شبِ معراج کے موقع پر نبی اکرم ﷺ کے ذریعہ اُمتِ مسلمہ کو دیا گیا، آنحضرت ﷺ کا یہ مبارک ارشاد بارہا ہم پڑھتے اور سنتے ہیں کہ **قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوة** میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، نماز کے علاوہ جتنی دیگر اسلامی عبادات ہیں، مثلاً زکوٰۃ، روزہ اور حج وغیرہ ان کے فرض اور واجب ہونے میں امیر وغریب اور صحت مند ومریض کی شرط ضروری اور لازم ہے، زکوٰۃ کا صاف اصول ہے کہ: **تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِيَائِهِمْ وَتُرَدُّ عَلٰى فُقَرَائِهِمْ** (بخاری ومسلم: بحوالہ امعارف الحدیث ۴/۲۵) مالداروں سے لی جائے اور غرباء ومساکین کو دی جائے، حج اس پر فرض ہے جو بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت واستطاعت رکھے، سفر حج کے اخرجات برداشت کر سکے، روزہ صحت منداور تندرست پر فرض ہے، لیکن نماز وہ واحد عبادت ہے جو ہر عاقل، بالغ مسلمان پر سوائے بے ہوشی اور جنون کے ہر حالت میں فرض ہے، کھڑا ہونا ممکن نہیں تو بیٹھ کر پڑھے، بیٹھا نہ جاتا ہو تو لیٹ کر پڑھے، نماز کی ادائیگی ہر حال میں ہے، چھٹکارا اور معافی کا کوئی سوال نہیں۔

پھر جیسے ہر عبادت اور فریضۂ بندگی بجالانے کے آداب واحکام ہوتے ہیں اسی طرح نماز کی ادائیگی کے بھی کچھ آداب واحکام ہیں، ابتداءِ اسلام میں نماز کے دوران اور درمیان سلام وکلام اور بات چیت کی اجازت تھی، لیکن جب قرآن مجید کا یہ حکم نازل ہوا کہ: **وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ** (البقرۃ: آیت:۲۳۸) یکسو ہو کر اللہ کی عبادت کرو، اس طرح بات چیت اور سلام وکلام کی اجازت منسوخ ہوگئی۔ (بخاری: ۱/۱۲۰)

عبادت وبندگی میں یکسوئی اور دل جمعی کو خشوع وخضوع کہتے ہیں، نماز میں یکسوئی اور دلجمعی کی کیفیت جس کے اندر جتنی زیادہ ہوگی خشوع وخضوع کا اہتمام اس کے اندر اتنا ہی زیادہ ہوگا، اللہ کے

رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کی بندگی ایسی کرو کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یہ کیفیت اگر تمہارے اندر نہ ہو تو کم از کم اتنا احساس تمہیں ہونا چاہیے کہ اللہ تم کو دیکھ رہا ہے، اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَأَنَّکَ تَرَاہُ، فَاِنْ لَّمْ تَکُنْ تَرَاہُ فَاِنَّہٗ یَرَاکَ (الحدیث) قرآن مجید میں ان اہل ایمان کی فلاح و کامیابی کو یقینی بتایا گیا جو اپنی نمازوں میں خشوع وخصوع اختیار کرتے ہیں، (المومنون:۱) دوران نماز کھجلانا، اعضاء وجوارح کو حرکت دینا اور آنکھوں کی کنکھیوں سے اِدھر اُدھر دیکھنا وغیرہ، یہ سب باتیں نماز میں خشوع وخضوع کے خلاف ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی والدہ حضرت امّ رومان رضی اللہ عنہا کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں دوران نماز اِدھر اُدھر جھکی جارہی تھی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مجھے دیکھ لیا اور اس زور سے ڈانٹ پلائی کہ میں نماز توڑنے کے قریب ہوگئی، پھر انھوں نے نماز کے بعد حضور ﷺ کا یہ ارشاد مجھے سنایا کہ جب تم نماز پڑھنے کے لیے کھڑے ہوں تو اپنے تمام بدن کو بالکل سکون سے رکھو، یہود کی طرح ہلو نہیں، اس لیے کہ بدن کے تمام اعضاء کا نماز میں بالکل سکون سے رہنا نماز کے پورے ہونے کا جز ہے۔

یہ صحیح ہے کہ خشوع وخضوع اندرونی جذبہ اور دلی کیفیت کا نام ہے، لیکن دل کی حالت کو متوجہ رکھنے اور اندرونی کیفیات کو بہتر بنانے کے لیے ظاہری آداب واحکام کی پابندی اور رعایت بھی ضروری ہے، جیسے نماز میں اعضاء جوارح کو اطمینان وسکون سے رکھنا ظاہراً خشوع وخضوع پیدا کرنے کا ذریعہ اور سبب ہے، اسی طرح امام کا پروقار، وجیہ اور باصلاحیت وقابل ہونا، اچھی آواز اور پرسوز لہجہ میں تلاوت کرنا بھی نماز میں خشوع وخضوع، دلجمعی اور یکسوئی کو برقرار رکھنے میں بنیادی کردار اور اہم رول ادا کرتا ہے، نیز عقل ودانشمندی کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو ذمہ داری جتنی زیادہ عظیم الشان ہو اس کو نبھانے اور انجام دینے والا شخص اتنا ہی قابل ترین ہو، ظاہر ہے کہ اسلام میں جب نماز کی اہمیت اس کی فرضیت وفضیلت اور عظمت مسلّمہ ہے تو منصبِ امامت اور اذان ــــــ جس کی بناء پر پوری ملتِ اسلامیہ ایک آواز پر جمع ہوتی ہے، ہر طرح کے فرق وامتیاز کو مٹا کر ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور ایک شخص واحد کی نقل وحرکت کے پابند وتابع ہوتے ہیں ــــــ کیا اتنا گیا گذرا اور کمتر ہے کہ ہرا یرا غیرا آدمی اس پر فائز ہوجائے ؟؟

منصبِ امامت کی اہمیت اور اس کی عظمت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ وقت کے نبی

اور پیغمبر فریضۂ امامت انجام دیا کرتے تھے، گذشتہ جتنی امتیں گذری ہیں ان کے امام خود ان کے انبیاء کرام ہوا کرتے، نبی اکرم ﷺ اپنی حیاتِ طیبہ میں خود نماز کی امامت فرماتے تھے، اخیر دنوں میں وفات کے قریب آپ ﷺ کے حکم پر خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو انبیاء کے بعد تمام انسانوں میں سب سے افضل ہیں لوگوں کو نماز پڑھانے لگے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بعد جتنے خلفاء گذرے ہیں وہ اپنے عہدِ خلافت میں نمازوں کی امامت خود کیا کرتے تھے، اس لیے فقہائے اسلام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ جس جگہ اسلامی حکومت ہو وہاں پر اسلامی حکومت کا امیر، نائب امیر، یا قاضی ہی نماز پڑھا سکتا ہے، ان کے علاوہ کوئی دوسرا شخص امامت نہیں کرسکتا، الا یہ کہ کوئی دوسرے قابل شخص جس کو اسلامی حکومت کی طرف سے اجازت دی گئی ہو، پس جیسے آنحضرت ﷺ نے نماز کی ادائیگی کے احکام اور اس میں خشوع و خضوع کے اہتمام کو بیان فرمایا ہے، ایسے ہی آپ ﷺ نے اس کی بھی رہنمائی فرمائی کہ امام اور مؤذن کو کن صفات و خصوصیات کا حامل ہونا چاہیے؟ آپ ﷺ نے اس کی بھی نشاندہی فرمائی کہ وہ کونسی خامیاں اور کمزوریاں ہیں جن سے امام اور مؤذّن کو دور رہنا چاہیے؟

صحیح مسلم کی ایک روایت میں آنحضرت ﷺ نے امامت کی ترتیب اور اس کی درجہ بندی کو تفصیل سے بیان فرمائی، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: لوگوں کی امامت وہ کرے جو اُن میں سب سے زیادہ قرآن پڑھنے (جاننے) والا ہو، اگر یہ خصوصیت تمام لوگوں میں برابر ہو تو وہ شخص امامت کرے جو سب سے زیادہ حدیث کا علم رکھتا ہو، اگر اس میں بھی سب لوگ برابر ہوں تو جس نے سب سے پہلے ہجرت کی وہ نماز پڑھائے، اگر سب کی ہجرت کا زمانہ ایک ہو تو پھر وہ امامت کرے جو سب سے زیادہ عمر رسیدہ بزرگ ہو، "قاریٔ قرآن" کا مفہوم و مطلب واضح رہے کہ اس سے مراد صرف اچھی آواز میں تلاوت کرنا نہیں ہے، بلکہ اچھی آواز میں تلاوت کے ساتھ قرآن مجید کی آیات کے معانی کو جاننا اور سمجھنا بھی ہے، اس لیے کہ عہدِ نبوی ﷺ میں قاریٔ قرآن کا یہی تصور تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ جب ہم قرآن مجید کی کوئی آیت سیکھتے، جب تک اس کو اچھی طرح سمجھ نہ لیتے اور اس پر عمل نہ کرلیتے تب تک ہم آگے نہیں بڑھتے، ہجرت میں سبقت، امامت کا یہ معیار

چوں کہ موجودہ حالات میں باقی نہ رہا اس لیے فقہاءِ کرام نے اس جگہ تقویٰ وصلاح اور نیکی وشرافت کی شرط لگائی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں جو اچھے اور بہتر لوگ ہوں ان کو اپنا امام بناؤ، کیوں کہ وہ تمہارے رب کی بارگاہ میں تمہارے اور پروردگار کے درمیان تمہارے نمائندے ہیں، (الحدیث) اس حدیث میں آپ ﷺ نے امام کو اللہ تعالیٰ اوراس کے بندوں کے درمیان نمائندہ قرار دیا، اور ظاہر ہے کہ نمائندہ اسی کو بنایا جاتا ہے جو اس کی پوری صلاحیت ومہارت رکھتا ہو، کسی بھی اہم مسئلہ، واقعہ اور مرحلہ پر بہتری اور بھلائی کا دارومدار صحیح اور کامیاب نمائندگی پر ہی ہوتا ہے، مثلاً کسی مقدمہ میں آپ کا وکیل آپ کے موقف کی پُرزور نمائندگی کرنے اور بحث کرنے میں اپنی پوری مہارت وقابلیت صرف کردے، تب ہی آپ مقدمہ جیت سکتے ہیں، اسی طرح دوملکوں یا کسی بھی نوعیت کے دوفریقوں کے تعلقات کے سدھار اور بگاڑ میں بنیادی کردار سفارت کاروں اور نمائندوں کا ہوتا ہے، مگر افسوس ہے کہ نمائندوں کی یہ نزاکت اور اہمیت دنیا کے چھوٹے بڑے مسئلہ اور موقع پر خوب ملحوظ رکھی جاتی ہے لیکن دین ومذہب کے معاملہ میں ائمہ حضرات کی تقرری کے وقت نظر انداز کردی جاتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری نمازیں قبول ہوں تو اپنے میں سے بہتر شخص کو امام بناؤ، (رواہ الحاکم والطبرانی) ایک دوسری حدیث اگرچہ اس کی سند کمزور ہے، اس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے متقی پرہیزگار عالمِ دین کے پیچھے نماز پڑھا گویا اس نے پیغمبر کے پیچھے نماز پڑھی، (ہدایہ: ۱/ ۱۳۳ حاشیہ) اسی طرح اگر مقتدی حضرات کسی معقول اور شرعی سبب کی بنا پر امام کو ناپسند کرتے ہیں تو ایسے شخص کا بھی نماز پڑھانا درست اور جائز نہیں، آپ ﷺ کا ارشاد ہے کہ: تین آدمیوں کی نماز شرفِ قبولیت پانے کے لیے ان کے سروں سے بالشت بھر بھی اوپر نہیں جاتی، ایک بھگوڑا غلام جب تک وہ واپس نہ آجائے، دوسرے وہ عورت جو اس حال میں رات گذارے کہ اس کا شوہر اس سے ناراض ہو، تیسرے وہ امام جس کو لوگ ناپسند کرتے ہیں، اس مضمون کی ایک دوسری روایت میں بھگوڑے غلام کی جگہ ایسے دو بھائیوں کا اضافہ ہے جو اپنے درمیان خونی ومذہبی رشتہ رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے دوری اور قطع تعلقی اختیار کیے ہوئے ہوں، ان دونوں کی نماز

بھی قبول نہیں ہوگی، (مشکوٰۃ، باب الامامۃ: ص:۱۰۰) اس کے علاوہ دین سے جاہل اور احکام ومسائل سے ناواقف شخص کی امامت بھی درست نہیں، رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ایک شخص نے امامت کی ،آپ ﷺ نے اس کو قبلہ کی جانب سے تھوکتے ہوئے دیکھ لیا، آپ ﷺ نے لوگوں سے فرمایا کہ آئندہ یہ شخص تمہاری امامت نہ کرنے پائے، اس کے بعد یہ شخص نماز پڑھانے کے لیے آگے بڑھا، لوگوں نے اس کو یہ کہہ کر پیچھے ہٹادیا کہ رسول اللہ ﷺ نے تمہیں امام بنانے سے منع فرمادیا ہے۔ (ابوداؤد: ۱/ ٦٩)۔

پھر یہ کہ احادیث میں منصبِ امامت کے لیے وجوہاتِ ترجیح اور استحقاق کے معیار کو بیان کرنے کے ساتھ امام کی ذمہ داری کو بھی بتایا گیا، مثلاً آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ جب تم میں سے کوئی شخص امامت کرے تو چاہیے کہ مختصر اور چھوٹی سورتوں کے ذریعہ ہلکی نماز پڑھائے، اس لیے کہ مقتدیوں میں بیمار بھی ہوتے ہیں، کمزور، ضعیف، بوڑھے بھی اور ضرورت مند بھی، البتہ جب تم میں کوئی اکیلے تنہا نماز پڑھے تو جتنی لمبی نماز پڑھنا چاہے پڑھے، (متفق علیہ، مشکوٰۃ: ص:۱۰۱) ہلکی اور مختصر نماز پڑھانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ امام صحیح ڈھنگ سے ارکان بھی ادا نہ کرے، جلد سے جلد جیسے تیسے نماز کو نمٹانے لگے، نماز میں تخفیف کا مطلب یہ ہے کہ نماز مختصر ہو، لیکن پورے سکون واطمینان کے ساتھ مکمل ہو، کوئی رکن ادھورا نہ رہے، حضرت انس رضی اللہ عنہ جو ۱۰ ر سال کی عمر ہی سے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہے، آپؓ نے فرمایا کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کے علاوہ کسی امام کے پیچھے سب سے ہلکی اور مکمل نماز نہیں پڑھی، آپ ﷺ کا معمولِ مبارک تھا کہ نماز میں جب بچہ کے رونے کی آواز سنتے تو نماز مختصر فرمادیتے، اس اندیشہ کے پیشِ نظر کہ اس کی ماں آزمائش میں نہ پڑ جائے، (حوالۂ سابق) ایک مرتبہ ایک صحابی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! میں اپنے محلہ کے مسجد میں نماز کے لیے اس لیے تاخیر سے پہنچتا ہوں کہ امام صاحب لمبی اور طویل نماز پڑھاتے ہیں، اس پر آپ ﷺ شدید ناراض ہوئے اور لوگوں کو خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کچھ لوگ دوسروں کو نماز سے متنفر کرنا چاہتے ہیں پس تم میں سے جو شخص لوگوں کو نماز پڑھائے چاہیے کہ وہ نماز کو ہلکی کرے اس لیے کہ لوگوں میں ضعیف اور بوڑھے اور ضرورت

مند ہوتے ہیں ،(حوالۂ سابق)

نماز میں مقتدی حضرات کی رعایت کی خاطر امام الانبیاء حضرت محمد ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاءِ اسلام نے پنج وقتہ نمازوں میں پڑھنے کے لیے طوالِ مفصل (سورۃ الحجرات تا سورۃ البروج) اوساطِ مفصل (سورۃ البروج تا سورۃ الفیل) اور قصارِ مفصل (سورۃ الفیل تا سورۃ الناس) مختلف سورتوں کی تعیین کی ہے، تاکہ امام کو ان سورتوں اور ان کے مماثل دیگر قرآنی آیات کے انتخاب میں سہولت و آسانی ہو، ایک مرتبہ صحابی رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اپنے قبیلہ میں عشاء کی نماز پڑھا رہے تھے اور آپؓ نے سورۃ الفاتحہ کے بعد سورۃ البقرۃ شروع کردی، اتنے میں مقتدیوں میں شامل ایک صحابی جو دن بھر کے تھکے ماندے تھے نماز توڑ کر پیچھے ہٹ گئے اور اپنی نماز تنہا الگ پڑھ لی، نماز باجماعت کا اہتمام نہ کرنا چونکہ منافقوں کا طریقہ تھا اس لیے لوگوں نے پوچھنا شروع کردیا کہ کیا آپ منافق تو نہیں ہو گئے؟ انہوں نے کہا: خدا کی قسم! میں ہرگز منافق نہیں ہوا، میں خود یہ معاملہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رکھوں گا، پھر یہ صحابی بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے: اے اللہ کے رسول! ہمارا کام اونٹوں کے ذریعہ پانی سینچنا ہے، ہم لوگ دن بھر محنت ومشقت کرتے ہیں، گذشتہ رات ایسا ہوا کہ معاذ نے عشاء کی نماز میں سورۃ البقرۃ شروع کردی، یہ سن کر آنحضرت ﷺ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ معاذ! کیا لوگوں کو تم فتنہ میں ڈالنا چاہتے ہو؟ سورۃ والشّمس، سورۃ والضحیٰ، سورۃ اللیل اور سورۃ الاعلیٰ پڑھا کرو۔ (بخاری ومسلم)

منصبِ امامت کی اہمیت وعظمت کے ساتھ اسلامی شریعت میں منصبِ اذان کو بھی نمایاں اہمیت دی گئی ہے، جو خوبیاں اور خصوصیات ایک امام کے لیے احادیث میں مذکور ہیں، قریب قریب یہی خوبیاں ایک مؤذن کے لیے بھی بیان کی گئی ہیں، آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ تم میں کا بہترین آدمی اذان دے، لِيُؤَذِّنَ لَكُمْ خِيَارُكُمْ، فقہ حنفی کی مستند ومشہور کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے کہ: ”موذن عقل مند، محتاط، متقی، پرہیزگار، نیک اور صالح ہو،“ وَيَنْبَغِي أَنْ يَكُونَ الْمُؤَذِّنُ رَجُلاً عَاقِلاً صَالِحاً عَالِماً بِالسُّنَّةِ۔ (عالمگیری: ۱/ ۲۵) اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ مؤذن کی آواز جہاں تک جاتی ہے قیامت کے دن وہاں تک کی ہر چیز اس کے لیے گواہی دے گی، ایک دوسرے

موقع آپ ﷺ نے فرمایا: قیامت کے دن مؤذنین کی گردنیں سب سے اونچی رہیں گی۔

اس وقت ''اصلاح معاشرہ'' کے عنوان پر امتِ مسلمہ کو پریشانی اوراس کی زبوں حالی کے اسباب کو ڈھونڈنے اوراس کے حل کرنے کی مختلف کوششیں ہورہی ہیں، ان کاوشوں اور محنتوں کا نقطۂ آغاز مساجد سے ہونا چاہیے، اس لیے کہ یہ اصلاح وسدھار کے مراکز ہیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ ائمہ کرام ومؤذنین خود اپنے منصب ومقام کو پہچانیں، مساجد کمیٹی کے افراد ومتولیان اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور ملت کا ہر طبقہ ائمہ ومؤذنین کے تعلق سے اپنی سوچ وفکر اور ذہنیت کو بدلے، تب جاکر بارگاہِ الٰہی میں قوم کی صحیح نمائندگی ہوگی اور مسلمانوں کو مساجد سے اپنی زندگیوں میں افسردگی وپژمردگی کے بجائے سربلندی وسرفرازی، بلند کرداری، احساس برتری وخوداعتمادی کا ایک انقلاب آفرین پیغام ملے گا، پھر شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ کی یہ دعا اور تمنا بھی قبول ہوگی کہ ؎

خدا نصیب کرے ہند کے اماموں کو
وہ سجدہ جس سے ہے ملت کی زندگی کا پیام

کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

منصبِ امامت واذان کی اہمیت ،فضیلت اورعظمت کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی روشن ہدایات اور واضح تعلیمات موجود ہیں، لیکن ائمہ اورمؤذنین کے انتخاب وتقرری کے معاملہ میں مساجد کمیٹی کے ذمہ داران اور متولیان کہاں تک ان ہدایات اور تعلیمات کی پیروری کرتے ہیں، اس کا انھیں پوری دیانتداری اور سنجیدگی سے جائزہ لینا ہوگا، اس وقت مسلم معاشرہ جس ذلت وپستی ، رسوائی اورشرمندگی کے دور سے گذر رہا ہے وہ کسی باخبر صاحبِ نظر سے مخفی نہیں ہے، ہرکوئی ہمارے سماجی بگاڑ اورفساد پر مرثیہ خواں اور ماتم کناں ہے، غور کرنا چاہیے کہ ہردن نوع بہ نوع ،نت نئ بیماریاں اور برائیاں مسلم معاشرہ میں کیوں کرپھیل رہی ہیں اور پنپ رہی ہیں؟ اس کی بنیادی اوراصل وجہ صحیح رہنمائی ورہبری کا نہ ہونا ہے، پھر یہ بھی دیکھنا اورتلاش کرنا ہوگا کہ رہنمائی اورہبری کے مراکز کیا ہیں اورکہاں ہیں؟ کیا وہ دینی مدارس اورجامعات جہاں متعینہ نصابِ تعلیم اورخاص نظام تربیت کےتحت درس وتدریس کا انتظام ایک محدود مدت تک رہتا ہے؟ کیا وہ عوامی جلسے کہ جس میں "زورِخطابت" کی دادوصول کی جاتی ہے؟؟ یا اصلاح معاشرہ کے وہ سمینار اورکانفرنسیں جس میں کوئی فیصلہ کن اقدام کرنے کے بجائے چند کاغذی تجاویز اوررسمی قراردادیں منظور ہوتی ہیں۔؟؟

رہنمائی ورہبری کے اصل مراکز مساجد ہیں، ان مراکز میں اسلامی تعلیمات اوردینی احکام سے متعلق سچی رہنمائی اورصحیح رہبری کا اگر پختہ انتظام ہوتو پھر کوئی وجہ نہیں رہتی کہ برائیوں کا سدِباب نہ ہو، تقریباً محلہ کے ہرفرد کا رابطہ محلہ کی مسجد کے امام سے ہوتا ہےاور مختلف مواقع پر امام سے واسطہ وسابقہ پڑتا ہے، رہنمائی وررہبری کا صحیح ڈھنگ کا انتظام اسی وقت ہوگا جب کہ مساجد کے امام بہترین دماغ کے حامل ہوں ،ان میں اعلیٰ درجہ کی صلاحیت وقابلیت ہو، جو اپنے اندر فکر کی گہرائی اورنظر کی توانائی رکھتے ہوں ،لیکن کیا کیا جائے ان صفات وخصوصیات کا حامل ملت کا ذہین اورفطین طبقہ دیگر اداروں

اور ’’کونسلوں‘‘ میں تو بہت دیکھنے میں آئے گا، مگر مساجد کے منبر ومحراب ایسے لوگوں سے خالی نظر آتے ہیں، اسی کو دانا حکیم اکبر الٰہ آبادی نے کہا تھا کہ ؎

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے
کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

ہمارے یہاں امام ومؤذّن عموماً ایسے حضرات مقرر کیے جاتے ہیں جو وظیفہ یاب ہوتے ہیں، انہیں اذان ونماز کے مسائل سیکھ کر اپنی مفوضہ ذمہ داری کو صحیح طریقہ پر انجام دینے سے زیادہ ثواب کمانے کی فکر زیادہ رہتی ہے، لیکن یہاں تو نیکی کمانے کے بجائے غلط طریقہ پر اذان ونماز ہونے کی وجہ سے الٹا خود کا اور دوسروں کا گناہ اپنے سر لینا پڑ رہا ہے، اخیر عمر میں تقویٰ ونیکی کے کاموں میں لگنے کے واسطے اور بھی بہت ذرائع اور وسائل ہیں جو اپنائے جا سکتے ہیں، کسی فرد واحد کا نیکی اور ثواب کے نام پر اذان جیسے اسلامی شعار اور امامت جیسے عظیم منصب کے وقار واعتبار کو داؤ پر لگا دینا اور ملت کی نمازوں کا اجتماعی جنازہ نکال دینا انصاف ودیانت کا خون نہیں تو اور کیا ہے۔

منصب اذان وامامت کے سلسلہ میں بے توقیری اور بے توجہی کے قصور وار خود مساجد کی کمیٹی کے ذمہ دار بھی ہیں، ان کی یہ بھرپور اور مستقل کوشش رہتی ہے کہ مسجد شاندار، عالی شان ہو، اس میں نازک ونفیس جھومر ہوں، خوبصورت وخوشنما بجلی کے بلپ ہوں، نرم گداز ایرانی قالین ہو، حتیٰ کہ طہارت خانوں میں ٹائیلس اتنے صاف شفاف ہوں کہ آئینہ کا گمان ہونے لگے، غرض یہ کہ مسجد کو سجانے اور سنوارنے کے لیے نفاست، نزاکت اور جاذبیت کو آخری حد تک ملحوظ رکھا جاتا ہے، اس کے برخلاف امام ومؤذّن کی تقرری کا مسئلہ جب پیش آئے تو سماج کے ایسے افراد رکھے جاتے ہیں جو ’’قبر میں پیر لٹکائے بیٹھے ہوں‘‘ جن کی حیثیت کمیٹی کے نزدیک امام سے زیادہ غلام کی سی ہوتی ہے، یوں تو دنیا میں معمولی کلرک کی ملازت کے لیے بھی جسمانی صحت وتندرستی کو خاص اہمیت دی جاتی ہے، لیکن صد افسوس کہ اذان وامامت کے لیے پہلی ترجیح سب سے زیادہ کمزور، ضعیف وناتواں کو ہوتی ہے، جو کم سے کم مشاہرہ پر امامت کے لیے تیار ہو، پھر طرفہ تماشہ یہ کہ ایسے ہی بعض ذمہ دار حضرات طنزیہ طور پر علامہ اقبال کا یہ شعر بھی بڑی بے شرمی سے سناتے ہیں: ؎

قوم کیا چیز ہے ، قوموں کی امامت کیا ہے
اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دورکعت کے امام

حقیقت اور سچائی یہ ہے کہ کہ جس دن کمیٹی کے ذمہ داران ''قوموں کی امامت'' کا صحیح تصور اور اُس کا گہرا و پختہ علم رکھنے والے انتہائی اعلیٰ قابلیت اور باصلاحیت ائمہ کرام کا تقرر کریں گے تو خود اُن کی اپنی چودھراہٹ خطرہ میں پڑ جائے گی، غیر شرعی کاموں اور کاروبار میں ملوث نااہل ممبران کمیٹی کا ناطقہ بند ہوجائے گا، پس قصور روزگار سے مجبور آئمہ حضرات کا نہیں اصل قصور ہمارا ہے، ہم کو تو صرف ''دورکعت کے امام'' چاہیئے، باقی زندگی کے دوسرے مراحل اور مسائل میں ہمیں امام کی شرعی رہنمائی و رہبری سے کوئی مطلب نہیں، قوم کا عمومی مزاج یہ ہے کہ چونا، مٹی، رنگ وروغن اور درودِیوار پر جتنا زیادہ خرچ ہو خرچ کیا جائے، لیکن اس پر کوئی توجہ اور دلچسپی ہی نہیں کہ اپنی دولت کا ایک معمولی حصہ کسی انسان کے کام آجائے، باصلاحیت اور قابل ائمہ کرام اس لیے نہیں رکھے جاتے ہیں کہ انہیں بہت زیادہ مشاہرہ پیش کرنا پڑتا ہے، حالانکہ مسجد کی تعمیر اور اس کی سجاوٹ پر جب لاکھوں کروڑوں خرچ ہوسکتے ہیں تو ایک لائق وقابل امام کو معقول ومناسب مشاہرہ ادا کرنا کونسا مشکل کام ہے؟؟ بات صرف مشاہرہ اور تنخواہ کی نہیں، بلکہ دین اور اہل دین کی قدردانی کی بھی ہے، جو رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی ہے، سجاوٹ وبناوٹ، آرائش وآسائش کے پس منظر میں یہ چیز نوٹ کی جاسکتی ہے کہ آج کا انسان اپنی ناقدری کے نازک ترین دور سے گذر رہا ہے، جس میں انسانی جان کی قدر وقیمت، اس کی حیثیت وعظمت چونا مٹی اور رنگ وروغن جیسی بے جان چیزوں کے مقابلہ میں کم تر ہوگئی۔

ائمہ اور مؤذّنین کے تقرر وانتخاب کے حوالہ سے مساجد کمیٹی کے ذمہ داران اور پوری ملتِ اسلامیہ کے لمحۂ فکر یہ ہے کہ ایک ایسا مقام ومنصب جس پر امام الانبیاء ﷺ اور وقت کے خلفاء کھڑے ہوتے تھے، آج اس کی یہ حیثیت اور وقعت ہوگئی کہ نااہل لوگ اس کو سنبھالے ہوئے ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: جس قوم میں بہتر اور قابل شخص ہو اس کے باوجود نااہل شخص امامت کرے تو وہ قوم پستی وذلت میں رہے گی۔ (فتاویٰ ابن تیمیہ، کتاب الصلوٰۃ) ایک صحابی نے دریافت کیا کہ قیامت کب آئے گی؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اِذَا وُسِدَ الْاَمْرُ اِلٰی غَیْرِ اَھْلِہٖ فَانْتَظِرِ السَّاعَۃَ جب کوئی معاملہ کسی نااہل کے

حوالہ وسپرد کر دیا جائے تو تم قیامت کا انتظار کرو۔

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ائمہ ومؤذنین کے انتخاب کے معاملہ میں اپنی ذہنیت وسوچ کو تبدیل کریں، اپنی بدذوقی کو ختم کریں، ائمہ ومؤذنین کے تقرر کے وقت کتاب وسنت کے معیار کو سامنے رکھیں، تاکہ ایک طرف منصب امامت واذان کا وقار اور اعتبار پامال نہ ہو اور دوسری طرف ائمہ وخطیب حضرات مسلم معاشرہ میں اپنا مرکزی کردار ادا کر سکیں۔

......روزنامہ منصف: ۸؍جولائی ۲۰۰۵ء......

رہ گئی رسمِ اذاں، روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

❁❁❁

تیرا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گذر، ایسے امام سے گذر

کیا ہم صرف رمضانی مسلمان ہیں؟؟

مدینہ میں غزوۂ احد کا اعلان ہوا، منادی کرائی گئی کہ تمام لوگ جنگ کے لیے تیار ہو جائیں، اعلان سن کر صحابیِ رسول ﷺ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ میدانِ جنگ کی طرف نکل پڑے، میدانِ جنگ میں آپؓ نے شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھلائے، دشمنانِ اسلام کے چھکے چھڑا دیے اور ان کے دانت کھٹے کر دیے، یہاں تک کہ مرتبۂ شہادت سے سرفراز ہوئے، یاد رہے کہ شہید کو غسل نہیں دیا جاتا، بلکہ اسی خون آلود جسم کے ساتھ کفن پہنا کر دفن کر دیا جاتا ہے، حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی نعش جب لائی گئی تو اسلامی فوج کے سپہ سالارِ اعظم (کمانڈر اِنچیف) رسولِ اکرم ﷺ نے ملاحظہ فرمایا کہ نعش سے مقدس لہو کے ساتھ پانی کے قطرے بھی بہہ رہے ہیں، آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ دیکھتے نہیں فرشتے تمہارے ساتھی حنظلہ کو نہلا رہے ہیں، جنگ کے بعد مدینہ منورہ پہنچنے پر حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے گھر سے سارا معاملہ دریافت کیا گیا، جس پر بتایا گیا کہ جس دن جہاد کا اعلان ہوا اس سے ایک دن قبل ہی حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کا نکاح ہوا تھا اور شبِ زفاف ہونے کی وجہ سے آپؓ غسل فرما رہے تھے، ابھی آپ رضی اللہ عنہ سر پر پانی ڈالے ہی تھے کہ جہاد کی ندا کانوں سے ٹکرائی اور آپؓ اسی لمحہ غسل ادھورا چھوڑ کر جہاد کے لیے نکل پڑے، اس واقعہ کے بعد حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ **غسیل ملائکہ** کے لقب سے یاد کیے جانے لگے۔

یہی صحابیِ رسول ﷺ غسیل ملائکہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ سے میری ملاقات ہوئی، انہوں نے حسب عادت دریافت فرمایا کہ کہو حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا ''حنظلہ تو منافق ہو گیا'' (یعنی صحابیِ رسول نے اپنے آپ پر نفاق کے اندیشہ کیا) حضرت ابوبکرؓ نے حیرت و تعجب کے ملے جلے انداز میں کیا: سبحان اللہ! آپ بھی کیا بات کرتے ہیں؟ پھر میں نے وضاحت کی کہ جب ہم رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہتے ہیں اور آپ ﷺ جنت و جہنم کا تذکرہ فرماتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

جنت وجہنم گویا ہماری نظروں کے سامنے ہیں،لیکن جب ہم رسول اللہ ﷺ کی مجلس سے اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں اوراپنے بال بچوں کے ساتھ مصروف ہوجاتے ہیں توہمیں جنت وجہنم کا کچھ خیال ہی نہیں رہتا، جنت وجہنم کے بارے میں ہمارے ایمان ویقین کی حالت وکیفیت یکساں نہیں رہتی، یہ سن کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کہا: بخدا میری بھی یہی حالت رہتی ہے، پھر دونوں بزرگ صحابی رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں پہنچتے ہیں، رسول اللہ ﷺ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ سے دریافت فرماتے ہیں کہ کیا حال ہے؟ حنظلہ! کیسے آنا ہوا؟ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں **نافق حنظلہ** (حنظلہ منافق ہوگیا) آپ ﷺ فرماتے ہیں: کیوں؟ کیا بات ہوئی؟ صحابی رسولؐ کہتے ہیں کہ جب ہم آپ کی مجلس میں رہتے ہیں اورآپ جنت وجہنم کے تذکرہ سے ہمیں نصیحت کرتے ہیں تو ہمارے ایمان ویقین کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جنت وجہنم گویا ہماری نگاہوں میں ہے،لیکن آپ کی مجلس سے اٹھنے کے بعد گھروں میں بیوی بچوں کے ساتھ دل جوئی ودل لگی کرتے وقت ہماری یہ کیفیت باقی نہیں رہتی ، یہ سن کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اے حنظلہ! اگر تمہاری ایمانی کیفیت ہمیشہ اسی طرح ہوتی جیسے میری مجلس میں ہوتی ہے ،خدا کی قسم فرشتے تم سے تمہارے بستروں اورتمہارے راستوں پر ملاقات کرنے لگیں گے،لیکن حنظلہ! یادرکھو کچھ وقت ایسا بھی اور کچھ وقت ویسا بھی ، کچھ اوقات اللہ کی عبادت وبندگی کے لیے تو کچھ لمحات انسانی ضرورتوں اور بشری تقاضوں کی تکمیل کے لیے بھی۔ (رواہ مسلم بحوالہ ریاض الصالحین،ص:۸۳ باب فی الاقتصاء فی الطاعۃ)

یہ صحابۂ کرامؓ کی بلند ہستیاں اوران کی پاکیزہ زندگیاں تھیں،انہیں ہمیشہ،ہردم اپنے ایمان ویقین کا احساس اوردھیان رہتا تھا،انہیں یہ بھی خدشہ اوراندیشہ رہتا کہ ان کے اعمال پرکہیں نفاق کی چھاپ اورچھاؤں نہ پڑجائے ،اللہ تعالیٰ کی ذات پران کا ایمان ویقین بہت پختہ اورمضبوط ہوتا،نیکی وبھلائی کے خاص مہینوں اوراوقات میں عبادت ، بندگی میں اضافہ تو ہوتا،لیکن عام مہینوں اوردنوں میں بھی وہ عبادت وبندگی ،نیکی اورخیر کے کاموں سے وہ بالکل غافل نہیں رہتے ، ماہ وموسم کا ماحول ان کی عبادت وبندگی اورخیر کے کاموں پر اثر انداز نہیں ہوتا،اب ہم ذرااپنی بھی ایمانی حرارت اوریقین کی کیفیت کا بھی جائزہ لیں اورمحاسبہ کریں، اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہمارا بھی ایمان ویقین ہے کہ وہ ہمیشہ، ہرجگہ اور ہر دم موجود ہے،کائنات کا کوئی ذرّہ اورواقعہ اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے،لیکن عملی

زندگی میں اس ایمان ویقین کا کوئی کردار نہیں۔

رمضان کا مبارک مہینہ ہے، ہر جگہ عبادت وبندگی کا ماحول ہے، مساجد نمازیوں سے آباد ہیں، گھر اور دوکانیں قرآن مجید کی تلاوت سے معمور ہیں، ہر کوئی محتاط ہے کہ کہیں بھولے سے کوئی گناہ نہ ہو جائے، جھوٹ، چغلی، غیبت اور باہمی لڑائی جھگڑے جن کا رواج اور چلن عام دنوں میں زیادہ ہوتا ہے، اس ماہِ مقدس کے ختم تک ''معرضِ التواء'' میں رہتے ہیں، پھر جیسے رمضان المبارک کے دن گذرنے لگتے ہیں، نمازیوں کی تعداد رفتہ رفتہ کم ہونے لگتی ہے، مساجد ویران اور بازار آباد ہوتے ہیں، پھر جیسے ہی عید کا چاند نظر آیا ایسا معلوم ہو کہ مسجد میں کوئی ایک لمحہ ٹھہرنے کے لیے تیار نہیں، ذہن پر زور ڈالنے سے یاد آئے گا کہ کچھ دنوں پہلے تک مسلمان نام کے لوگ مسجد میں آیا کرتے تھے، گویا ہلالِ عید اگر ایک طرف خوشی ومسرت اور شادمانی پر مژدہ سنایا تو دوسری جانب مساجد کی درودیوار کے لیے حسرت وافسوس اور ویرانی کا پیام لایا۔

رمضان کے ختم پر اس طرح کی ناخوشگوار تبدیلی کو دیکھ کر از خود یہ سوالات اٹھتے ہیں کہ نعوذ باللہ، اللہ کی عظمت وکبریائی کیا صرف ایک ماہ ہی کے لیے ہے؟؟ کیا مسلمانوں پر اسلامی احکام اور تعلیمات کی پابندی صرف ماہِ مبارک ہی میں ہے؟؟ کیا شریعتِ اسلامی کی جامعیت اور آفاقیت اتنی ہی ہے کہ صرف رمضان ہی میں اس کے جلوے دیکھنے کو ملے اور غیر رمضان میں دور دور تک اس کی ادنیٰ جھلک بھی نظر نہ آئے؟؟ یہ سوالات یقینا بہت تلخ اور ناگوار ہیں، لیکن ہمیں اپنی زندگی کے محاسبہ کے لیے اس طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑے گا، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ اپنا محاسبہ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے، حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا۔

قرآن مجید میں عقلمندوں اور خدا تعالیٰ کے مقرب وبرگزیدہ بندوں کی صفات اور خصوصیات جا بجا بیان کی گئی ہیں، ان کی ایک صفت یہ بتائی گئی ہے کہ: ''وہ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں'' (سورۃ آل عمران:۱۹۱) جو شخص اللہ کی یاد میں ہمیشہ لگا رہے وہ کیسے اللہ کے احکام سے غفلت وکوتاہی برت سکتا ہے، ہر مسلمان زبان سے کلمہ طیبہ لا الٰہ اللہ کا اقرار کرتا ہے، دل سے اس کی تصدیق کرتا ہے، پھر اپنے ظاہری اعمال کے ذریعہ اسے تسلیم کرنے کا ثبوت پیش کرتا ہے، قرآن مجید میں اسلام کے اس بنیادی کلمہ

کی مثال ایک ایسے درخت سے دی گئی جس کی جڑیں زمین میں پیوست ہیں اور اس کی شاخین آسمان کی طرف اٹھی ہوئی ہوں، پھر یہ درخت ہر موسم میں اپنا پھل دے گا (سورۃ ابراھیم: ۲۴ تا ۲۵) اپنی ہیئت اور نشوونما کے اعتبار سے کھجور کا درخت اس مثال کا مصداق ہے، جیسا کہ حدیث میں خود اس کی صراحت اور وضاحت کی گئی ہے کہ ایک صحابی رسول ﷺ کی خدمت میں کھجور کے درخت کا گودہ لے کر حاضر ہوئے، اس کو دیکھ کر آپ ﷺ نے صحابہؓ سے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں مؤمن کی مثال ایسے درخت سے دی جس کے پتے کسی موسم میں بھی نہیں سوکھتے، بتاؤ! وہ کون سا درخت ہے؟ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بھی اس مجلس میں حاضر تھے، چاہا کہ کھجور کا درخت کہہ کر سوال کا جواب دے دیں، لیکن بڑے بزرگ صحابہؓ کے ادب میں خاموش رہے، آخر میں خود آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کھجور کا درخت ہے۔ (ملخص از معارف القرآن)

مفسرین اور اہل علم کا بیان ہے کہ مؤمن جب کلمہ طیبہ پڑھتا ہے، اللہ کے اکیلا و یکتا ہونے کا عقیدہ اس کے دل میں پیوست ہوجاتا ہے، پھر اس کی وجہ سے جو اعمال مؤمن انجام دیتا ہے، اس کی قبولیت آسمانوں میں پہنچتی ہے جیسا کہ دوسری جگہ کہا گیا: اِلَیۡهِ یَصۡعَدُ الۡكَلِمُ الطَّیِّبُ وَ الۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡ فَعُهٗ (سورۃ فاطر: ۱۰) پھر یہ کہ جیسے کھجور کا درخت ہر موسم اور ہر مہینہ میں پھل دیتا ہے، اسی طرح مؤمن سے نیک اعمال کا صدور بھی ہر موسم اور ہر ماہ میں ہوتا ہے، کوئی اوقات اور ایام اس کے لیے متعین و مخصوص نہیں، اس کے نیک اعمال کی شاخیں ہر موسم میں سرسبز و شاداب رہتی ہیں، کبھی سوکھتی نہیں، سدابہار رہتی ہیں، تُؤۡتِیۡ اُكُلَهَا كُلَّ حِیۡنٍ...... ہم میں کا ہر شخص کلمہ گو ہے، لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نیکی بھلائی اور خیر کے کاموں کا ہم نے ایک خاص سیزن بنالیا ہے، جس کو عرفِ عام میں ''رمضان'' کہا جاتا ہے، اس مبارک ماہ میں نیکیاں بڑھنی چاہیے نہ یہ کہ اسی میں محدود ہوجائیں۔

آنحضرت ﷺ ایک مرتبہ گھر تشریف لائے، دیکھا کہ گھر میں ایک خاتون بھی موجود ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے دریافت فرمایا کہ یہ کون ہے؟ حضرت عائشہؓ نے بتایا کہ یہ بہت نمازی عورت ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مَهْ'' اس کو رہنے دو، تمہارے لیے اتنی ہی عبادت و بندگی ضروری ہے جتنی کی تم استطاعت رکھتے ہو، خدا کی قسم زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے اللہ کو تمہیں ثواب دینے پر کوئی اکتاہٹ نہیں ہوگی، یہاں تک کہ تم خود ہی بہت زیادہ عبادت کرنے کی وجہ سے اکتا جاؤ، پھر آپ ﷺ نے مزید فرمایا: اللہ

کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دینداری وہ ہے جس پر دوام اور ہمیشگی ہو: وَ کَانَ احَبَّ الدِّیْنِ الَیْہِ مَا دَاوَمَ صَاحِبُہٗ عَلَیْہِ (ریاض الصالحین ص: ۷۷ باب فی الاقتصاد فی الطاعۃ) حضرت عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے فرزند حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اے عبداللہ! تم فلاں کی طرح مت ہو جاؤ جو پہلے تہجد کی نماز پڑھا کرتا تھا، پھر اس نے اس کو چھوڑ دیا۔ (حوالہ سابق ص: ۸۵)

ایمان ویقین میں کمزوری اور اتار چڑھاؤ بعض مرتبہ حالات وماحول کی وجہ سے بھی ہوتا ہے، مشکل اور پریشان کن حالات میں مجبوراً انسان اللہ تعالیٰ کو یاد کرتا ہے، پھر جیسے ہی حالات میں تھوڑا سدھار ہوا اور بہتری آئی اللہ کو ایسے بھول جاتا ہے جیسے کبھی اس نے اللہ کو پکارا ہی نہیں۔ حق تعالیٰ کا فرمان ہے: جب انسان کو نقصان یا تکلیف پہنچتی ہے تو وہ ہمیں پکارتا ہے لیٹے بھی، بیٹھے بھی اور کھڑے بھی اور جب ہم اس سے اس کی تکلیف کو دور کر دیتے ہیں تو ایسا ہو جاتا ہے جیسے اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں۔ (سورۃ یونس: ۱۲)

ایسا ہی مسئلہ ماحول کا ہے، جب تک اچھا اور بہتر ماحول ہے نیکی وبھلائی کے خوب کام کریں گے، پھر جیسے ہی ماحول ختم ہوا، ایسا معلوم ہو کہ نیکی وبھلائی کے کاموں سے ہمارا کوئی رشتہ ہی نہیں ہے، ایک سچے اور پکے مسلمان کی سب سے بڑی خوبی اور خصوصیت یہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ پر اس کا ایمان ویقین ہر حال میں پختہ اور مضبوط ہو، خوشی وغم اور ہر ماہ وموسم میں اس کا رشتہ وتعلق اپنے پروردگار سے باقی رہے، شرعی احکام کی پابندی میں مسجد اور بازار کی تقسیم نہ کرتا ہو، نیکی اور خیر کے کاموں میں رمضان وغیر رمضان کی تفریق نہ کرتا ہو، عقل وانصاف کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ جو ذات ہمیشہ، ہر جگہ اور ہر دَم موجود ہو تو اس کی اطاعت وفرمانبرداری اور اس سے امید وخوف بھی ہر حال میں ہونا چاہیے، ہماری شان اور پہچان بھی اسی میں ہے کہ ہم ''دائمی'' مسلمان ہوں نہ کہ ''موسمی'' مسلمان۔

..........روزنامہ منصف ۱۲ر نومبر ۲۰۰۴ء..........

طبع آزاد یہ قید رمضان بھاری ہے
تم ہی کہہ دو یہی آئین وفاداری ہے

ماہِ رمضان کا اختتام......کیا کھویا کیا پایا؟؟

احتساب اور جائزہ ایک کامیاب اور بامقصد زندگی کا لازمی حصہ اور وظیفہ ہے، اس کے بغیر انسان کی زندگی محض کھیل کود اور تماشہ ہے، زندگی میں مختلف مراحل اور مواقع آتے ہیں، عقل ودانائی اور دانشمندی کا تقاضہ ہے کہ انسان ان مراحل ومواقع میں اپنا احتساب کرے اور جائزہ لے کہ ''میں نے کیا پایا ہے؟'' اور ''کیا کھویا ہے'' لائق اور باکمال انسان اپنی زندگی میں جب کوئی اقدام کرتا ہے یا کسی میدان میں قدم رکھتا ہے تو اپنے اندر ''پانے'' اور ''کھونے'' کے احساس کوٹٹولتا اور جگاتا ہے، پانے اور کھونے کے اس احساس کی بنا انسان ترقی کے منازل طے کرتا ہے اور کامیابی اس کے قدم چومتی ہے، غافل اور بے پروا انسان اس احساس سے محروم رہتا ہے، وہ زندگی کو حقیقت سے زیادہ ایک افسانہ سمجھتا ہے، ''کھاؤ پیو اور موج ومستی کرو'' یہی سوچ وفکر اس کے نزدیک زندگی کا دوسرا نام ہے، اس کو نہ اپنی زندگی کے فرائض وواجبات معلوم اور نہ ہی اپنی ذمہ داریوں کا احساس وشعور، غفلت، لاابالی اور لاپرواہی کا شکار انسان دنیا وآخرت دونوں جگہ نقصان وخسارہ کا خریدار ہے۔

بعض مرتبہ ''پانے'' کے مواقع وامکانات بہت کچھ ہوتے ہیں، غفلت کا مارا انسان ''ہاتھ پر ہاتھ دھرے'' بیٹھا رہتا ہے، اور ان مواقع کو استعمال میں نہیں لاتا ہے، ان کے گذرنے اور ختم ہونے کے بعد اس کو ''کھونے'' کا احساس ہوتا ہے، پھر وہ سوائے ''ہاتھ ملنے'' کے اور کچھ نہیں کرسکتا ''اب پچھتائے کیا ہو جب چک گئیں چڑیاں کھیت'' اس لیے وقت پر کھونے کا احساس ہونا مفید اور کارآمد ہے نہ کہ وقت گذر جانے کے بعد، دوسروں کی عیب جوئی، ان پر نکتہ چینی، ان کی خرابیاں اور خامیاں تلاش کرنے، ان کے کاموں اور حرکتوں کو تنقید وتبصرہ کا نشانہ بنانا، یہ سب باتیں اس لیے ہوتی ہیں کہ انسان خود کو احتساب اور محاسبہ سے ماورا اور بلند سمجھتا ہے، قرآن مجید میں بتایا گیا کہ انسان کو خود اپنے

بارے میں پوری واقفیت ہے: بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ (سورۃ القیامۃ: ۱۴)، وہ خود اگر اپنا بے رحم احتساب کرے اور بے لاگ جائزہ لے کہ میں نے زندگی کے مختلف شعبوں اور مرحلوں میں کیا پایا اور کیا کھویا ہے، تو اس کو اپنی تمام کمزوریوں اور کوتاہیوں کا اندازہ ہوگا، پھر وہ ان کو ختم کرنے اور دور کرنے کی فکر کرے گا، دوسروں کی طرف دیکھنے اور نظر کرنے کی فرصت نہیں ہوگی۔

بقول بادشاہ بہادر شاہ ظفرؒ ؂

نہ تھی حال کی جب ہمیں خبر
رہے دیکھتے لوگوں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو جہاں میں کوئی بُرا نہ رہا

اپنا احتساب اور جائزہ ایک سچے مسلمان کے اندر آخرت کی فکر اور تیاری کو بڑھاتا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ نیکی کو پانے اور اس کے مواقع کی تلاش میں رہتا ہے، وہ اپنے کو ہمیشہ خیر و بھلائی کے کاموں میں لگا کر ثواب حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، قرآن مجید میں زور دے کر فرمایا گیا کہ ہر شخص دیکھے اور جائزہ لے کہ اس نے اگلے دن کی کیا تیاری کی ہے؟ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَالْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ (سورۃ الحشر: آیت ۱۸) دانشوری اور ہوشیاری یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنے کے بجائے اپنا جائزہ لے، اپنے کو پہچانے اور موت کے بعد والی زندگی کو بنانے اور سنوارنے کی فکر کرے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے: اَلْکَیِّسُ مَنْ دَانَ نَفْسَہٗ وَعَمِلَ لِمَا بَعْدَ الْمَوْتِ، وَالْعَاجِزُ مَنِ اتَّبَعَ نَفْسَہٗ ھَوَاھَا وَتَمَنّٰی عَلَی اللّٰہِ، (ریاض الصالحین، ص: ۴۶ باب المراقبہ) ہوشیار اور دانا وہ ہے جس نے اپنے نفس کا محاسبہ کیا اور موت کے بعد (اخروی نجات و کامیابی) کے لیے عمل کیا، اور ناداں و ناتواں وہ ہے جو اپنے کو نفسانی خواہشات کا تابع بنائے اور اللہ سے امیدیں باندھے، اس حدیث میں ان لوگوں کے لیے درس عبرت ہے جو اپنی عملی زندگی میں احکامِ خداوندی کی پامالی کرتے ہیں، آخرت کی فکر اور تیاری سے غافل ہو کر نفسانی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں، پھر اس پر طرّہ یہ کہ بے عملی اور بے فکری کے باوجود اللہ تعالیٰ سے رحم و کرم کی امید بھی رکھتے

ہیں، روک ٹوک کرنے پر کہتے ہیں، ”اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا ہے، اللہ کی رحمت وسیع ہے“ ایسے لوگ دھوکہ میں ہیں اور ان کا انجام ناکامی اور نامرادی ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ سے رحمت کی ومغفرت کی امید اس وقت صحیح اور معتبر ہے جب ساتھ میں کچھ عمل بھی ہو، بدعملی اور آخرت سے بے فکری کے ساتھ نجات ومغفرت کی امید باندھے رکھنا محض نفس کا دھوکا اور شیطان کا وسوسہ ہے، یوم آخرت اور اس دن اعمال کی جزا وسزا پر یقین رکھنے والے ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ آخرت میں حساب وکتاب کا معاملہ بھی درپیش ہوتا ہے، اس لیے اس مرحلہ کے پیش آنے سے پہلے دنیا میں اپنا محاسبہ کرلینا اور اپنی زندگی کا حساب وکتاب صاف کرلینا نیک بختی اور سعادت مندی کی علامت ہے، اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: حَاسِبُوْا قَبْلَ اَنْ تُحَاسَبُوْا ”اپنا محاسبہ کرتے رہو، اس سے پہلے کہ تمہارا حساب وکتاب لیا جائے۔“

دوسرے یہ کہ ”پانے“ اور ”کھونے“ کے احساس سے زیادہ ”پانے“ اور ”کھونے“ کا معیار زیادہ اہمیت رکھتا ہے، ہم پانا اس کو سمجھتے ہیں کہ قارون کا خزانہ ہمارے پاس ہو، کوئی ”دفینہ“ ہمارے ہاتھ لگ جائے، آرام اور راحت کے سامان اور عیش وعشرت کے اسباب پیدا ہوجائیں، اور کھونے کا مطلب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ ہم مادّی نعمتوں سے محروم ہوں، جن کے یہاں زندگی کی منزل صرف دنیا ہے اور دنیا بنانا اور کمانا ہی ان کا مقصد ہو تو ان کے نزدیک پانے کا یہی معیار اور کسوٹی ہے، لیکن جن کے پاس آخرت کا عقیدہ ونظریہ ہے اور وہ دنیا کو ایک اسٹیشن اور مسافرخانہ سے زیادہ کوئی مقام نہیں دیتے، ان کے نزدیک نیکی اور تقویٰ کے کاموں کی توفیق اور ان کے مواقع ہی ”پانے“ کا معیار ہے، حدیث میں دنیا کو آخرت کی کھیتی فرمایا گیا کہ اَلدُّنْیَا مَزْرَعَةُ الْاٰخِرَةِ اس کھیتی میں اخلاص کی ”کھاد“ ڈال کر نیکی اور تقویٰ کے ”بیج“ بوکر آخرت میں نجات وکامیابی کی سرسبز وشاداب لہلہاتی ”فصل“ حاصل کرنا ان کی زندگی کا مقصد ومشن ہوتا ہے۔

صحابہ کرامؓ کے نزدیک پانے کا یہی وہ معیار تھا جس کی بنا پر وہ نیکی اور تقوی کے کاموں میں سبقت کرتے، اللہ کے رسول ﷺ نے غزوۂ تبوک کے موقع پر تعاون کی اپیل فرمائی، حضرت عمرؓ اپنے گھر کے سازوسامان میں سے پورا نصف آپ ﷺ کی خدمت میں پیش کردیا، اور یہ خیال فرما رہے

تھے کہ آج کے دن میں ابوبکرؓ صدیق سے آگے بڑھ جاؤں گا، لیکن جب معلوم ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے گھر کا سارا ساز وسامان پیش کر چکے ہیں اور گھر میں صرف اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام چھوڑ آئے ہیں تو حضرت عمرؓ نے کہا میں کبھی ابوبکرؓ سے آگے نہیں بڑھ سکتا، خدا کی قسم ہجرت کے موقع پر غارِ ثور میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابوبکرؓ کی ایک ساعت کی رفاقت عمرؓ کی پوری زندگی سے بڑھ کر ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں صحابہؓ میں سے فقراءِ مہاجرین حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ مالدار لوگ بلند درجات پانے اور ہمیشہ کی جنت حاصل کرنے میں ہم سے سبقت لے گئے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ کیسے؟ فقراءِ مہاجرین نے کہا کہ جیسے ہم نماز پڑھتے ہیں وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، جیسے ہم روزہ رکھتے ہیں وہ بھی روزہ رکھتے ہیں، لیکن وہ صدقہ وخیرات کرتے ہیں ہم صدقہ وخیرات نہیں کر سکتے، وہ غلام آزاد کرتے ہیں ہم غلام آزاد نہیں کر سکتے، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں تمہیں ایسی چیز نہ بتلاؤں جس کے کرنے سے تم اپنے سے سبقت کرنے والوں کو پالو گے اور جو مالدار تمہارے بعد آئیں گے تم ان سے بھی سبقت کر جاؤ گے اور کوئی شخص تم سے آگے نہیں بڑھ پائے گا، مگر یہ کہ وہ بھی وہی کرنے لگے جو تم کرتے ہو؟ فقراءِ مہاجرین نے عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ ضرور بتلایئے! آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم ہر نماز کے بعد ۳۳، ۳۳ مرتبہ **سبحان اللہ اللہ اکبر اور الحمد للہ** پڑھ لیا کرو، کچھ دنوں تک فقراءِ مہاجرین یہ عمل کرتے رہے، پھر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کرنے لگے کہ یارسول اللہ! ہمارے مالدار بھائیوں کو ہمارے عمل کی اطلاع ہوگئی اور وہ بھی ہمارا عمل کرنے لگے، آپ ﷺ نے فرمایا: **ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَاءُ** (ریاض الصالحین، ص: ۲۵۵ باب فضل الغنی الشاکر) مطلب یہ کہ اللہ کا فضل ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے نیکی وخیر کے کاموں کے زیادہ مواقع عطا کرتا ہے۔

اسی طرح صحابہ کرامؓ کے یہاں ’’کھونے‘‘ کا معیار یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ سے تعلق وتقویٰ اور خوف وخشیت کے معاملہ میں فرق آجائے، عالمِ آخرت اور اُس سے متعلق امور کے استحضار میں کمی آجائے، اس سلسلہ میں حضرت حنظلہؓ کی مشہور روایت ہے، فرماتے ہیں ایک دن ابوبکر مجھ سے ملے، اور پوچھا حنظلہ کیا حال ہے؟ میں نے کہا کہ حنظلہ منافق ہوگیا، انہوں نے فرمایا سبحان اللہ! یہ تم کیا کہہ رہے

ہو، میں نے کہا بات یہ ہے کہ ہم جب رسول اللہ ﷺ کے پاس ہوتے ہیں اور آپ ﷺ دوزخ اور جنت کا بیان کر کے ہم کو نصیحت فرماتے ہیں تو (خوف وخشیت کی وجہ سے) ہمارا یہ حال ہو جاتا ہے کہ گویا ہم دوزخ اور جنت کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، پھر جب ہم آپ ﷺ کی مجلس سے نکل کر آتے ہیں تو بیوی اور بچے زمین اور کھیتی باڑی کے کام ہم کو اپنی طرف متوجہ اور مشغول کر لیتے ہیں، اور پھر ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں، یہ سن کر حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اس طرح کی حالت تو ہم کو بھی پیش آتی ہے، پھر یہ دونوں حضرات رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے اور آپ ﷺ کے سامنے اپنی اس حالت کو پیش کیا، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تمہارا حال ہمیشہ وہ رہے جو میرے پاس رہنے سے ہوتا ہے اور تم ہمیشہ ذکر میں مشغول رہو، تو فرشتے تمہارے بستروں پر اور تمہارے راستوں میں تم سے مصافحہ کیا کریں، لیکن اے حنظلہ! اللہ نے اس کا مکلف نہیں بنایا ہے، بس اتنا کافی ہے کہ انسانی ضرورتوں اور بشری تقاضوں کی بنا پر وقتاً فوقتاً یہ ہوتا رہے۔ (ریاض الصالحین ص: ۸۳ باب فی الاقتصاد فی الطاعۃ)

غرض یہ کہ "پانے اور کھونے" کا یہ احساس اور معیار ہے، اس کے مطابق صحابہ کرامؓ کی پاکیزہ زندگیاں ہیں، یہ ہمارے لیے "مشعلِ راہ" "مینارۂ نور" اور "نشانِ منزل" ہیں، ان پاک و برگزیدہ زندگیوں کو سامنے رکھ کر ہم جائزہ لیں کہ ہمارے نزدیک پانے اور کھونے کا معیار کیا ہے؟ اور اس معیار کے مطابق پانے اور کھونے کا احساس ہم میں کتنا اور کہاں تک ہے؟؟

رحمتوں، برکتوں اور سعادتوں کا مبارک مہینہ ہم پر سایہ فگن ہے، کچھ دنوں بعد نیکیوں کا یہ موسمِ بہار ختم ہو جائے گا، قبل اس کے کہ رمضان کا مبارک مہینہ رخصت ہو جائے ہم اپنے اندر "پانے اور کھونے" کے احساس کو جگائیں اور ٹٹولیں کہ اس ماہ میں کتنی نیکیاں ہمارے حصہ میں آئیں گی؟ نیکی اور تقویٰ کے کتنے کام ہم سے ہو سکیں گے؟ مادّی نعمتیں ہی اگر "پانے" کا معیار ہے تو ہم نے عام دنوں کی بہ نسبت اس ماہ میں بہت کچھ پایا، اصلی گھی، مغزیات اور مقویات سے بھرپور ہمہ اقسام کی حلیم ہم نے کھائی، افطار کے موقع سے پھل پھلاری اور فروٹ ہمارے پیٹ کا حصے بنے، لیکن سوچنے کی ضرورت ہے کہ کھانے کی لذتوں کی فکر اور تلاش میں کہیں ہم نے عبادت و بندگی کا لطف و مزہ تو نہیں

کھو دیا؟؟اس ماہ میں خریداری کا شوق جنون کی حد تک ہوتا ہے،ایک ایک فرد کے ایک ایک ایٹم کی خریداری کے لیے پورا ایک مہینہ لگ جاتا ہے،''میاچنگ'' کی دیوانگی شہر کے تمام بازاروں کی سیر کراتی ہے،ہم خوش ہیں اور نازاں ہیں کہ ہم نے خوب جم کر خریداری کی،نت نئے ڈیزائن اور جاذب نظر ملبوسات ہماری زیب وزینت کا ذریعہ بنی،لیکن ...... یہ بھی تو دیکھئے!نرم وملائم نفیس ونازک کپڑوں اور سوٹ بوٹ کی خریداری میں کیا ہم نے''لباس التقویٰ'' (تقویٰ کا لباس) بھی پایا ہے؟؟ تاجر حضرات اس پر شاداں اور فرحاں ہے کہ انہوں نے زیادہ وقت اور توجہ دے کر اپنے کاروبار کو خوب بڑھایا اور پھیلایا،عام مہینوں کی بہ نسبت اس ماہ میں آمدنی اور فائدہ زیادہ رہا،لیکن ......غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اگر کاروبار کی وجہ سے انہیں نیکی اور تقویٰ کے کاموں کی فرصت نہیں ملی یا اس کی توفیق نہیں ہوئی تو یہ نفع،نفع ہے یا یہ کہ زبردست گھاٹا اور خسارہ بلکہ اپنی رہی سہی اور بچی کچھی نیکیوں کا بدترین دیوالیہ ہے؟؟؟

پس دنیاوی اور مادّی نعمتوں سے پرے ہو کر اپنا جائزہ لینے اور محاسبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید کے کتنے دور ہم سے ختم ہوئے؟نوافل اور تہجد کا اہتمام ہے کہ نہیں؟افطار کے موقع پر رب کی بارگاہ میں دعا،ومناجات ہوتی ہیں یا نہیں؟اس کا بھی احتساب ہونا چاہیے کہ پہلے عشرے میں کونسے اعمال ہم نے کیے کہ اللہ کی رحمت ومہربانی ہم پر ہو سکے؟دوسرے عشرہ میں ہم سے کتنے کام ایسے ہوئے کہ ہم خود کو مغفرت وبخشش کا مستحق ٹھرا سکیں؟کیوں کہ اس شخص کے لیے زبردست وعید ہے کہ رمضان کا مہینہ پائے اور اپنی مغفرت کا سامان نہیں کر سکے۔

رمضان کا آخری عشرہ جہنم سے آزادی کا ہوتا ہے،باتوفیق مسلمان جہنم سے آزادی پانے کے لیے''اعتکاف'' کے عنوان سے خود کو اللہ کے گھر (مسجد) میں قید کر لیتے ہیں،خوف وامید کے ملے جلے احساس کے ساتھ اپنے پروردگار اور پالنہار کی چوکھٹ تھام لیتے ہیں کہ''اب ہم تیری رضاء وخوشنودی اور اپنی نجات کا پروانہ لے کر ہی لوٹیں گے'' لیکن معاشرہ کی عمومی صورتحال یہ ہے کہ اس عشرہ میں مسلمان مساجد میں قید ہونے کے بجائے مساجد سے آزاد ہو جاتے ہیں اور نمازیوں کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے،پھر جب چاندرات ہوتی ہے تو خرید وفروخت اپنے پورے عروج اور شباب پر ہوتی

ہے،حدیث میں اس رات کو" لیلة الجائزہ " انعام کی رات فرمایا گیا، یہاں تو معاملہ ہی بالکل الٹا ہے،اس شب میں جائزہ (انعام) پانے کے بجائے عید کی تیاری وخریداری کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ کپڑے سل کراستری ہوئے کہ نہیں ،سویاں اورخشک میوہ جات آگئے کہ نہیں ،دودھ وغیرہ کا انتظام ہوا کہ نہیں ،اللہ رے! خداتعالیٰ کی عنایات اورانعامات کی یہ ناقدری ،فالی اللہ المشتکی، خداکرے کہ رمضان کے ان آخری دنوں میں اس کے برکات کو"پانے" کا کچھ جذبہ واحساس ہمارے اندر پیدا ہواور جو کچھ ہم نے "کھویا" ہےاس کی تلافی ہوسکے۔

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

..................روزنامہ منصف:۲۵/ستمبر ۲۰۰۸ء..................

نماز	و	روزہ	و	قربانی	و	حج

نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں

....

پیامِ عشق و مسرت ہمیں سناتا ہے
ہلالِ عید ہماری ہنسی اُڑاتا ہے

شرعی سزائیں ـــــــ منصفانہ نہ کہ ظالمانہ

دشمنانِ اسلام اور حاسدینِ شریعتِ محمدی کہتے ہیں کہ اسلام میں زنا، قتل، چوری، تہمت وغیرہ جرائم کی سزائیں نہایت ظالمانہ اور وحشیانہ ہیں، اس میں مجرموں کی اصلاح کا موقع نہیں رہتا، سزائیں ایسی ہونی چاہئیں جن میں مجرم کو اصلاح کا موقع ملے اور سزائیں وحشیانہ وظالمانہ نہ ہوں۔

اس سلسلہ میں ۲/ باتیں قابلِ توجہ ہیں: اوّل یہ کہ اسلام کی یہ سزائیں اللہ تعالیٰ کی جانب سے متعین کردہ ہیں اور باری تعالیٰ کی ذات علیم، خبیر اور حکیم ہے، وَفِعْلُ الْحَكِيمِ لَا يَخْلُوْ عَنْ حِكْمَتِهٖ چنانچہ وہ اسلامی سزاؤں کی حکمت ومصلحت کو ہم سے زیادہ جانتا ہے، اور حکیمانہ قدرت ہونے کی بناء پر یہ بھی خبر رکھتا ہے کہ یہ سزائیں جرائم کی روک تھام کے لیے کارآمد ہوسکتی ہیں یا نہیں؟ اگر انسان کی کوتاہ عقل میں یہ سزائیں "ظالمانہ اور وحشیانہ" ہوں تو یہ اس کا اپنا قصور ہے نہ کہ ان حدود اور سزاؤں کا، انسان کی فطرت یہ ہے کہ وہ اپنے مقصود میں رکاوٹ بننے والی چیز کو غیر ضروری اور ناجائز قرار دیتا ہے، اگر شفیق ومہربان باپ اپنے فرزند کی اصلاح وتربیت کے لیے اس کو ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے اور اس کو تنبیہ کرتا ہے، اس پر بیٹا اپنے باپ کو سنگدل اور سخت دل سمجھتا ہے تو اس میں یقینا بیٹے کی کم علمی وکم فہمی اور کم عقلی کا قصور ہے، پھر چونکہ اسلام کے شرعی سزاؤں کا اصل سرچشمہ قانونِ الٰہی ہے، انسانی قانون اور الٰہی قانون میں بنیادی فرق یہ ہے کہ انسانی قانون میں غلطی اور خطا کا امکان ہوتا ہے اور وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی وترمیم کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، جب کہ قانونِ الٰہی میں نہ غلطی اور خطا کا کوئی امکان باقی رہتا ہے اور نہ اس میں ترمیم وتنسیخ اور تبدیلی ہوتی ہے، اس لیے اسلام کے شرعی حدود وقوانین میں ردّ وبدل اور حذف واضافہ کی ضرورت وگنجائش کا جواز ہی نہیں رہتا۔

دوسرے یہ کہ اسلام میں جرائم کی سزاؤں کی بنیاد ۵/ چیزوں کی حفاظت وسلامتی پر ہے: (۱) حفظِ جان (۲) حفظِ مال (۳) حفظِ عقل (۴) حفظِ نسل اور (۵) حفظِ دین، حفظِ جان کے لیے قصاص کو مشروع کیا گیا، مال کی حفاظت کے لیے چوری کی سزا مقرر کی گئی، حفظِ عقل کے لیے شراب

پینے کی سزا متعین کی گئی، حفظِ نسل کے لیے زنا کی سزا مشروع کی گئی اور دین کی حفاظت کے لیے مرتد کی سزا رکھی گئی، ان سزاؤں کا کھلے عام نفاذ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ معاشرہ میں عمومی بگاڑ نہ ہو اور سماج میں لوگ جرائم کے ارتکاب پر جری اور بے باک نہ ہو جائیں، سزاؤں کے اس کھلے عام نفاذ کے طریقۂ کار میں مجرمین کی اصلاح ہے، اس طرح پر کہ وہ دوبارہ جرائم کے ارتکاب پر سوچنے پر مجبور ہوتا ہے اور دوسرے لوگ بھی کھلے عام سزا کے نفاذ کو دیکھ جرائم کرنے کی ہمت و جرأت نہیں کر سکتے، اس کے برخلاف بڑے جرائم کا ارتکاب کرنے والوں کو اصلاح کا موقع دینے کے لیے اگر جیل بھیج دیا جائے تو اس میں درجہ ذیل خرابیاں پیدا ہوں گی:

۱) جیل میں انسان کا طویل عرصہ قیام اس کو پیشہ ور مجرم بنا دیتا ہے۔

۲) کسی بھی حال میں مجرم کو جیل کے قواعد و ضوابط کی پابندی نہ کرنے پر جسمانی سزا کا شکار ہونا پڑتا ہے۔

۳) جیسے "خربوزہ کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے" ایسے ہی مجرم جیل میں غنڈہ گرد عناصر کی صحبت میں رہ کر جرائم کا اور زیادہ شوقین ہو جاتا ہے۔

۴) اس میں انسان کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اور بعض مرتبہ نفسیاتی طور پر اس کی صلاحیتیں معطل ہو کر رہ جاتی ہیں، اس کے عزائم و حوصلے بجھ سے جاتے ہیں۔

ان خرابیوں کی وجہ سے جیل میں مجرم کی اصلاح کے بجائے اُس کے بگڑنے کے امکانات اور بڑھ جاتے ہیں، ہمارے معاشرہ میں یہ آئے دن کا مشاہدہ نہیں بلکہ شب و روز کا تجربہ ہے کہ جو جتنا زیادہ جیل کی ہوا کھا کر آئے وہ اتنا ہی زیادہ طاقتور مجرم اور غنڈہ کہلاتا ہے، جرائم اور غنڈہ گردی کی دنیا میں اُس کی عزت اور قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے، پس شرعی حدود و قوانین کے نفاذ ہی میں انسانی سماج کی حفاظت اور اُس کی بقاء ہے، پُرامن اور مہذب معاشرہ کی حفاظت ہے، اسی سے صالح، پاکیزہ اور جرائم سے پاک سماج تشکیل پاتا ہے۔

شریعت میں

تبدیلی کی وکالت، دانشورانہ حماقت

۲۲؍جون ۲۰۰۲ء کو روز نامہ ''منصف'' کے ادارتی صفحہ پر سابق وزیر محترم جناب بشیر الدین بابوخاں صاحب کا ایک مضمون بعنوان ''مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت میں'' پڑھنے کا اتفاق ہوا، مضمون کے پڑھنے کے بعد اپنی حد تک میں جو سمجھا وہ یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار ذاتی طور پر اس بات کے داعی اور خواہش مند ہیں کہ شریعت کے بعض اصولوں میں ''نرمی اور لچک'' پیدا کی جائے، بالفاظِ دیگر وہ اس بات کے حامی ہیں کہ شریعت پر عمل آوری مسلم کمیونٹی کے لیے ان کے دنیاوی امور میں ترقی کے لیے رکاوٹ ہے، یہ نتیجہ ایسا نہیں ہے کہ اس کو غلط فہمی پر محمول کیا جاسکے یا عبارت کی کاٹ چھانٹ کا اس پر الزام لگایا جاسکے، بلکہ یہ بات مضمون میں واضح اور عیاں ہے۔

فاضل مضمون نگار نے جتنی ہمدردی اور خلوصِ نیت کے ساتھ مسلم پرسنل لا بورڈ کی خدمت میں اپنے تجاویز ومشورے پیش کیے ہیں اتنی ہی ہمدردی وخلوصِ نیت بلکہ اس سے زیادہ خیر خواہی و نیک نیتی کے ساتھ چند گذارشات محترم بابوخان صاحب کی خدمت میں پیش کی جاتی ہیں:

(۱) **پیش کردہ تجاویز کی نوعیت وحیثیت:** کوئی بھی تجویز گو اپنے نقطۂ نظر سے کتنی ہی اہم اور ضروری کیوں نہ ہو سب سے پہلے یہ دیکھا جاتا ہے کہ جن شرعی احکام کے تعلق سے تجویز پیش کی جارہی ہے، ان احکام کی نوعیت وحیثیت کیا ہے؟ جنہیں اس پر غور وفکر کی دعوت دی جارہی ہے، اس تجویز پر غور کرنا آیا ان کے دائرہ کار اور دائرہ اختیار میں ہے بھی یا نہیں؟ ایسا لگتا ہے کہ مسلمانوں کے تعلق سے ''شدید بے چینی وفکر مندی'' کی حالت میں پیش کی جانے والی ان تجاویز میں اس طرح کا عمل نہیں ہوا یا اس کو ضروری نہیں

سمجھا گیا،پیش کردہ تجاویز میں سوائے ایک دو کے بقیہ تمام شرعی احکام کی نوعیت ”منصوص علیہ“ حکم کی ہے ،یعنی ایسا شرعی حکم جس کی وضاحت اور بیان کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کی تفصیلات بالکل روشن اور صاف ہیں،اس شک وشبہ کی ادنیٰ گنجائش نہیں ہے،اس طرح کی حیثیت ونوعیت کے حامل شرعی احکام کے بارے میں فقہاء اور علومِ اسلامی کے ماہرین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ یہ احکامات اپنے اصل کے اعتبار سے قطعی اور نا قابل تبدیل وترمیم ہیں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں محض عزت ووقار کے خاطر لوگ مہر کی رقم بہت زیادہ دینے لگے،اس بنا پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ چاہا کہ ایک محدود ومتعین رقم کا لوگوں کو پابند بنا دیا جائے،مگر چوں کہ یہ پابندی قرآن مجید کے حکم کے خلاف تھی،اس لیے ایک صحابیہؓ کے توجہ دلانے پر کہ ”قرآن مجید نے تو عورتوں کے دیے گئے مال کو قِنطَارًا (مالِ کثیر) کہا ہے،آپ اس کو کم اور محدود کیسے کر سکتے ہیں؟“ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ارادے سے رجوع کرتے ہوئے یہ جملہ ارشاد فرمایا کہ: ”ایک مرد غلطی کر گیا اور ایک عورت صحیح نتیجہ پر پہنچ گئی۔“

اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے زمانۂ خلافت میں ایک پاگل عورت کو اسلامی شریعت کے مطابق سنگسار کرنے کا حکم دیا، حضرت علی رضی اللہ عنہ کو جب اس فیصلہ کی اطلاع ہوئی تو آپ عورت کو سنگساری کے مقام سے واپس لائے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنایا: ”تین لوگوں سے قلم اٹھالیا گیا،ایک بچہ سے جب تک وہ بالغ نہ ہوجائے،دوسرے سونے والے سے جب تک وہ بیدار نہ ہو،تیسرے پاگل سے جب تک وہ ٹھیک نہ ہوجائے۔قلم اٹھائے جانے کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں سے غلطیوں وجرائم کے صدور پر مواخذہ نہیں ہوگا،اس حدیث کے معلوم ہونے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنا فیصلہ واپس لے لیا اور اس عورت کو چھوڑ دیا گیا،یہ دو مثالیں ہیں جن میں پہلے واقعہ میں قرآن کی آیت کی وجہ سے اور دوسرے واقعہ میں حدیث کی وجہ سے فیصلہ اور رائے کو واپس لے لیا گیا۔

البتہ جو احکام قیاس،اجتہاد اور اجماعِ امت سے ثابت ہوتے ہیں ان میں تبدیلی وترمیم کی گنجائش رہتی ہے اور اس بارے میں غور وفکر کرنا علماءِ ربانیین کا کام ہے،اس سلسلہ میں مزید وضاحت اور تفصیل کہنہ مشق فقیہ،ممتاز صاحب قلم اور مایۂ ناز عالمِ دین مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جو روزنامہ ”منصف“ کے مذہبی سپلیمنٹ ”مینارۂ نور“ کے مستقل کالم نگار بھی ہیں،کے مضمون ”مسلم پرسنل لا کی شرعی

وفقہی حیثیت“ (شائع شدہ ۱۴؍جون ۲۰۰۲ء) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

(۲) سودی لین دین: تجاویز کے پیش کرتے وقت ان کے حسن وقبح کو بھی مدِ نظر رکھا جاتا ہے، نیز ان تجاویز پر عمل آوری کے کیا اثرات وثمرات ظاہر ہوں گے، ان کا بھی جائزہ لیا جاتا ہے، مگر افسوس کہ فاضل مضمون نگار کی جانب سے پیش کردہ تجاویز میں یہ چیز ملحوظ نہیں رکھی گئی، مثلاً: سود، اس کے حرام ہونے کے سلسلہ میں قرآن وحدیث کی تفصیلات بالکل واضح اور دوٹوک ہیں، اس کے لین دین کے بارے میں جو سخت سے سخت وعیدیں آئی ہیں، شاید ہی وہ کسی مسلمان سے پوشیدہ ہوں، اس کی مذمت اور برائی جس سخت اور پرزور انداز میں بیان کی گئی شاید ہی شریعت کی حرام کردہ کسی اور چیز کی بیان کی گئی ہو، کوشش تو یہ ہونی تھی کہ مسلم ماہرینِ معیشت اور اسلامی علوم پر کامل وصالح دسترس رکھنے والے اصحاب باہم جمع ہوتے اور اسلامی مالیاتی نظام کو قائم کرنے کی جدوجہد کی جاتی، ایسا تو ہوا نہیں، الٹا سودی لعنت کو شریعت کا جامہ پہنا کر اس کے جواز پر غور کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔

(۳) خاندانی منصوبہ بندی: اس سلسلہ میں جس خرابی اور برائی کی نشاندہی کی گئی اس کے تدارک اور روک تھام کے لیے صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ کا نظام موجود ہے، اب اس میں قصور صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ دینے اور لینے والوں کا ہے، ان کے اندر احساسِ ذمہ داری نہ ہونے کی بنا پر اس نظام کا خاطر خواہ فائدہ اور نفع اس کے حقیقی مستحقین کو نہیں ہو پارہا ہے، ورنہ کیا بات تھی کہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ میں اس نظام کے صحت منداور منصفانہ نفاذ کی وجہ سے اس نظام کی افادیت اتنی زیادہ تھی کہ لوگ اپنی زکوٰۃ صدقہ وخیرات لے کر نکلتے، مگر کوئی زکوٰۃ حاصل کرنے والا نہیں ملتا اور اگر کچھ غرباء ومساکین مل بھی جاتے تو وہ یوں کہنے لگتے: ”اگر آپ پہلے آتے تو میں آپ کی زکوٰۃ لے لیتا، اب تو فلاں شخص سے میری ضرورت پوری ہو چکی، لہٰذا میں نہیں لے سکتا۔“

(۴) اعضاء کی پیوندکاری: ”حفظِ نفس“ یعنی جان کی حفاظت اور اس کی بقاء شریعت کا ایک بنیادی مقصد ہے اور جان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی امانت ہے، انسان اپنی مرضی ومنشاء کے مطابق اس میں حقِ تصرف نہیں رکھتا، البتہ بعض سنگین ناگزیر وجوہات کی بنا پر شرعی مقاصد کی تکمیل میں ہی علماءِ کرام کے لیے اس کی اجازت دینے کی گنجائش ہوسکتی ہے، لیکن یہ اجازت وقتی اور عبوری طور پر رخصت

ہوگی، ملک میں اس کے لیے رائج قانون کی طرح اس رخصت کی قانونی وآئینی حیثیت نہیں ہوگی۔

(۵) **جانوروں کی قربانی:** ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فریضہ کو عبادت و بندگی کی ایک ظاہری رسم سمجھا گیا، عیدالاضحیٰ کے موقع سے جانوروں کا ذبح کرنا یہ صرف گوشت اور خون کی قربانی نہیں ہے، یہ دراصل خالقِ کائنات کی رضا وخوشنودی کی راہ میں مرمٹنے کی دلی خواہشوں ،تمناؤں ، آرزوؤں اور امیدوں کا ایک ظاہری عکس ہے، یہ قربانی وہ عظیم الشان خراجِ عقیدت ہے جو ہر سال بطورِ یادگار حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے جذبۂ تسلیم ورضا اور ایثار ووفا کو پیش کیا جاتا ہے، اس موقع پر غربت وافلاس کا مرثیہ پڑھنا ایسا ہی ہے کہ جیسے ۱۵/اگست ہندوستان کے یومِ آزادی کے موقع پر کہا جائے کہ قوم میں لاکھوں افراد ایسے ہیں جنہیں پہننے کے لیے دوگز کپڑا نصیب نہیں ہے، بجائے اس کے کہ ترنگا لہرانے میں گزوں کپڑا ضائع وبرباد کیا جائے ، یہی کپڑا لباس سے محروم لوگوں کو دے دیا جائے تاکہ وہ اپنی ستر پوشی کرسکیں ،کیا کوئی عقل مند،محبِ وطن اس رائے کو قبول کرسکتا ہے؟؟ کیا یہ مشورہ اس قابل ہوسکتا ہے کہ اس کو شہیدانِ وطن کے لیے خراجِ عقیدت قرار دیا جائے؟؟ صحیح بات یہ ہے کہ غریبوں کی مدد ونصرت اور فریضۂ قربانی دو الگ عمل ہیں اور کسی عمل کی اہمیت اور افادیت تب ہی معلوم ہوتی ہے جب اس عمل کو اس کے پسِ منظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

(۶) **حج کی ادائیگی:** فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے قرآن مجید میں استطاعت (طاقت وقدرت) کو بنیاد بنایا گیا اور استطاعت کی تفسیر وتشریح حدیث میں ”زادوراحلہ“ سے کی گئی،یعنی جو شخص بآسانی سفرِ حج کے اخراجات برداشت کرسکتا ہو اور اپنے اہل وعیال کو گھریلو ضروریات پوری کرنے کے لیے حج سے واپسی تک کا خرچہ دے دیا ہو، ایسے آدمی کے لیے حج کی ادائیگی فرض ہے، دیگر حقوق سے فراغت اور فرصت اس کے لیے ضروری نہیں ہے،آج کے اس مصروف ترین اور ہنگامہ خیز دور میں آدمی اپنے تمام حقوق بشمول ”والدانہ حقوق“ سے فارغ ہونے کے انتظار میں اپنی زندگی سے ”فارغ“ ہوجاتا ہے، ارشادِ نبوی ﷺ ہے کہ: ”اگر کوئی شخص حج کرنے کی طاقت وقدرت رکھنے کے باوجود حج کئے بغیر مرجائے تو اللہ تعالیٰ کو ایسے شخص کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ یہودی ہوکر مرے یا نصرانی ہوکر،اس لیے سب سے بہتر اور آسان صورت یہ ہے کہ پہلی فرصت میں فریضۂ حج کی ادائیگی سے فارغ ہوجائیں ،کیا بعید ہے کہ باری تعالیٰ ادائیگی حج کی برکت سے دوسری ذمہ داریوں سے جلد

ازجلد سبکدوش فرمادیں۔

جہاں تک یہ بات کہ ”کافی خرچ برداشت کرکے حج کرنا مناسب بھی نہیں“ یہ دراصل عبادت وبندگی کے بجالانے کے سلسلہ میں اپنے اپنے ظرف اور ذوق وشوق کی بات ہے، جو لوگ فریضۂ عبادت کو مادّی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں ان سے اس کے علاوہ اور کیا توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ یہ کہیں کہ: ”حج میں کافی خرچہ ہوتا ہے، اس میں مال کا ضیاع اور نقصان ہے“، صرف حج ہی کیا، بہت سے ”مسلمان“ اب بھی ہیں جو یہ ”رائے“ رکھتے ہیں کہ دن میں بار بار نماز کے لیے مسجد جانا، اس میں اپنی دوکان اور کاروبار کا نقصان ہے، اس لیے نمازوں کی چھٹی کردی جائے حج کی ادائیگی کے بعد مسلمانوں کی جن بدعملیوں کی نشاندہی کی گئی وہ صرف تصویر کا ایک رخ ہے، تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ اس فریضہ کے ادا کرنے کے بعد بہت سے مسلمانوں کی زندگیاں بدل گئیں، ان کی خواہشات وتمناؤں کا مرکز تبدیل ہوا، زندگی گزارنے اور بسر کرنے ان کی جدوجہد اور کوششوں کی سمت الگ ہوئی، غرض یہ کہ وہ پاکیزہ اور صالح انقلاب کے حامل بن گئے۔

(۷) **تلاوتِ قرآن مجید:** تلاوتِ قرآن اور تدبرِ قرآن دو الگ امور ہیں، ان میں سے کسی ایک کی اہمیت پر زور دے کر دوسرے کی اہمیت اور افادیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا ہے، اس لیے کہ کتنے ہی مسلمان اور غیر مسلم ہیں، باوجود یہ کہ انہیں قرآنی الفاظ کا ترجمہ ومفہوم نہیں معلوم، لیکن وہ صرف قرآن کی تلاوت سنتے ہیں، ان پر عجیب رقت اور رجوع الی اللہ کی کیفیت طاری ہوتی ہے، اس اثر وتاثیر کی وجہ عربی زبان کا خاص لب ولہجہ اور قرآن کریم کا لفظی اعجاز ہے، پھر چوں کہ ہر زبان کی اپنی نزاکت اور باریکی ہوتی ہے، مفہوم ومعانی کے بیان اور الفاظ کے زیر وبم کے سمجھنے میں اس کی اہمیت اور ضرورت دوچند ہوتی ہے، پس قرآن مجید کو سمجھ کر پڑھنے کی زیادہ بہتر اور مناسب صورت یہ ہے کہ قرآن کریم جس زبان میں نازل ہوا ہے اس کو سیکھا جائے، قرآن حکیم میں ”تدبر اور غور وفکر“ کے سلسلہ میں بعض مسلمانوں کا کہنا ہے کہ صرف تلاوتِ قرآن سے کیا فائدہ؟ اصل تو سمجھ کر پڑھنا ہے، پھر اقبال مرحوم کا یہ مصرع پڑھ کر پھولے نہیں سماتے کہ ’طوطا مینا کی طرح رٹایا جاتا ہوں‘ یہ وہ لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھ کر پڑھنے کے انتظار میں قرآن مجید کی تلاوت سے اکثر محروم رہتے ہیں۔

(۸) **مدرسوں کی تعلیم:** اس سلسلہ میں نصاب کی تبدیلی اور اصلاح کی تجویز لائقِ ستائش ہے،

مگر جس بنیاد پر یہ تجویز رکھی گئی ہے، اس کی رو سے یہ تجویز یقینی طور پر نا قابل قبول ہے، اس لیے کہ مدرسہ کی تعلیم میں بانیانِ مدرسہ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کے ذریعہ عوام میں اسلامی تعلیمات اور دینی رجحانات عام کیے جائیں، مدارس کے نظام میں زوال وانحطاط کے باوجود بحمد اللہ کسی نہ کسی درجہ میں اس طرح کی کوششیں موجود ہیں، جن کی وجہ سے حکومتِ وقت اور فرقہ پرست طاقتوں کے آنکھوں میں یہ مدارس کانٹا بن کر چبھنے لگے ہیں، مدارس کے طلباء کی روزی کے لیے آخر اتنی پریشانی اور فکر کیوں؟ یہ تو اپنا روکھا سوکھا کھا کر قناعت کی زندگی بسر کر لیتے ہیں، روزگار کی فکر تو ان عصری تعلیم یافتہ اونچی ڈگریوں کے حامل ہزاروں نوجوانوں کے بارے میں ہونی چاہیے جو اپنی تعلیم پر کثیر سرمایہ اور دولت خرچ کرنے کے باوجود روزگار اور ملازمت سے محروم ہیں۔

آخری گذارش: ان تجاویز کے بارے میں یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اسلام کی روشن تعلیمات اور اس کے اٹل قوانین میں تبدیلی وترمیم کی آواز اٹھائی جائے یا ان میں موم سی لچک پیدا کی جائے شدید اور سخت ضرورت اس کی ہے کہ شریعت کے متعلق مسلمانوں کے رویہ اور برتاؤ میں تبدیلی لائی جائے، آج دیدہ ودانستہ قانونِ شریعت پر جو انگلیاں اٹھائی جارہی ہیں یہ دراصل مسلمانوں کے غلط کردار وعمل کی وجہ سے ہے، پس تبدیلی واصلاح کی ضرورت مسلم معاشرہ میں ہے نہ کہ اسلامی شریعت میں، شاعر اسلام علامہ اقبالؒ بجا طور پر کہتے ہیں کہ ''خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں'' آج ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اسلامی نظریات وافکار کو پوری ثابت قدمی اور خود اعتمادی سے اپنائے رہے، اگر کوئی شخص اسلام کے فلسفۂ قربانی پر اہنسا اور عدمِ تشدد کا سبق پڑھانے لگے، بجائے اس کے کہ ہم قربانی کے مسئلہ پر ''وکیلِ صفائی'' بنیں، ہمارے اندر اتنی جرأت اور ہمت ہونی چاہیے کہ ہم اس شخص کا گریبان پکڑ کر یہ پوچھیں کہ کیا تم ہمیں شیر خواروں اور بے گناہ انسانوں کو کالی دیوی پر بلی چڑھانے والا عدمِ تشدد کا درس دیتے ہو؟ اسی طرح فریضۂ حج کی ادائیگی کو فضول خرچی کہنے والوں کے مقابلہ میں بجائے اس کے کہ ہم ''وزیر دفاع'' بنیں ہمارے اندر اتنی دلیری اور بہادری ہونی چاہیے کہ ہم یہ پوچھ سکیں کہ دیوالی اور کرسمس وغیرہ تہواروں پر خرچ کی جانے والی دولت میانہ روی اور اعتدال کی کونسی قسم ہے؟ خدا کرے ہمارے اندر اس طرح کی پختگی اور خود اعتمادی پیدا ہو جائے۔

روزنامہ منصف: ۱۲؍جولائی ۲۰۰۲ء

اسلامی قوانین مسلمانوں کے لئے
معراجِ ترقی یا معیارِ پسماندگی؟؟

گذشتہ چند دنوں پہلے آندھرا پردیش ہائی کورٹ نے مسلم تحفظات بل کو کالعدم قرار دیا ہے، ہائی کورٹ کے اس فیصلے میں مختلف ججوں نے اپنی الگ الگ رائے اور نقطہ ہائے نظر پیش کیے ہیں، اس سلسلے میں کارگذار چیف جسٹس محترم جناب بلال نازکی صاحب کی رائے بھی سامنے آئی ہے، جس میں انھوں نے مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب کی نشاندہی اور اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا:

> ''مسلم طبقہ پسماندہ طبقہ نہیں ہے؟ اس بات پر فیصلہ کرنے کے لیے اس طبقہ کے کچھ طریقوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے: جیسے مرد کو اپنی بیوی کو یک طرفہ طلاق دینے کا حق، پردے کا اُصول، تعلیم کی کمی و دیگر امور ہیں، جن کے سبب مسلمانوں میں پسماندگی ہے، ان تمام امور پر غور کیے بغیر مسلمانوں کو تحفظ دینا مذہبی بنیادوں پر تحفظات دینے کے مترادف و مصداق ہے۔'' (روزنامہ منصف ۹/نومبر ۲۰۰۵)

محترم جناب نازکی نے ۳/طریقوں کو مسلمانوں کی پسماندگی و پستی کے اسباب میں شمار کیا ہے، ایک: مردوں کے لیے ایک طرفہ نظامِ طلاق، دوسرے: پردہ وحجاب، تیسرے تعلیم کا فقدان، آخری بات کے تعلق سے کسی کو انکار کی گنجائش نہیں کہ وہ بلا شبہ مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک اہم بنیادی سبب ہے، لیکن جہاں تک پہلی دو باتوں کا تعلق ہے، کیا وہ بھی واقعتا مسلمانوں کی پسماندگی کے اسباب ہیں؟؟ اس سوال کے تحت طالبِ علمانہ وضاحت وتشریح زیرِ نظر مضمون کی غرض و غایت ہے، یہ وضاحت وتشریح انشاء اللہ اگر اللہ کی توفیق وعنایت راقم الحروف کے ساتھ رہی تو یہ ظاہر اور روشن

کرے گی کہ محترم جسٹس نازکی صاحب کی رائے میں کتنی صداقت اور معقولیت ہے؟اور یہ کہ دوسروں کوانصاف دلانے والے معزز جج نے خوداپنی ذات ومذہب سے کہاں تک انصاف کیا ہے؟؟

اس سلسلہ میں دو باتیں ہمارے پیش نظر ہیں: ایک یہ کہ محترم جسٹس نازکی صاحب کی رائے ہی میں بجائے خود زبردست اختلاف اور کھلا تضاد ہے، ایک طرف تو وہ اس فقرہ ''مذہبی بنیادوں پر تحفظات دینے کے مترادف ومصداق ہوگا'' کے ذریعہ مذہب کی بنیاد پر تحفظات کی مخالفت کرتے ہیں، وہیں دوسری طرف اپنی رائے میں پردہ اور طلاق جیسے مذہبی قوانین کا حوالہ بھی دیتے ہیں، حالاں کہ انصاف کی بات یہ ہے کہ جب مذہب کی بنیاد پر تحفظات ناقابل تسلیم ہیں، اس سے متعلق قوانین کا تذکرہ اور حوالہ بھی درست نہیں ہونا چاہیے، پھراس پر مزید ظلم یہ کہ محترم جسٹس صاحب نے پردہ اور نظامِ طلاق کا نہ صرف حوالہ دیا، بلکہ اس کو پسماندگی کے اسباب بتا کر اس کی غلط تعبیر وتشریح کی، یہاں بھی عدل کا یہی تقاضا تھا کہ وہ جس چیز کا تذکرہ اور حوالہ دے رہے ہیں بحیثیت منصف (مسلمان نہیں) اس کی صحیح ترجمانی بھی فرماتے۔

محترم جناب جسٹس نازکی صاحب نے طلاق کے نظام اور پردہ کے اصول کو''طریقہ'' کی حیثیت سے تذکرہ کیا ہے، فاضل جج موصوف چوں کہ صاحبِ علم ہیں، آئین ودستور کی اصطلاحات اوراس کی نزاکتوں سے گہری واقفیت رکھتے ہیں، اس لیے ہم محترم جسٹس صاحب سے اتنے بدظن اور بدگمان بھی نہیں کہ وہ ''طور طریقوں، رسم ورواج ''اور''قانون'' کے درمیان فرق کونہیں جانتے ہوں، مثلاً مسلمانوں میں عید الفطر کے موقع سے شیر خورمہ پینا، سوئیاں پکانا اور اس قبیل کی دوسری باتیں رسم ورواج اور طور طریقوں کی حیثیت رکھتی ہیں، کوئی شرعی حکم اور قانونی عمل نہیں ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس طرح کے مواقع پر ہر جگہ کے مسلمانوں کے رسم ورواج اور ذوق ورجحان کی چیزیں الگ ہوتی ہیں، جسٹس نازکی صاحب کی رائے کے مطابق طلاق اور پردے کی حیثیت ونوعیت اگر طور طریقوں کی سی ہے تو دنیا کے تمام ممالک کے مسلمان اس کے اختیار کرنے اور اس پر عمل کرنے میں آزاد اور خود مختار ہونا چاہیے، جیسا کہ رسم ورواج کے اپنانے اور برتنے میں ان پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، لیکن صبح وشام ہر شخص کا مشاہدہ ہے کہ پردہ یعنی ستر چھپانا اور بدن پوشیدہ رکھنا اس حکم پر دنیا کے

تمام مسلمان عمل پیرا ہیں، اب یہ الگ بات ہے کہ پردہ کے قانون کی پابندی کا انداز اور رواج ہر علاقہ کا الگ اور جدا ہے لیکن نفس پردہ کا حکم ہر جگہ موجود ہے، یہی صورت طلاق کی بھی ہے، دنیا کے ہر مسلم ملک اور علاقہ میں طلاق دینے کا حق صرف مرد ہی کو حاصل ہے، اس کی بھی حیثیت صرف ''طورطریقے'' کی سی ہوتی تو اپنے اپنے رجحان اور پسند کے مطابق اس کی بجا آوری میں فرق واختلاف ہوتا، مگر ایسا نہیں ہے، پس معلوم ہوا کہ مسلمانوں میں پردہ اور طلاق کا نظام ایک مستقل قانون اور شرعی حکم ہے نہ کہ صرف ''طورطریقے اور رسم ورواج'' علاوہ ازیں خود قرآن وحدیث میں پردے کے اصول اور نظامِ طلاق سے متعلق واضح احکام اور تفصیلی ہدایات موجود ہیں، مثلاً قرآن مجید میں مؤمن عورتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے گھروں میں جمی رہیں، (سورۃالاحزاب: آیت ۳۳) اس کی بھی تفصیل بتا دی گئی کہ وہ کن کے سامنے اپنے جسم و چہرہ کو ظاہر کرسکتی ہیں اور کن کے سامنے نہیں۔ دیکھئے (سورۃالنور: ۳۱) پھر اسلامی شریعت کا مزاج ومذاق یہ ہے کہ عورت ''شمع محفل'' کے بجائے ''چراغِ خانہ'' بنی رہے، چنانچہ نماز جیسی عظیم الشان عبادت کے بارے میں بھی فرمایا گیا کہ عورتوں کے لیے سب سے افضل وبہتر نماز وہ ہے جو گھر کے اندر کوٹھری میں ادا کی جائے، اسلام نے خواتین کے رول کو گھر کے باہر سے زیادہ گھر کی چار دیواری اور بچوں کی تربیت و پرورش میں تسلیم کیا ہے، وہ عورت کو دوکانوں میں ''شوپیس'' بنانا نہیں بلکہ ''گھر کی ملکہ'' کی حیثیت سے دیکھنا چاہتا ہے، اسلامی پردہ کا مقصد عورت کی عزت وحرمت، اس کی عفت وعصمت کی حفاظت اور اس کے اندر شرم وحیاء کے جذبہ کو باقی رکھنا ہے۔

اسلامی شریعت کا یہ حکم انسانی فطرت کے عین مطابق ہے اور انسانی تاریخ کے ہر دور میں مہذب وشریف گھرانوں اور خاندانوں پر اس کی رعایت اور پابندی ہوتی رہی، قرآن مجید میں حضرت آدم اور حوا علیہما السلام کا واقعہ ہے کہ جب ان کے بدن سے جنتی لباس اتارا گیا تو یہ بزرگ ہستیاں درخت کے پتوں سے اپنے جسم کو ڈھانپنے اور چھپانے لگے، اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ہے کہ جب وہ مصر سے مدین کی جانب ہجرت فرمارہے تھے، ایک جگہ دیکھا کہ کچھ چرواہے لوگ اپنے جانوروں کو سیراب کررہے ہیں اور دو عورتیں ان چرواہوں کے ہجوم سے الگ

ہٹ کر پانی لینے کے انتظار میں کھڑی ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دریافت کرنے پر ان دونوں لڑکیوں نے بتایا کہ جب چرواہے اپنے جانوروں کو پانی پلا کر چلے جائیں گے تب ہم اپنے لیے پانی حاصل کریں گے، ویسے ہمارے والد بھی بہت بوڑھے ہیں، (سورۃالقصص: ۲۳) اس واقعہ میں لڑکیوں کی گفتگو سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس دور میں بھی مردوں کے ''دوش بدوش''، ''شانہ بشانہ'' کام کرنے اور زندگی کی گاڑی چلانے اور کھینچنے کا رواج نہیں تھا اور نہ ہی موجودہ نئے دورِ جاہلیت کی طرح اس کو ''ترقی، تہذیب وتمدن'' کا معیار سمجھا جاتا تھا، دوسرے یہ کہ یہ دونوں لڑکیاں بحالتِ مجبوری والد کے بڑھاپے کی وجہ سے گھر کے باہر نکلیں، ورنہ عموماً اس زمانہ میں بھی خواتین گھروں سے باہر نہیں نکلا کرتی تھیں۔

ان حقائق کی روشنی میں مسلم تحفظات کی بابت جسٹس نازکی صاحب کی رولنگ کو صحیح اور درست مان لیا جائے تو صرف پردہ نشین مسلم خواتین ہی نہیں، بلکہ انسانی سماج کا مہذب ومعزز اور شریف گھرانہ پسماندہ کہلائے گا، پس سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ پردہ کا اصول ذلت وپستی اور پسماندگی کا معیار نہیں، بلکہ عزت وعظمت اور ترقی وتہذیب کی معراج ہے، یہی عقل وانصاف کی عدالت کا فیصلہ ہے اور انسانی فطرت کا تقاضہ بھی۔

دوسری بات یہ کہ ان سب کے باوجود اگر محترم جسٹس نازکی صاحب کی رائے قبول بھی کر لی جائے تو تب ہمیں تجربہ ومشاہدہ کی گواہی کی سماعت کرنا پڑے گا کہ عملی اور روزمرہ کی زندگی میں کیا پردہ کا اصول واقعتاً پسماندگی کا سبب ومعیار ہے؟؟ مسلمان خواتین اور مشرقی اقدار کی حامل عورتوں میں شرم وحیاء، عفت وعصمت کا تصور ہے، اس لیے مردوں کے ساتھ اختلاط کے معاملہ میں وہ بہت زیادہ آزاد اور بے باک نہیں ہوتیں، اس کے برخلاف مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جانے والی مغربی تہذیب اور یورپین قوم میں اس طرح کی باتیں ''دقیانوسیت'' کہلاتی ہیں، پردہ وحجاب کو تو وہ ''خانہ بدوش خیمے'' سمجھتے ہیں، اس متمدن معاشرہ میں جو دوشیزہ مردوں کے ساتھ آزادانہ اختلاط میں زیادہ بے باک .... دوسرے صحیح لفظوں میں بے شرم اور نڈر ..... ہو وہ اتنی ہی زیادہ معزز ومحترم کہلائے گی، لیکن اس نام

نہادترقی یافتہ ،مہذب معاشرہ کی حقیقی صورتِ حال،وہاں کی اندرونی کیفیت کا کیا حال ہے؟اس کا اندازہ اوراحساس وہاں کی مختلف رپورٹس،اہلِ علم کی تحریروں کو پڑھنے سے ہوتا ہے، چنانچہ امریکن رسالہ کا بیان ہے:

’’تین شیطانی قوتیں جن کی شکست { کامیابی} آج ساری دنیا پر چھا گئی ہے اور یہ تینوں ایک جہنم تیار کرنے میں مشغول ہیں،فحش لٹریچر جو جنگِ عظیم کے بعد سے حیرت انگیز رفتار کے ساتھ اپنی بے شرمی اور کثرتِ اشاعت میں بڑھتا جارہا ہے،متحرک تصویریں جو شہوانی محبت کے جذبات کو بھڑکاتی ہیں ،بلکہ عملی سبق بھی دیتی ہیں،عورتوں کا گراہوا اخلاقی معیار جوان کے لباس اور بسا اوقات ان کی برہنگی اورسگریٹ کے روز افزوں استعمال اورمردوں کے ساتھ اُن کے ہر قید وامتیاز سے ناآشنا اختلاط کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ......‘‘(پردہ،ص:۷۹ مؤلف،مولانا سیدابوالاعلیٰ مودودیؒ)

ایک دوسری جگہ’’تاریخ الفحشاء‘‘(A History of prostitution) کاانگریز مصنف لکھتا ہے:

’’ایک اوراہم سبب جوسوسائٹی میں وسیع پیمانہ پرصنفی آوارگی پھیلنے کا موجب ہوا یہ ہے کہ عورتیں روزافزوں تعداد میں تجارتی کاروبار،دفتری ملازمتوں اور مختلف پیشوں میں داخل ہورہی ہے جہاں شب وروز ان کومردوں کے ساتھ خلط ملط ہونے کا موقع ملتا ہے،اس چیز نے عورتوں اورمردوں کے اخلاقی معیار کو بہت گرادیا ہے،اب جوان لڑکیوں کے ذہن میں شادی اور باعصمت زندگی کا خیال آتا ہی نہیں،دوشیزگی اور بکارت کو ایک دقیانوسی چیز سمجھا جاتا ہے اور دورِجدید کی لڑکی اس کوایک مصیبت خیال کرتی ہے،اس کے نزدیک زندگی کا لطف یہ ہے کہ عہدِشباب میں لذاتِ نفس کا جام خوب جی بھر کر پیا جائے ،اس چیز کی تلاش میں وہ رقص خانوں ،نائٹ کلبوں اور ہوٹلوں اورقہوہ

خانوں کے چکر لگاتی ہے۔'' (حوالہ سابق،ص:۸۸)

اس ترقی نما تباہی وبربادی کا ثمرہ اور نتیجہ یہ ہے کہ امریکہ میں ہر سال ۱۰ر لاکھ حرامی بچے اسقاط کے ذریعہ ختم کرائے جاتے ہیں، ۵۰ر فیصد کنواری لڑکیاں اور ۲۶ فیصد شادی شدہ عورتیں زنا میں ملوث ہیں اور کم از کم ہر پانچ میں ایک بچہ بھی صحیح النسب نہیں ہوتا۔ (ضبطِ ولادت: ۴۰-۴۲ مصنف مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ) یہ تو اعداد وشمار کا قدیم ریکارڈ ہے، موجودہ صورتِ حال یہ بتائی گئی کہ تعلیم وملازمت اور دیگر امور سے متعلق فارموں میں صرف ماں کے نام کا خانہ (کالم) ہوتا ہے باپ کے نام کا خانہ نہیں ہوتا۔

ان واقعاتی شہادتوں اور گواہیوں کے باوجود بھی جسٹس نازکی صاحب کی عدالت کا یہی فیصلہ ہے کہ پردے کا اصول پسماندگی کا سبب ہے، تو یہ ''عادلانہ ومنصفانہ'' فیصلہ ہمیں بسر وچشم قبول ہے اور ہم اس پر سر تسلیم خم کرتے ہیں، اسلامی پردہ کی پابندی وپیروی پر پستی وپسماندگی دقیانوسی، تنگ نظری و تاریک خیالی جیسے طعن وتشنیع کے تیر ونشتر اور پھبتیاں ہمارے لیے تحسین وتائید کے جملوں اور تعریف و توصیف کے تمغوں سے ہزار گنا زیادہ عزیز ہیں۔

اسلام کا نظام طلاق: محترم جسٹس نازکی صاحب نے مسلم تحفظات کی بابت اپنی رائے میں مردوں کے لیے یک طرفہ نظامِ طلاق کو مسلمانوں کی پسماندگی کا سبب بتلانے کی کوشش کی، یہاں پر بھی دو باتیں قابل غور اور لائق توجہ ہیں:

پہلی بات یہ کہ مرد وعورت دونوں کو طلاق کا حق دینا چاہیے یا دونوں میں سے کسی ایک کو یہ حق ملنا چاہیے؟ اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے مرد وعورت کے فطری جذبات اور تخلیقی صلاحیتوں کو سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے، مرد کی بہ نسبت عورت فطرتاً پیدائشی طور پر کمزور اور نازک مزاج پیدا کی گئی ہے، خوشی وغم اور غصہ اور ناراضگی کے حالات میں اس کے جذبات اور احساسات میں یکسانیت باقی نہیں رہتی اور وہ بہت جلد جذباتی اور آپے سے باہر اور بے قابو ہوجاتی ہے، عورت کی یہ کمزوری اور نزاکت اس کے لیے نقص وعیب نہیں، بلکہ اس کی نسوانیت کا کمال وامتیاز ہے۔

طلاق کا عمل شوہر اور بیوی کے درمیان نااتفاقی اور ناراضگی کے موقع پر اختیار کیا جاتا ہے، اس لیے ایسے مرحلے پر جذباتیت کے بجائے ہوش مندی اور دور اندیشی سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے، مرد

عورت کے بہ نسبت چونکہ ایسے موقع پر قابو رکھتا ہے، ازدواجی زندگی کے تعلقات کی نزاکت اور خاندانی نظام کے استحکام کی اہمیت کو وہ محسوس کرتا ہے، اس لیے وہ ناراضگی اور غصہ کی حالت میں بھی بہت سوچ وسمجھ کر قدم اُٹھاتا ہے، عورت اور مرد کے درمیان فطری جذبات اور خلقی صلاحیتوں کا یہ وہ فرق ہے جس کی بنیاد پر اسلامی شریعت میں مرد کو طلاق کا حق دیا گیا ہے، اگر کوئی ظالم بدکردار شوہر اپنے اس حق کا غلط استعمال یا استحصال کرتا ہے تو ایسی حالت میں شرعی قانون عورت کو ''حقِ خلع'' سے استفادہ کا موقع فراہم کرتا ہے، برخلاف اس کے کہ اگر عورت کو طلاق کا حق دیا جائے تو وہ معمولی معمولی بات پر اس کا حق استعمال کر بیٹھے گی اور نکاح کا مقدس رشتہ مذاق بن کر رہ جائے گا، ہر چھوٹی سی بات پر والدین کی جدائی سے گھریلو نظام تباہ ہو جائے گا، خاندان وقبائل کا شیرازہ بکھر جائے گا اور سماجی زندگی مکمل کھلونا بن کر رہ جائے گی، یہ صرف ڈرائنگ روم کی مضمون نگاری اور افسانہ نویسی نہیں، بلکہ مغربی معاشرہ کی حقیقت پر مبنی کہانی ہے، امریکہ اور دیگر یوروپی ممالک جہاں عورتوں کو طلاق دینے کا حق حاصل ہے، ایک امریکی جج اپنے ملک کی صورتِ حال یوں بیان کرتا ہے:

> ''طلاق اور تفریق کے واقعات بڑھتے جارہے ہیں اور اگر یہی حالت رہی جیسی کہ امید ہے تو غالباً ملک کے اکثر حصوں میں جتنے شادی کے لائسنس دیے جائیں گے اتنے ہی طلاق کے مقدمہ پیش ہوں گے'' (پردہ، ص: ۸۴)

ان ''ترقی یافتہ'' اور ''مہذب'' ممالک میں ایسی باتیں بھی طلاق کا موجب بن جاتی ہے جنہیں جان کر ہنسی آنے لگتی ہے، مثلاً شوہر اور بیوی میں سے کسی کا نیند میں خراٹے لینا یا فریقین میں سے کسی کو کسی کا کتا پسند نہ آنا وغیرہ، یہی وجہ ہے کہ یہاں کی عدالتوں میں ایسے بھی فیصلے ہوئے کہ ایک دن میں ۲۹۴ رنکاح فسخ کرنے پڑے۔ ۱۸۸۴ء میں فرانس میں جب طلاق کا نیا قانون پاس ہوا اس سال چار ہزار طلاق کے مقدمے پیش ہوئے، یہاں تک کہ بڑھتے بڑھتے یہ تعداد ۱۹۱۳ء میں ۲۱ ہزار تک پہنچ گئی۔ (ملخص، حوالہ سابق، ص: ۱۷)

دوسری بات یہ کہ عورتوں کے واسطے حق طلاق کی وکالت ''مساواتِ مرد وزن'' پُرفریب نعرہ کی صدائے بازگشت ہے، موجودہ دور میں کشت وخون اور قتل وغارت گری کو روا رکھنے اور جائز ٹھہرانے کے

لیے جیسے ''دہشت گردی'' کے لفظ کا استحصال کیا گیا ہے، ٹھیک اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ خواتین سے ان کی ''نسوانیت و دوشیزگی'' کو ختم کرنے کے لیے لفظِ ''مساوات'' کا استحصال کیا گیا اور اس کو غلط معنی تک پہنائے گئے، کیا میں معزز جسٹس نازکی صاحب سے یہ پوچھ سکتا ہوں کہ اگر ''مساوات'' کا یہی مطلب ہو کہ بحیثیتِ انسان مرد و عورت کو تمام حقوق برابر یکساں ملنے چاہیے تو بحیثیتِ جانور گائے بکری اور سانپ و بچھو کے ساتھ بھی ''یکساں'' اور ''برابری'' کا سلوک ہونا چاہیے، کیوں بعض کو غذا کے طور پر کھایا جاتا ہے اور دانہ پانی دے کر انہیں بڑا کیا جاتا ہے اور بعض کو نظر آتے ہی انتہائی بے دردی و بے رحمی کے ساتھ ختم کر دیا جاتا ہے، کیا عدالتِ عالیہ ان ''مظلوم'' و بے زبان جانوروں کے ساتھ روا رکھی گئی اس ''ظلم و زیادتی'' اور ''ناانصافی'' کا خاتمہ کر سکے گی؟ کیا جسٹس نازکی صاحب کی ''انصاف گاہ'' میں جانوروں کے ان ''پسماندہ طبقات'' کو اپنی زندگی صرف ایک فیصد تحفظ (پانچ فیصد تحفظات نہیں) بھی مل سکے گا؟؟

پس عدل و اعتدال کا راستہ اور سچائی و انصاف کا طریقہ وہی ہے جو اسلام نے بتایا ہے، اسلامی قانون میں حقوق کی تقسیم اور ذمہ داریوں کے تعیین کے تعلق سے ''مساوات'' کی رٹ لگانے کے بجائے ''عدل'' کو اہمیت دی گئی ہے، مرد و عورت کے درمیان ''عدل'' یہی ہے کہ دونوں کی فطری صلاحیتوں اور پیدائشی فرق کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے حقوق و ذمہ داریاں متعین کی جائیں، اس اعتبار سے اسلام میں مرد کو مرد کی حیثیت سے اور عورت کو عورت کی حیثیت سے ان کا مستحقہ مقام حاصل ہے۔

آخر میں ہم محترم جناب جسٹس بلال نازکی صاحب سے بجا طور پر اُمید رکھنا چاہیں گے کہ وہ بحیثیتِ منصف اسلامی قوانین کے متعلق اپنی ان تشریحات اور معلومات کے ساتھ ضرور انصاف کریں گے، بحیثیتِ مسلمان وہ رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے بھی مخاطب ہیں: مَنْ يُرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ، اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ بھلائی و بہتری کا ارادہ کرتے ہیں اس کو دین کا فہم عطا فرماتے ہیں۔

..........روزنامہ منصف: ۲۵ / نومبر ۲۰۰۵ء..........

عورت کی امامت!!

خِردَ کا نام جنوں پڑ گیا، جنون کا خرد

گذشتہ دنوں پھر ایک مرتبہ مغرب زدہ خواتین کو امامت کا شوق چرایا، ایک دو ماہ پہلے لکھنؤ کی ایک خاتون نے خطبہ نکاح پڑھا کر اپنے قاضی بننے اور کہلانے کا شوق پورا کیا، نفسانی خواہشات اور شیطانی خیالات کی پیروی جن خواتین کو مرغوب اور محبوب ہوتی ہیں وہ بہت جلدی اور تیزی کے ساتھ "آزادیٔ نسواں" اور "مساواتِ مردوزن" کے پُرفریب اور کھوکھلے نعروں سے مرعوب و مغلوب ہوجاتی ہیں، اس بناء پر ان خواتین کی غور وفکر کی صلاحیتیں مفلوج ہوتی ہیں، اس کے بعد انہیں اپنی ترقی وکامیابی، اسلامی قوانین کی پابندی اور پیروی میں نہیں بلکہ مغربی تہذیب کی پرستش میں نظر آتی ہے اور وہ اس کو اپنی سربلندی وسرخروئی کا معیار و مدار سمجھتی ہیں۔

عورت کی امامت کے مسئلہ پر چند امور پیش نظر رہیں: ایک یہ کہ یہ مسئلہ اسلامی فریضہ کے نام پر پیدا کیا گیا، اس لیے عورت کے بارے میں اسلام کے بنیادی نظریہ اور تصور کو جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہے، اسلام کی نظر میں عورت کوئی نمائش اور تشہیر کی چیز نہیں ہے، پوشیدہ ہونا اور چھپ کر رہنا خود عورت کا لفظی ترجمہ ہے، اسلام کی نگاہ میں خواتین کی عظمت وفضیلت "چراغِ خانہ" بن کر رہنے میں ہے نہ کہ "شمع محفل" وہ اس کو گھر کی ملکہ کی حیثیت دیتا ہے، اسلام میں مردوں کو عورتوں کی نگرانی ونگہبانی کا حکم دیا گیا اور خود عورتوں کو بھی تاکید کی گئی کہ وہ اپنی عفت وعصمت کی پوری حفاظت کریں، کیونکہ وہ نازک آبگینہ کی سی حیثیت رکھتی ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے ایک سفر کے موقع پر فرمایا: انہیں سنبھال کر چلو کہیں یہ آبگینے ٹوٹ نہ جائیں، عورت کی خوبی اور کمال اس کے نازک باندام اور ناز وادا کی بناء پر ہے نہ کہ ویٹ لفٹر (وزن اٹھانے کا مقابلہ کرنے والی خاتون) کہلانے میں ہے، پھر یہ کہ شیشہ اور گلاب کی

سی نزاکت عورت کے لیے نقص وعیب کے بجائے اس کی خوبی وخوبصورتی کی علامت ہے، نیز یہ کہ ہر چیز کی خصوصیات وکمالات کی بنیاد پر ان کے متعلق احکام وتدابیر میں فرق ہوتا ہے، مثلاً آنکھ اور ناخن دونوں اعضاء جسم ہیں، لیکن آنکھ کے سلسلے میں جو احتیاط ہوتی ہے وہ ناخن کے متعلق نہیں ہوتی، ہر ایک عضو کو اس کی حیثیت کے مطابق اس کا مستحقہ مقام اور اہمیت دی گئی، اس کے بعد بھی "مساوات مرد وزن" کا نعرہ ایسے ہی ہے جیسے "مساوات آنکھ وناخن"۔

عورت کے بارے میں اسلام کے اس بنیادی نقطہ نظر کی بناء پر عورت کو پردہ وحجاب کا پابند بنایا گیا، باہر کی زندگی میں مردوں کے شانہ بشانہ، دوش بدوش اور قدم بقدم چلنے کے بجائے خواتین کو حکم ہے کہ وہ اپنے گھروں میں رہیں: وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ (سورۃ الحزاب: ۳۳) مردوں کو باجماعت نماز کی ادائیگی کے لیے مسجد میں افضل بتایا گیا، لیکن عورتوں کو نماز پڑھنے کے لیے گھر کا کونہ اور گوشہ بہترین جگہ قرار دی گئی، عورتوں کو نامحرم لوگوں سے نرم انداز میں گفتگو سے منع کیا گیا: وَلاَ تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ (سورۃ الحزاب: ۳۲) اس لیے کہ نامحرم سے گفتگو کے دوران اگر چہ براجذبہ اور غلط ارادہ نہ بھی ہو، لیکن دل کا چور از خود آواز میں ''حلاوت'' لہجے میں ''لگاوٹ'' اور انداز میں ''گھلاوٹ'' پیدا کرتا ہے، اسی طرح خواتین کو ایسی رفتار سے چلنے پر روکا گیا کہ لوگ خواہ مخواہ ان کی طرف متوجہ ہوں: وَلاَ یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ (سورۃ النور: ۳۱) مطلب یہ کہ چلنے کے دوران پازیب کی جھنکار سننے میں نہ آئے ورنہ ایسا محسوس ہوگا کہ چلنے والی خاتون کا قدم زمین پر نہیں دیکھنے والے کے دلوں پر پڑ رہا ہے، اس کے علاوہ خوشبو لگا کر باہر نکلنے کو عورت کے لیے اچھا نہیں سمجھا گیا، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ جو خاتون عطر لگا کر لوگوں کے درمیان سے گذرتی ہے، وہ آوارہ قسم کی عورت ہے۔ (ترمذی)

عورت کے بارے میں پردہ وحجاب سے متعلق تفصیلی احکام کا یہ مختصر خلاصہ ہے، اس سے ہر صاحبِ عقل وفہم اندازہ لگا سکتا ہے کہ بنیادی طور پر اسلام عورت کو کہاں رکھنا چاہتا ہے؟ اور اس سے وہ کیا چاہتا ہے؟ اگر عورت کی امامت جائز مان لی جائے تو کیا وہ بحیثیتِ امام پردہ وحجاب کی پابندیوں کو پورا کرسکتی ہے؟ عورت کے امام بننے کے بعد کیا اسلام کا یہ بنیادی نقطہ نظر باقی رہ سکتا ہے؟ حقیقت یہ

ہے کہ اسلام میں عورت کی امامت کا تصور ہی نہیں ہے۔

ابتداءِ اسلام میں خواتین کو مساجد میں نماز پڑھنے کی اجازت تھی، اس وقت بھی انہیں حکم تھا کہ وہ مردوں کے پیچھے کھڑی ہوں، آپ ﷺ نے فرمایا: مردوں کے لیے بہترین صف پہلی صف اور بدترین صف آخری صف ہے اور خواتین کے لیے بہترین صف آخری صف اور بدترین صف پہلی صف ہے۔ (ترمذی: باب ماجاء فی الرجل ویصلی معہ رجال ونساء) اسی طرح جب گھر میں محرم رشتہ داروں کے ساتھ باجماعت نماز کی ادائیگی کا موقع ہو تو تب بھی حکم ہے کہ مرد وعورت پہلو بہ پہلو نہ ٹھہرے، خواہ وہ شوہر بیوی اور ماں بیٹے ہی کیوں نہ ہو، ایسے موقع پر صفوں کی ترتیب میں پہلے مردوں کی، پھر بچوں کی اور آخر میں عورتوں کی صف ہوتی ہے، حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ میری نانی حضرت ملیکہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی دعوت کی، کھانے کے بعد آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوئے میں اور تمیم (غالباً حضرت انسؓ کے بھائی کا نام) آنحضرت ﷺ کے پیچھے کھڑے ہو گئے اور میری نانی حضرت ملیکہؓ ہمارے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ (حوالہ سابق) حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نماز پڑھنے کے لیے بیدار ہوئے، میں آپ ﷺ کے پہلو میں کھڑا ہوا اور حضرت عائشہؓ ہمارے پیچھے کھڑی ہو گئیں۔ (نسائی باب موقف الامام اذا کان معہ صبی وامراۃ) نیز مرد وخواتین کی مشترکہ نماز میں امام سے غلطی ہونے پر حکم ہے کہ مرد حضرات سبحان اللہ کہہ کر یاد دہانی کرائیں اور خواتین الٹی ہتھیلی بجا کر آگاہ کریں۔ (بخاری باب التصفیق للنساء) مرد وخواتین کی مشترکہ (مخلوط نہیں) نماز میں اس طرح کی جزئی تفصیلات سے بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلامی شریعت میں عورت کی جگہ کیا ہے اور کہاں ہے؟

عورت کے متعلق اسلام کا یہ بنیادی نقطہ نظر مرد وعورت کے درمیان پیدائشی فرق، جسمانی بناوٹ اور طبیعت ومزاج کے اختلاف کی بناء پر بھی ہے، اس لیے کہ مہذب اور ترقی یافتہ سمجھی جانے والے اس دور میں بھی اگرچہ خواتین زندگی کے مختلف محاذ پر مردوں کے دوش بدوش چلنے کے لیے عملی میدان میں خم ٹھونک کر نکلی ہیں، لیکن ان کے متعلق عام تصور اور خیال اب بھی یہی ہے کہ وہ مردوں کے مقابلہ میں کمزور طبیعت کی مالک اور نازک مزاجی کی حامل ہیں، اس لیے ملازمت اور دیگر شعبوں میں خواتین کو

حکومت خصوصی مراعات اور تحفظات فراہم کرتی ہے جو مردوں کی بالادستی اور برتری کے سبب عورتوں کے تک نہیں پہونچ پائے، عورتوں کی کمزوری اور نازک مزاجی بالکل فطری اور قدرتی ہے، سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ عورتوں اور مردوں کی جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں میں ایک تہائی فرق ہے، عورتوں کا دل مرد کے دل کے مقابلہ میں ۶۰ / گرام بڑھ کر ہوتا ہے، نیز مردوں کا دماغی حجم کا تناسب ان کے جسم سے "۱/۴۰" اور خواتین کے دماغ کا حجم کا تناسب ان کے جسم سے "۱/۴۴" کا ہوتا ہے۔ (ملخص خواتین اور انتظامی مسائل، مؤلف حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

اس فرق کا نتیجہ ہے کہ ذہن ودماغ سے متعلق مضامین میں خواتین کی نمائندگی کم ہے، یہ تحقیق بھی سامنے آئی کہ حساب اور انجینئر نگ جیسے مضامین خواتین کی عدم دلچسپی کا سبب ان کا جسمانی اختلاف ہے، امریکہ میں کی جانے والی تحقیق کے مطابق ۲ / سال تک ذہین طلبہ کا ریکارڈ دیکھا گیا کہ لڑکے حساب، کمپیوٹر، سائنس اور انجینئر نگ میں بہتر مظاہرہ کرتے ہیں جبکہ بایولوجی، سماجیات اور عمرانیات میں لڑکیوں کی صلاحیت وقابلیت اچھی اور بہتر ہوتی ہے۔ (ملخص از ماہنامہ ندائے شاہی مارچ 2005 ڈاکٹر ایم اجمل)
مرد اور عورت کی فطری صلاحیتوں کے فرق کو سامنے رکھ کر ان دونوں کے دائرہ کار اور سماجی مقام کو بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، عورتوں کے بارے میں عمرانیات، فلسفہ اور نفسیات کے ماہر پروفیسر کائٹ لکھتے ہیں:

> "ہر دور نے عورتوں کے بارے میں ہمارے دور کی طرح عورتوں کی اجتماعی حیثیت سے متعلق غلط فہمیوں کو جنم دیا ہے، لیکن فطری قانون یہ ہے کہ عورتین گھریلو زندگی کے لیے ہیں، اس قانونِ فطرت میں کبھی کوئی اہم تغیر نہیں ہوا ہے اور یہی قانون صحیح ہے، ضروری ہے کہ عورتوں کی زندگی گھریلو ہو اور اسے خارجی کاموں سے آزاد رکھا جائے، تاکہ وہ اپنے فرائض زندگی کو انجام دے سکے۔" (خواتین اور انتظامی مسائل: ۱۸ از حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی)

مرد وعورت کی فطری صلاحیتوں کے اس فرق کی بناء پر اسلام نے ان دونوں کے حقوق کی تعیین اور ذمہ داریوں کی تقسیم میں "مساوات" کے بجائے "عدل" کو بنیاد بنایا، عورت کی فطری صلاحیتوں

اور طبعی تقاضوں کے مطابق اس کا دائرہ کار گھر بار رکھا گیا اور نسلِ انسانی کی تربیت و پرورش اس کی ذمہ داری قرار دی گئی، گھر کے باہر کی ذمہ داریاں مرد کے سپرد کی گئیں، حکومت و اقتدار چونکہ گھر کے باہر کا معاملہ ہے اس لیے یہ مردوں کا حق تسلیم کیا گیا، عہد رسالت میں ایران میں کسریٰ کے انتقال کے بعد اس کی بیٹی کو حاکم و بادشاہ بنایا گیا تھا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جس نے کسی عورت کو حاکم و بادشاہ بنالیا ہو، مذہبی امور فرائض کی انجام دہی میں ''امامت'' خود بھی ایک سیادت و قیادت ہے اور اس کی حیثیت دنیاوی حکومت و اقتدار سے بلند ہے، اس لیے اس کو "امامتِ کبریٰ" کہتے ہیں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت میں اس کو بھی بنیاد بنایا گیا کہ جب رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں آپ رضی اللہ عنہ دینی امور میں ہمارے امام رہے تو آپ ﷺ کے بعد دنیاوی امور میں آپ رضی اللہ عنہ کو بدرجہ اولیٰ ہمارا امام و خلیفہ ہونا چاہئے، اس طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گویا امامتِ کبریٰ (نمازوں کی امامت) کو امامتِ صغریٰ (حکومتی فرائض کی انجام دہی) کے انتخاب کے لیے بنیاد و معیار بنایا، یہی وجہ ہے کہ خلفائے راشدین حکومتی ذمہ داریوں کو نبھانے کے ساتھ نمازوں کی امامت بھی خود کیا کرتے تھے، یہیں سے ہم سمجھ سکتے ہیں جب اسلام میں امامتِ صغریٰ کے لیے (دنیاوی حکومت و اقتدار) عورت کی قیادت و حکمرانی کو ناپسند کیا گیا تو امامتِ کبریٰ (نمازوں کی ادائیگی) میں عورت کی امامت کیسے قابل قبول ہوسکتی ہے۔؟؟

پس اسلام میں عورت کا جو دائرۂ کار ہے، اس میں خواتین کی نہ حق تلفی اور نہ ان کی جکڑ بندی ہے، بلکہ ان کی نسوانی صلاحیتوں اور خوبیوں کی حفاظت و نگہبانی ہے، دنیا کا تجربہ، مشاہدہ اور پوری انسانی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ جب تک عورت اپنے دائرہ اور حد میں رہی، زمانہ کی نامور ہستیاں اس کی کوکھ سے پیدا ہوئیں، عادل اور بہادر حکمراں اور مختلف علوم و فنون کے ماہرین اس کی گود میں پلے بڑھے، اس لیے کہا گیا کہ "ہر کامیاب مرد کے پیچھے کامیاب عورت کا ہاتھ ہوتا ہے" حقیقت بھی یہی ہے کہ کامیاب خاتون وہی ہے جو مرد کے پیچھے ہو نہ یہ کہ اس کے آگے ہوکر "امام" بنے، غور کیجئے کہ کسی معمولی مشین کا ایک پرزہ بھی اپنی جگہ بدل دے تو پورا مشینی نظام اس سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہتا، مرد اور عورت بھی کائنات کے نظام کے کل پرزے ہیں اگر یہ اپنی جگہ تبدیل کرلیں تو اس کی وجہ سے گھریلو

زندگی میں جو تباہی ہوسکتی ہے، خاندانی نظام میں جو بھونچال آئے گا اور سماج میں جو بگاڑ ہوگا اس کے اثرات ہم اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، ان تلخ حقائق کے باوجود" آزادیٔ نسوان" اور" مساواتِ مردوزن" کے پرفریب اور کھوکھلے نعروں سے متأثر ہوکر اپنے لیے حقِ امامت کی وکالت کرنا نری جہالت اور کھلی حماقت ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

............روزنامہ منصف ۳۱؍ اکتوبر ۲۰۰۸ء............

افسانہ

رسولِ اکرم ﷺ اور تعددِ ازدواج

عدالتِ ''عدل وانصاف'' کے بے لاگ تاریخی فیصلہ کی روشنی میں!

اسلامی تاریخ کے بموجب عدل وانصاف دورکنی بنچ نے ایک تاریخی فیصلہ دیتے ہوئے کہا کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر نفس پرستی وشہوت رانی کا الزام کھلا ہوا بہتان اور سراسر تہمت ہے، حقائق سے دور، غلط قیاسات واندازوں پر مبنی ہے، مختلف اسلامی نیوز ایجنسی کے مطابق چند سال پہلے ایک مستشرق نے یہ کہہ کر مسلمانوں کی دل آزاری کی تھی کہ ان کے پیغمبر ورسول حضرت محمد ﷺ شہوت پرست ونفس پرست تھے (نعوذ باللہ) اس کے خلاف مسلمانوں کے ایک مشہور عالمِ دین نے عدالت ''عدل وانصاف'' میں مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے کا مقدمہ دائر کیا، جس پر عدالتِ عدل وانصاف نے فوری کاروائی کرتے ہوئے فریق مخالف کو شخصی حاضری کا حکم دیا۔

تاریخِ مقررہ پر دونوں فریق عدالت میں حاضر ہوئے، عدالتی کاروائی شروع کرتے ہوئے دورکنی پنچ نے مقدمہ کے آغاز کا حکم دیا، فریقِ مخالف نے بحث کا آغاز کرتے ہوئے کہا:

> ''میں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد (ﷺ) کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے، مسلمان عوام کو اس پر خواہ مخواہ غیر ضروری طور پر مشتعل اور غصہ نہ ہونا چاہیے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ حضرت محمد (ﷺ) نے گیارہ شادیاں کیں اور عین بڑھاپے کی عمر میں ۹ رسالہ کنواری لڑکی سے شادی کی، اسی طرح حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے انہوں نے ان کی حسن وخوبصورتی سے مرعوب ہوکر نکاح کیا ہے، شاید میرے فاضل دوست اس تلخ حقیقت کو قبول نہ کر پائیں''

مسلمانوں کے مشہور عالمِ دین نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا:

''قانون کا مسلمہ اصول اور قاعدہ یہ ہے کہ جس پر بھی فردِ جرم عائد کیا جائے وہ اس وقت تک قابل تسلیم نہیں ہوتا جب تک کہ اس پر عائد ہونے والا الزام مضبوط اورٹھوس دلائل سے ثابت نہ ہو، مثلاً کسی پر چوری کا الزام ہے، ملزم بھی کہتا ہے کہ میں قانونی سزا پانے کے لئے بالکل تیار ہوں شرط یہ ہے کہ وہ مجھ پر دلائل کی بنیاد پر نافذ ہو، اس پر الزام لگانے والا کہتا ہے، نہیں نہیں !! اس نے ۴۰ ر ہزار روپئے کی چوری کی ہے، الماری کا قفل توڑا ہے اور اس طرح کی دیگر تفصیلات بیان کرنے لگتا ہے، میرا خیال ہے کہ عدالت ان ساری تفصیلات کی سماعت سے قبل ہی مقدمہ کو خارج کردے گی، یہی حال میرے فاضل دوست کا ہے، انہوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر فردِ جرم عائد کرتے ہوئے اس کی ساری تفصیلات (۱۱ ر شادیاں، کم عمر میں نکاح وغیرہ) بیان کر دیا، لیکن اس کے لیے وہ کوئی واضح اور بنیادی ثبوت پیش کرنے سے قاصر ہے، شاید میرے فاضل دوست اپنے اس بے بنیاد اور غلط الزام کے تلخ گھونٹ کو پی نہ سکیں گے، مگر یہی ان کے الزام کی حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں''

اس مضبوط و نا قابلِ برداشت جرح سے شرکاءِ عدالت دَنگ رہ گئے، احاطۂ عدالت کے باہر سے نعرۂ تکبیر کی آوازیں سنی جانے لگی اور کچھ دیر کے لیے عدالت میں سناٹا اور خاموشی چھا گئی، تھوڑی دیر وقفہ کے بعد مشہور مسلم عالمِ دین اپنی بنچ سے کھڑے ہوئے اور دوبارہ بحث میں حصہ ہوئے جج سے کہنے لگے:

میں معزز عدالت سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا اس غلط اور بے بنیاد الزام کو قانونی حیثیت دی جاسکتی ہے؟ کیا یہ الزام دستوری حکم لگانے کے قابل ہے اور کیا یہ بہتان آئینی موقف کا حامل ہوسکتا ہے؟ اگر میرے فاضل دوست اپنے غلط و بے بنیاد اور جھوٹ پر مبنی الزام کو سچائی و صداقت کا لباس پہنانے پر بضد ہیں اور اس کو آئینی حیثیت دلوانے پر مصر ہیں تو میرے اگلے ۵ ر سوالات کا جواب انہیں ضرور

دینا ہوگا، سنئے اور نوٹ کرتے جایئے!

۱) آپ کا الزام ہے کہ حضرت محمد ﷺ (نعوذ باللہ) نفس پرست وشہوت پسند تھے، اگر یہ صحیح ہے تو انھوں نے اپنی نوخیز ابھرتی نوجوانی ۲۵ رسال کی عمر یعنی انتہائی عنفوانِ شباب کے دور میں ایک ۴۰ رسالہ بیوہ خاتون سے شادی کیوں فرمائی؟

۲) اگر آپ کا یہ الزام سچ ہے تو مکہ میں آپ ﷺ کی سخت مخالفت وعداوت اور نفرت کے دور میں آپ ﷺ کے سخت ترین جانی دشمنوں نے آپ ﷺ پر یہ الزام کیوں نہیں لگایا؟ جب کہ ان کے سامنے آپ ﷺ کی ۴۰ رسالہ زندگی تھی اور وہ آپ ﷺ پر کاہن، مجنون، ساحر کا الزام لگا چکے تھے۔

۳) اگر فاضل دوست کا الزام درست ہے تو پیغمبر اسلام ۵۵ رسال کی عمر تک صرف ایک زوجۂ پر اکتفاء کیوں فرمایا؟

۴) آپ ﷺ کی تمام ازواج میں صرف ایک زوجہ ہی کنواری کیوں تھیں؟ جب کہ قوم کی دوشیزائیں اپنے آپ کو آپ ﷺ کے قدموں پر نچھاور کرنے کو اپنے لیے سب سے بڑی خوش قسمتی، نیک بختی اور سعادت مندی سمجھتی تھیں۔

۵) آخری سوال اگر پیغمبر اسلام ﷺ نے (نعوذ باللہ) محض نفس پرستی وشہوت پسندی کی خاطر اپنے لیے کثرتِ ازواج کو جائز رکھا تو اپنے لیے قرآن کی اس پابندی کا اعلان کیوں فرمایا؟ جس میں کہا گیا کہ ان ازواج سے شادی کے بعد آپ کے لیے دوسری عورتیں حلال نہیں ہیں اور نہ آپ اپنی ان ازواج میں سے کسی کو بدل سکتے ہیں اگرچہ آپ کو ان کا حسن پسند ہی کیوں نہ ہو۔

میں اپنے فاضل دوست سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا وہ سچائی اور انصاف پر مبنی ان پانچ سوالات کا جواب دے سکتے ہیں؟

پھر ایک بار عدالت میں خاموشی چھا گئی، شرکاءِ عدالت کی سوالیہ نگاہیں فریق مخالف پر جم گئیں، چیف جسٹس مسٹر "عدل" نے مداخلت کرتے ہوئے فریق مخالف کی جانب متوجہ ہوکر کہا:

عدالت کو مسٹر...... کے جوابات کا انتظار ہے، عدالت صرف دیانتداری وایمانداری اور حقائق

پر مبنی جوابات قبول کرنے کی پابند ہے، قیاس اور اندازہ پر مبنی جوابات ہمارے لیے ناقابلِ قبول ہیں، اس لیے کہ عدالت ایک قانون گاہ ہے، نہ کہ ''رصدگاہ'' جس کی بناء پر آپ کو قرائن و اندازہ پر پیش قیاسی کرنے کا جواز مل سکے۔

معزز جج کی اس قانونی وضاحت اور تنبیہ کے بعد فریقِ مخالف کو خاموش رہنے میں اپنی عافیت نظر آئی، چنانچہ عدالت کے بار بار مطالبہ کے باوجود وہ جاری بحث میں حصہ لینے سے عاجز رہے، مسلمانوں کے مشہور عالمِ دین طویل بحث کے دوران بہت تھک چکے تھے، پھر وہ جلد ہی ایک گلاس پانی پینے کے بعد اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بنچ سے کھڑے ہوئے اور بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے کہنے لگے: میں جانتا ہوں میرے فاضل دوست ان سوالات کا حقیقت و صداقت پر مبنی جواب دے سکتے ہیں لیکن وہ خاموش رہنا چاہتے ہیں، یقیناً اگر وہ چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ:

> ''حضرت محمد ﷺ کی جوانی چاندی سے زیادہ اجلی اور پھولوں سے بڑھ کر بے داغ اور معصوم تھی، قدرت نے آپ ﷺ کے دامنِ کردار پر بھول چوک کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ دی، خون کے پیاسے اعداء نے آپ ﷺ کے خلاف پورے عرب کو جنگ کے لیے کھڑا کر دیا، لیکن کوئی شخص آپ ﷺ کی زندگی اور ذات و شخصیت پر تہمت نہ لگا سکا، آپ ﷺ جاہلیت کے جواریوں، شرابیوں، زانیوں اور بدکاروں میں تنہا متقی، پرہیزگار اور نیک کردار تھے، زیادہ سے زیادہ نیکی کا تصور جو انسان کر سکتا ہے آپ ﷺ اس سے بھی زیادہ نیک اور صالح فطرت تھے، انسانیت کی بلندی کا آخری مقام جو ذہن میں آ سکتا ہے حضرت محمد ﷺ کی شخصیت اس سے بھی بہت بلند تھی، مکہ کی ہر گلی اور چپہ میں، مکہ کیا، عرب کے ہر کونہ اور گوشہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی پاکدامنی، پاکبازی، راست بازی، ایمانداری، امانتداری، دیانتداری، حیاداری، نیکوکاری، پرہیزگاری، خوش روی، خوش معاملگی، خوش اخلاقی، انصاف پسندی، غیرت مندی، دردمندی، غمگساری اور عصمت مآبی کے گن گائے جاتے

تھے، اور ہر چھوٹے بڑے گھر میں آپ ﷺ کی خوبیوں، اچھائیوں، بھلائیوں کے ترانے پڑھے جاتے تھے، ہر مجلس میں آپ ﷺ کی ذاتِ بابرکت وعالی مرتبت کے نغمے سنے اور سنائے جاتے تھے،،

اس کے بعد عالمِ دین نے انتہائی جذباتی انداز میں قدرے بلند آواز کے ساتھ راست فریقِ مخالف کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

’’آپ کیوں حقائق سے بند کیے آنکھیں کھولنا نہیں چاہتے؟ کیوں نظروں پر تعصب وہٹ دھرمی کی لگی عینک کو اتارنا نہیں چاہتے؟ کاش! آپ اپنے کو مصنوعی نیند سے بیدار کرتے اور اپنی مجرمانہ خاموشی کو توڑتے ہوئے اپنے آنکھوں پر بندھی فرقہ واریت کی پٹی کھولتے......‘‘

اس راست اور شخصی مخاطبت کی وجہ سے عدالت میں کچھ دیر کے لیے ہلچل سی مچ گئی، لیکن پولیس کی بروقت مداخلت نے حالات کو بے قابو نہ ہونے دیا، جسٹس مسٹر ’’انصاف‘‘ مسلم عالمِ دین کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے: جناب! آپ اپنے جذبات کو قابو میں رکھئے! عدالت پرامن فضاء اور سنجیدہ ماحول میں مقدمہ کی سماعت چاہتی ہے، معزز عدالت کا وقت ختم ہونے کے قریب تھا، اس لیے جج صاحبان ’’عدل‘‘ و’’انصاف‘‘ نے عالم دین کی آج کی جوابی بحث کو قبول کرتے ہوئے اس پر اپنا فیصلہ محفوظ کرلیا اور مقدمہ کی اگلی سماعت تک فیصلہ کے اعلان کو ملتوی کردیا۔

○○○

آج جیسے ہی عدالت کی کاروائی شروع ہوئی تو دورکنی بنچ نے کہا: عدالت مقدمہ کو غیر ضروری طول دینا نہیں چاہتی اور قطعی فیصلہ سے قبل عدالت عالم دین سے ضرور یہ پوچھنا چاہے گی کہ پیغمبر اسلام نے کن وجوہات اور مصالح کی بنیاد پر گیارہ شادیاں کی؟ عالم دین کو چاہیے کہ وہ اپنی آئندہ بحث اسی سوال کے جواب میں محدود رکھے۔

عدالت کے اس سوال کے بعد مسلم عالمِ دین کچھ دیر سوچ میں پڑ گئے، لیکن تھوڑی دیر بعد وہ بنچ سے کھڑے ہوئے اور بحث میں حصہ لیتے ہوئے کہا:

محترم جج صاحبان ! میرے لیے عدالت کا یہ سوال بہت اہم اور نازک ہے، اگر عدالت تفصیلی جواب کو ضروری سمجھتی ہے تو شاید وقت کی تنگ دامنی اس کی اجازت نہ دے، اگر عدالت چاہے تو اس کے لیے مصالح کا دفتر مل سکتا ہے اور اسباب ووجوہات کا رجسٹر اس کے لیے تیار ہوسکتا ہے لیکن جب معزز عدالت مقدمہ کو غیر ضروری طول دینا نہیں چاہتی اور مقدمہ قطعی فیصلہ کی چوکھٹ پر کھڑا ہے تو بحیثیتِ وکیل میرا بھی یہ فرض ہے کہ سوال کا مختصر جواب ایوانِ عدالت میں پیش کردوں۔

پیغمبرِ اسلام ﷺ نے جو گیارہ شادیاں کی ہیں اس میں بہت سے مصالح اور مقاصد تھے، ان میں اہم اور بنیادی مقاصد تین ہیں:

۱) اسلامی علوم کی نشر واشاعت: مثلاً سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح، علوم اسلامیہ میں ان کی عظیم وبلند پایہ خدمات تاریخ کا زرّیں باب ہے، خصوصاً تعلیم نسواں، عورتوں کے مخصوص مسائل میں ان کے علمی واصلاحی اور دعوتی کارنامے زندۂ جاوید اور ناقابلِ فراموش ہیں، خلفاءِ راشدین اپنے عہدِ خلافت میں اہم اور نازک مسائل کے وقت ان سے رجوع ہوتے تھے، چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے نقل کی جانے والی جملہ احادیث کی تعداد ۲۲۱۰/ ہے اور حضرت حفصہؓ سے نقل کی جانی والی جملہ احادیث کی تعداد ۶۰/ ہے، اگر یہ بابرکت اور مقدس نکاح نہ ہوتا تو امتِ مسلمہ ان کے بلند پایہ علمی ذخیرہ اور ذہانت وفراست کے سرمایہ سے محروم رہتی۔

۲) دشمنانِ اسلام کی فوجی وعسکری قوت وطاقت کو متأثر کرنا: مثلاً حضرت امّ حبیبہ رضی اللہ عنہا کا نکاح، اس نکاح کی اطلاع جب حضرت ابوسفیان کو ہوئی تو انہوں نے کہا: محمد ﷺ سے لڑائی اور انہیں قابو میں رکھنا اب ہمارے بس میں نہیں، اسلام کے خلاف کفار مکہ کی تمام جنگیں انہیں کی سپہ سالاری اور قیادت میں ہوتی تھیں، لیکن اس نکاحِ مسعود کے بعد اسلام کے خلاف کسی بھی جنگ میں انہوں نے فوجی کمان نہیں سنبھالی، بلکہ کچھ دن بعد وہ اسلام کے زیرسایہ آگئے، اسی طرح امّ المومنین حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کا مبارک نکاح ہے، اس سے پہلے کفار اور مسلمانوں کے مابین اکثر جنگوں میں کفار کو یہودیوں کی خاموش یا علانیہ تائید وحمایت ضرور ہوتی تھی، لیکن اس بابرکت نکاح کے بعد وہ مسلمانوں کے خلاف کسی جنگ میں شامل نہیں ہوئے۔

۳) بیوہ خواتین کی فلاح و بہبودی: پیغمبر اسلام ﷺ نے سوائے ایک کے تمام شادیاں بیوہ خواتین سے کی، کیوں کہ ان کے سابق شوہر اسلام کے غلبہ اور اس کی سربلندی کے لیے اللہ کی راہ میں شہید ہوگئے تھے اور آپ ﷺ ہی بحیثیتِ امیر المسلمین بہتر طور پر ان کی نگہداشت ونگہبانی کرسکتے تھے اور ان کے جذبات کا صحیح اندازہ لگا سکتے تھے، مثلاً حضرت امّ سلمہؓ کے خاوند حضرت ابوسلمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے، پھر غزوۂ احد میں شریک ہوکر بہت زخمی ہوگئے، غزوۂ احد کے کچھ دن بعد تک وہ باحیات رہے، لیکن زخموں سے جانبر نہ ہوسکے اور شہید ہوگئے، آخری وقت ان کی زبان پر یہ الفاظ تھے: **اَللّٰھُمَّ اخْلُفْنِیْ فِیْ اَھْلِیْ خَیْرًا** اس کے بعد حضرت امّ سلمہؓ کا نکاح آپ ﷺ سے ہوا، اگر یہ باعظمت نکاح نہ ہوتا تو آج کا مسلم سماج اور اسلامی معاشرہ بیواؤں، یتیموں کے حقوق وذمہ داریوں سے ناواقف ہوتا اور ان کے ساتھ احسان وسلوک کی تعلیمات سے ناآشنا رہتا۔

عدالت میں تمام لوگوں کی نظریں عالمِ دین پر ٹکی ہوئی تھیں، وہ ان کی عالمانہ بحث اور مدلل گفتگو کو متأثر کن انداز میں سن رہے تھے، مشہور عالمِ دین کی مفکرانہ، مدبرانہ، محققانہ اور منصفانہ بحث پوری متانت اور سنجیدگی کے ساتھ جاری تھی، شرکاءِ عدالت کا ہر فرد ان کی بحث پر انگشت بدنداں تھا، خود دورکنی بنچ کی تعجب خیز اور حیرت انگیز نگاہیں عالم دین کی جانب مرکوز تھیں، جیسے ہی بحث ختم ہوئی عدالت میں بالکل خاموشی چھاگئی اور لوگ ایک دوسرے کو خاموش اور پرسکون رہنے کی خواہش کرتے نظر آئے، اس لیے کہ سب کو مقدمہ کے فیصلہ کا انتظار تھا۔

دورکنی بنچ نے بالاتفاق اپنا قطعی اور آخری فیصلہ سناتے ہوئے کہا:

> ”عدالت مقدمہ کی طویل سماعت کے بعد اس نتیجہ پر پہونچی کہ پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ پر فریقِ مخالف کا الزام صریح تہمت اور کھلی ہوئی بہتان تراشی ہے، حقائق سے دور، جھوٹ اور مذہبی عصبیت پر مبنی ہے، اس لیے کہ بادی النظر میں حضرت محمد ﷺ کے بارے میں ہمیں ایسی کوئی نظیر اور مثال نہیں ملتی کہ الزام کو سچ قرار دیا جاسکے، بلکہ اس کے خلاف دلائل وشواہد ملتے ہیں، جن کو مخصوص ومتعین نظریہ کی عینک سے نہیں پڑھا جاسکتا“

انتہائی باثوق اور قریبی ذرائع کے مطابق عدالت کے دور کنی بنچ ''عدل وانصاف'' نے فیصلہ کا اعلان کرتے ہوئے مزید کہا:

''دلائل اور واضح ثبوتوں کی روشنی میں فریقِ مخالف ''مسٹر......'' کا الزام بالکل غلط، بے بنیاد، جھوٹ اور دروغ گوئی پر مبنی ہے، کائنات کی مقدس ترین ہستی پر ان کے ناپاک و گستاخانہ الزام پر مبنی ان کی تحریروں کی اشاعت پر پابندی عائد کی جاتی ہے اور انصاف وسچائی کے تقاضہ کے مطابق عدالت کا یہ فیصلہ ہے کہ اس الزام پر مطبوعہ وغیر مطبوعہ لٹریچر کو نذرِ آتش کر دیا جائے''

جیسے ہی دور کنی بنچ نے اپنا فیصلہ ختم کیا پوری فضا نعرۂ تکبیر کے فلک شگاف نعروں سے گونجنے لگی اور ایوانِ عدالت دہل کر رہ گیا، لیکن پولیس کے زبردست انتظام اور بندوبست کی وجہ سے نقضِ امن کا خطرہ نہیں ہوا، فیصلہ کے بعد مسلمانوں کے مشہور عالمِ دین نے پریس کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

ہم اسلام کے لیے اپنے عیسائی بھائیوں کی علمی تحقیقات وریسرچ کا خیر مقدم کرتے ہیں، لیکن انہیں یہ بھی یاد ہونا چاہیے کہ تحقیق وریسرچ کے نام پر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف کی جانے والی فتنہ انگیز سازشوں کا پوری بے جگری سے مقابلہ کیا جائے گا اور ہمارے عیسائی ریسرچ اسکالرس کو اس کے لیے تیار رہنا ہوگا۔

............روزنامہ منصف: ۲۲/ جون ۲۰۰۱ء............

''حضرت محمد ﷺ کی جوانی چاندی سے زیادہ اجلی اور پھولوں سے بڑھ کر بے داغ اور معصوم تھی ، قدرت نے آپ ﷺ کے دامنِ کردار پر بھول چوک کی پرچھائیں بھی پڑنے نہ دی، خون کے پیاسے اعداء نے آپ ﷺ کے خلاف پورے عرب کو جنگ کے لیے کھڑا کر دیا، لیکن کوئی شخص آپ ﷺ کی زندگی اور ذات وشخصیت پر تہمت نہ لگا سکا .... زیادہ سے زیادہ نیکی کا تصور جو انسان کر سکتا ہے آپ ﷺ اس سے بھی زیادہ نیک اور صالح فطرت تھے، انسانیت کی بلندی کا آخری مقام جو ذہن میں آسکتا ہے حضرت محمد ﷺ کی شخصیت اس سے بھی بہت بلند تھی''

صحیح اور قابلِ عمل احادیث
کیا صرف بخاری و مسلم ہی میں ہیں؟؟

دین و شریعت پر ثابت قدمی اور صراطِ مستقیم کی پیروی کے لیے علم کی گہرائی و پختگی ضروری ہے، ظاہر ہے کہ یہ صلاحیت اور اہلیت ہر شخص میں نہیں ہوتی، اس لیے ائمہ کرام کی تقلید اور ان سے وابستگی ہی میں عقائد و اعمال کی درستگی اور سلامتی ہے، کیونکہ کم علمی، لاعلمی سے زیادہ مصیبت اور فتنہ کا سبب ہے، انسان سرے سے کچھ جانتا ہی نہ ہو تو اس کو سمجھانا بہت آسان ہے، اگر معلومات سرسری اور سطحی ہیں اور اس پر بھی ''علامۂ وقت'' اور ''محقق دوراں'' سمجھنے اور کہلانے کا خبط سوار ہے تو ایسے آدمی کو کچھ سمجھانے کے لیے دوگنی کوشش کرنی پڑتی ہے، پہلے معلومات کی حقیقت اور حیثیت واضح کی جائے، پھر صحیح بات دماغ میں بٹھائی جائے، صاف پائپ لائین میں پانی کا بہاؤ زیادہ آسان اور تیز ہوتا ہے بہ نسبت اس پائپ لائین کے جس میں کوڑا کرکٹ اور کچرا بھرا ہوا ہو۔

پھر یہ کہ علم کی گہرائی اور پختگی کے ساتھ دین و شریعت کا صحیح فہم اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمت ہے، جو چند منتخب اور مخصوص بندگانِ خدا ہی کو ملتی ہے، اس لئے قرآن و حدیث میں جہاں تفقہ فی الدین کا ذکر ہے وہاں اس کو عام نہیں رکھا گیا، بلکہ چند اور کچھ افراد کے لیے یہ بات کہی گئی، باری تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَا كَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِيَنْفِرُوا كَافَّةً فَلَوْلاَ نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ (التوبۃ: ۱۴۲) ایک جگہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کی بھلائی چاہتا ہے اس کو دین کا صحیح فہم عطا فرماتا ہے: مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ بِهٖ خَيْرًا يُّفَقِّهْهُ فِي الدِّيْنِ۔

سطحی اور سرسری علم کی گمراہی اور اس بناء پر صراطِ مستقیم سے دوری کی ایک مثال موجودہ دور کے غیر مقلد حضرات کی ہے، انہیں اس کا تو علم ہے کہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں صحیح احادیث جمع کی گئیں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ ان دو جلیل القدر اور عظیم المرتبت مصنّفین کی کتابوں کے علاوہ دیگر

حدیث کی کتابوں میں بھی صحیح ومعتبر احادیث موجود ہیں، پھر اپنی اس کم علمی اور کم فہمی ــــــ گستاخی معاف !ــــــ خودسری اور ہٹ دھرمی سے انہوں نے یہ خودساختہ معیار بنالیا کہ بخاری ومسلم میں جو احادیث ہیں صرف وہی صحیح ،معتبر مستند اور قابل عمل ہیں، اس کے علاوہ دیگر کتابوں کی احادیث صرف اس بناء پر نا قابل قبول اور نا قابل عمل ہیں کہ امام بخاری اور امام مسلم نے ان احادیث کو اپنی کتابوں میں جگہ نہیں دی ،غیر مقلد حضرات کے اس خودساختہ معیار سے امتِ مسلمہ ذخیرۂ حدیث کے ایک بڑے حصہ پر عمل کرنے سے محروم رہ جاتی ہے، یہ خودساختہ اور من گھڑت معیار ،حدیث کے صحیح ،معتبر اور قابل عمل ہونے کے بنیادی اصولوں پر کتنا کھرا اترتا ہے؟ اور دین حق کے آسان ،آفاقی ،مکمل اور محفوظ ہونے کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتا ہے؟ اس کو جاننے اور سمجھنے کے سلسلہ میں چند امور قابل توجہ ہیں:

ا) سب سے پہلے یہی بات کہ عمل اور اتباع کے لیے بخاری ومسلم کی احادیث پر اصرار کہاں تک صحیح ہے؟ آیا احادیث یقینی اور قطعی علم کا فائدہ دیتی ہیں کہ ان کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں؟ اس سلسلہ میں بلند پایہ محقق علامہ کمال الدین ابن ہمام فرماتے ہیں:

> ’’جو لوگ کہتے ہیں کہ صحیح ترین حدیث وہ ہے جس پر شیخین (بخاری ومسلم) متفق ہوں، پھر وہ جو تنہا بخاری کی ہو، پھر وہ جو تنہا مسلم کی ہو، پھر وہ جو اِن کے علاوہ کی ہو اور اِن کی شرط پر ہو، پھر وہ جو اِن میں سے کسی ایک کی شرط پر ہو، اِن کا یہ کہنا دعویٰ بلا دلیل (ہٹ دھرمی) ہے جو قابل اتباع نہیں ہے، اس لیے زیادہ صحیح ہونے کا مدار اکمل طریقہ پر شرائطِ صحت کے جامع ہونے پر ہے، لہٰذا اگر صحیحین (بخاری ومسلم) کے علاوہ کی کسی حدیث میں یہ شرائط مکمل طور سے موجود ہوں اور اس کے بالمقابل صحیحین کی کسی حدیث میں شرائطِ صحت اس درجہ نہ پائے جاتے ہوں تو اس کو اس کی موجودگی میں شیخین (بخاری ومسلم) ہی کی حدیث کو اصح کہنا ہٹ دھرمی نہیں تو اور کیا ہے؟ پھر شیخین یا ان میں سے کسی ایک کا کسی معین راوی کے بارے میں فیصلہ کرنا کہ وہ شرائطِ صحت کا جامع ہے اس بات کو مستلزم نہیں کہ واقع اور نفس

الامر میں بھی وہ ایسا ہی ہے، امر واقعہ اس کے برخلاف بھی ہوسکتا ہے، چنانچہ امام مسلم نے کتنے ہی ایسے راویوں سے حدیثیں لی ہیں جو جرح کی آفتوں سے محفوظ نہیں ہیں ،اسی طرح بخاری کے رجال کی ایک بڑی تعداد ہے جن پر کلام کیا گیا ہے'' (فتح القدیر باب النوافل ۱/ ۴۴۵ بحوالہ حدیث اور فہم حدیث ،ص:۱۷۵-۱۷۶ مصنف مولانا عبداللہ معروفی)

اسی طرح نامور محدث اور محقق علامہ احمد محمد شاکر حدیث کے مشہور صحیفہ،صحیفہ ہمام ابن منبہ کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

''صحیفہ اس بات کی قوی ترین دلیل ہے کہ شیخین نے تمام صحیح احادیث کی تخریج نہیں کرڈالی ہے،اورنہ ہی انھوں نے اس کا التزام کیا اورنہ اس کی صراحت کی ، بلکہ یہ بات بعض علماء کی جانب سے صحیحین اور شیخین کی بے جا قدردانی اوران کے ذاتی اجتہاد کا نتیجہ ہے،اوراس میں شک نہیں کہ صحیحین پوری تعظیم کی مستحق بھی ہیں،اس کا مطلب یہ نہیں کہ صحیحین (بخاری ومسلم) کے ماہر صحیحین کے معیار کی صحیح حدیثیں نہیں ہیں، ...... یہ صحیفہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ شیخین (بخاری ومسلم) جس حدیث کی تخریج پر متفق ہوں وہ ہمیشہ صحت کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی نہیں ہوتی'' (حدیث اورفہم حدیث ص:۱۷۷)

۲) دوسرے یہ کہ محدثینِ کرام نے حدیث کے صحیح ومعتبر ہونے کے سلسلہ میں جو شرائط وقیود مقرر فرمائے ہیں،خود ان شرائط وقیود کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ مخصوص اور قطعی حکم کی طرح ہیں یا پھر وہ اجتہادی واستنباطی مسئلہ ہے؟اس بارے میں خود ائمہ حدیث کی صراحت اور وضاحت ہے کہ کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینا، قطعی اور منصوص حکم نہیں بلکہ ایک اجتہادی معاملہ ہے، جیسے فقہاء کرام مسائل اوراحکام میں اجتہاد واستنباط کرتے ہیں ایسے ہی محدثینِ کرام حدیث کی درجہ بندی میں اجتہاد سے کام لیتے ہیں،اس لیے شرائطِ صحت میں خود محدثینِ کرام کے درمیان اختلاف ہے، چنانچہ علمِ حدیث کے بلند پایۂ استاذ اورممتاز صاحبِ علم حضرت مولانا عبد اللہ معروفی مدظلہٗ (استاذ شعبہ

تخصص فی الحدیث دارالعلوم دیوبند) اپنی کتاب ''حدیث اور فہم حدیث'' میں محقق کمال الدین ابن ہمام کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

......معلوم ہوا کہ راوی کے سلسلہ میں شرائطِ صحت کے وجود کا فیصلہ ایک امر اجتہادی ہے جس میں مجتہدین کا اختلاف ہوسکتا ہے، چنانچہ ایک مجتہد کے نزدیک ایک وصف ضروری قرار پاتا ہے تو دوسرا مجتہد اس وصف کو ضروری نہیں سمجھتا......اسی طرح ایک مجتہد کے نزدیک صحت کے لیے ایک وصف شرط ہوتا ہے تو دوسرے کے نزدیک وہ وصف شرط کے درجہ میں نہیں ہوتا، مثلاً بعض حضرات اتصال کو شرط قرار دیتے ہیں اور بعض نہیں، البتہ غیر مجتہد شخص یا جس کے اندر راوی کے (کو) پرکھنے کا ملکہ نہیں ہے وہ شیخین کے یا ان میں سے کسی ایک کے فیصلہ پر مطمئن ہوجائے گا......'' (ص:۱۷۶)

اس سے معلوم ہوا کہ احادیث کے صحیح و معتبر اور ضعیف ہونے کے سلسلہ میں محدثینِ کرام کی جو کچھ تحقیق و تفتیش ہے اس کا تعلق راوی سے ہے نہ کہ خود حدیث کے مضمون سے، اور یہ ایک اجتہادی معاملہ ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ راویوں کی تحقیق و تفتیش کے سلسلہ میں انتہائی درجہ کی عرق ریزی انسانی تاریخ میں محدثین کرام کا وہ عظیم الشان کارنامہ ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اور مذہب میں اس کی مثال صبحِ قیامت تک نہیں ملتی، اس کارنامہ کی بدولت ''اسماء الرجال'' کا مہتم بالشان فن دنیا میں متعارف ہوا، اس فن کے ذریعہ ۵/لاکھ افراد کا مکمل ڈاٹا محفوظ کردیا گیا ہے، سچی بات یہ ہے کہ محدثین کرام ہی کو اس کام کا حق تھا اور وہی اس کے اہل تھے، وَكَانُوا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا۔

محدثینِ کرام کے اس عظیم کارنامہ کا صحیح اعتراف اور اس کی سچی و حقیقی قدردانی یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ ان بلند پایہ ہستیوں نے حدیث کے صحیح یا ضعیف ہونے سے متعلق اپنے وضع کردہ اُصول وقواعد کی روشنی میں احادیث کو موضوع اور گھڑی ہوئی باتوں، جھوٹی وفرضی داستانوں اور ''داستان یوسف وزلیخا'' جیسی قصہ کہانیوں سے بالکل الگ کردیا، کھنگال کر رکھ دیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہوگیا، محدثین کرام کی سعی مسعود ومشکور کا ہرگز یہ مقصد ومنشاء نہیں تھا کہ صحیح اور ضعیف کے نام پر ذخیرۂ احادیث کو سرے سے ناقابل عمل بتادیا جائے، اور احادیث پر سے امت کے اعتماد و

بھروسہ کو ختم کر دیا جائے، جو لوگ ایسا خیال کرتے ہیں وہ در پردہ اور دیدہ و دانستہ محدثینِ کرام کے عظیم کام اور نام کا استحصال کرتے ہیں، انہیں تاریخ کی اس تلخ حقیقت کو سامنے رکھنا ہوگا کہ جن لوگوں نے حدیث کو صحیح اور ضعیف قرار دینے کے سلسلہ میں حد درجہ غلو اور مبالغہ کیا اور حدود سے تجاوز کیا انہوں نے انجام کار انکارِ حدیث کی دہلیز پر قدم رکھ دیا، اور اسلامی تاریخ میں وہ ''منکرینِ حدیث'' کہلائے۔

۳) تیسرے یہ کہ حدیث پر عمل کرنے کے لیے صرف اس کی سند کا صحیح اور معتبر ہونا کافی نہیں بلکہ حدیث کا مضمون زیادہ اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ بعض مرتبہ محدثین کرام کی اصطلاح کے مطابق حدیث صحیح اور اصح ہونے کے باوجود نا قابل عمل ہوتی ہے، مثلاً اللہ کے رسول ﷺ نے ایک جگہ غیر شادی شدہ زنا کار کے بارے میں سو کوڑوں کی سزا کے علاوہ ایک سال کی جلاوطنی کا بھی حکم فرمایا: انّ رسول اللہ امر فیمن زنیٰ ولم یحصن بجلد مأۃ وتغریب عام۔ (بخاری، شہادات، حدیث نمبر ۲۶۴۹) یہ حدیث صحیح بخاری میں ہے، اس لیے ہمارے غیر مقلد حضرات کے معیار کے مطابق یہ حدیث شک وشبہ سے بالاتر ہے، لیکن یہ روایت قرآن مجید کی آیت الزانی والزانیۃ فاجلدوا کل واحد منھما مأۃ جلدۃ۔ (النور: ۲) زانی مرد اور زانی عورت دونوں کی سزا سو کوڑے ہے، کی معارض ہے، قرآن میں زنا کی سزا سو کوڑوں کے ساتھ جلاوطنی کا حکم نہیں ہے، اس لیے فقہاءِ کرام نے درمیانی راہ نکالی کہ عمل تو قرآن کی آیت پر ہی ہوگا لیکن حدیث کو بھی بالکل نا قابل عمل نہیں رکھیں گے، یوں کہیں گے کہ حدیث کا حکم بطور سزا کے نہیں بلکہ بطورِ تعزیر وسیاست کے ہے، اگر حاکمِ وقت سو کوڑے سزا دینے کے بعد بھی معاشرہ کو غیر شادی شدہ زانی کے شر وفتنہ سے محفوظ رکھنے کے لیے اس کو ملک بدر (شہر بدر) کرنا ضروری اور بہتر سمجھتا ہے تو وہ یہ کام کر سکتا ہے۔ (مفہوم وخلاصہ کتاب ''حدیث وفہمِ حدیث، ص: ۳۴۲)

غرض یہ کہ حدیث کو قابل عمل رکھنے کے لیے اس کے مضمون کو سمجھنا، اس میں غور وفکر اور تدبر کرنا بہت ہی جانفشانی اور دماغ پاشی کا کام ہے، اس میں دیکھا اور پرکھا جاتا ہے کہ آیا اس حدیث میں ناسخ ومنسوخ، تاویل وتوجیہ، قرآن مجید، عقل سلیم اور سنتِ مشہورہ وثابتہ سے تعارض وتصادم کی کوئی

بات تونہیں ہے؟ یہ عظیم الشان کام فقہاء کرام کا ہے، جس طرح حدیث کی سند اور راوی سے متعلق تحقیقات میں ائمہ حدیث کا کوئی ثانی نہیں، اسی طرح درایتِ حدیث، حدیث کے مضمون کو جانچنے اور پرکھنے کے سلسلہ میں ائمہ فقہ کی کوئی مثال نہیں، فقہاءِ کرام کے اس عظیم الشان کام کے پس منظر میں علامہ حافظ ابن قیم کی تحریر خاص اہمیت رکھتی ہے، آپ اپنی مشہور کتاب ''اعلام الموقعین'' میں حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

''یعنی جب کسی شخص کے پاس کتابیں ہوں، جن میں مختلف احادیث رسول اللہ ﷺ درج ہوں اوران حدیثوں کے ساتھ متعلقہ مسئلہ میں صحابہ اورتابعین کا اختلاف بھی ہوتو اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ ان میں سے جس حدیث کو چاہے فتویٰ اور عمل کے لیے منتخب کرلے، تاوقتیکہ اہلِ علم (فقہاء) سے پوچھ کر یہ نہ معلوم کرے کہ ان میں کونسی حدیث لائق عمل ہے اورکون سی نہیں، تاکہ صحیح حکم شرعی پر عمل پیرا ہوسکے۔(۱/ ۴۴بحوالہ حدیث اورفہم حدیث،ص:۳۴)

۴) صحیح اور معتبر احادیث کے سلسلہ میں اس طرح کی فنی اوراصولی باتوں سے ہٹ کر نصح وخیروخواہی کے پہلو سے بھی سوچنے کی ضرورت ہے، ہم سنجیدگی سے غور کریں کہ اسلام عالمی وآفاقی مذہب ہے، لیکن اگر پورے ذخیرۂ حدیث کوصرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم تک محدود کردیا جائے اوراسی کوصحیح وقابلِ عمل مانا جائے تو اسلام کی عالمیت وآفاقیت کا یہ روشن اورقابل فخر پہلوکیا باقی رہ سکتا ہے؟؟ کیونکہ کسی چیز کے عالمی وآفاقی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسی طرح کی کمی اورتشنگی نہ ہواور یہ حقیقت ہے کہ صحیح بخاری اورصحیح مسلم میں تمام صحیح احادیث کا اندراج نہیں ہے، زندگی کی رہنمائی اوررہبری سے متعلق اہم اورضروری احادیث دوسری کتابوں میں ہیں، اب اگرعمل واتباع کے لیےصرف بخاری ومسلم کی احادیث کا پابند بنادیا جائےتو زندگی گذارنے کےسلسلہ میں اسلام کی رہنمائی محدود ہوکررہ جائے گی اوردین کے کامل ومکمل ہونے کا تصور غلط قرار پائے گا۔

دوسرے یہ کہ مذاہب اورادیان کے مقابلہ میں اسلام کا طرۂ امتیاز یہ بھی ہے کہ وہ ایک محفوظ دین ہے، گذشتہ آسمانی مذاہب اورشریعتوں کی طرح اس میں من مانی تبدیلیاں نہیں ہوئیں، خود باری

تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اب اگر صرف بخاری ومسلم کی احادیث کو صحیح اور قابل عمل مانا جائے تو بالواسطہ طور پر تسلیم کرنا پڑے گا کہ اسلامی تعلیمات اور احکام کا ایک محدود حصہ ہی محفوظ ہے باقی دین وشریعت کا بڑا سرمایہ انسانوں کی دستبرد اوران کے رد وبدل کا شکار ہوگیا، اس طرح اسلام کی امتیازی فضیلت اور خصوصیت ختم ہوجاتی ہے۔

تیسرے یہ کہ سہولت وآسانی اسلام کا خاص امتیازی پہلو ہے، قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: **لا اکراہ فی الدین**، دین میں جبر اور زبردستی نہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے: **الدین یسر** دین آسان ہے، ایک جگہ آپ ﷺ نے تعلیم دی کہ آسانی پیدا کرو، مشکل میں مت ڈالو، خوشخبری سناؤ، نفرت مت دلاؤ: **یسروّا ولا تعسروا بشروا ولا تنفروا** دین وشریعت میں سہولت وآسانی کا نتیجہ ہے کہ مسلمان مجبوری اور معذوری کے موقع پر اپنے خاص مسلک کی رائے کے خلاف عمل کرسکتا ہے، اور دبستانِ فقہ کے دوسرے ائمہ کرام کی رہنمائی کو وہ قبول کرسکتا ہے، اس طرح ماہر علماء ومفتیان کرام کی اجازت سے عبوری راحت اس کو ملتی ہے، اس کے برخلاف ذخیرۂ حدیث کو صرف بخاری ومسلم میں محدود کردینے سے اسلامی تعلیمات اور احکام میں سہولت وآسانی کا یہ پہلو باقی نہیں رہے گا، شریعت کی پیروی کرنے والے پر ایک نئی پابندی عائد ہوگی، اور یہ اس کے لیے تنگی اور حرج کا سبب ہوگی، جب کہ اللہ تعالیٰ نے دین میں تنگی وحرج کو نہیں رکھا ہے: **ما جعل علیکم فی الدین من حرج**۔ (المائدۃ)

پس خلاصہ کلام اور پیغام یہی ہے کہ حدیث پر اس نیت اور جذبہ کے ساتھ عمل ہو کہ وہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک عمل اور طریقہ ہے، اگر حدیث پر اس وجہ سے عمل ہو کہ امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے اس کو اپنی کتابوں میں درج کیا ہے، وہ گویا حدیثِ رسول ﷺ پر نہیں بلکہ ان دونوں بزرگوں کی تحقیق پر عمل پیرا ہے، ایک صحیح العقیدہ اور سلیم الفکر مسلمان کے لیے حدیث بہرحال حدیث ہے، چاہے وہ صحیح بخاری ومسلم میں ہو یا دیگر مستند اور معتبر کتابوں میں ہو، اس کا مطمحِ نظر اور منتہائے مقصود عمل رسول ﷺ کی پیروی ہے، اس کو وہ اپنی سعادت مندی اور خوش نصیبی سمجھتا ہے، ہر دور میں یہی سلفِ صالحین کا شیوہ وشعار رہا، دین سے دوری، شریعت سے بے رخی اور نفسانی خواہشات کی پیروی کے اس ماحول میں عقائد واعمال کی صحت وسلامتی کا معیار بھی یہی ہے۔

دینی مدارس اور علماء سے متعلق
اظہارِ خیال میں عدل واعتدال کی ضرورت

زبان وقلم اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ انمول نعمت ہے، یہ نعمت انسان کے اندرونی جذبات واحساسات کے اظہار کا مؤثر ذریعہ ہے، قرآن مجید میں بطورِ نعمت زبان وقلم کا ذکر ہے: خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ (الرحمن: ۳) اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو اظہارِ خیال کا سلیقہ بھی سکھلایا، ایک جگہ ارشاد ہے: عَلَّمَ بِالْقَلَمِ قلم کے ذریعہ تعلیم دی، پھر یہ کہ محض کسی نعمت کا ملنا کمال نہیں بلکہ اس کے طریقۂ استعمال اور محلِ استعمال سے بھی واقف ہونا ضروری ہے، اس کا علم نہ ہونے پر نعمت آدمی کے لیے مصیبت بلکہ بعض مرتبہ تازیانۂ عبرت بن جاتی ہے، مثلاً یہی زبان وقلم کے ذریعہ اظہارِ خیال کی صلاحیت، اگر اس سے کسی کی دل آزادی ہو، کسی کی حق تلفی ہو، کسی کی توہین اور تحقیر ہو تو یہ اس نعمت اور صلاحیت کا غلط اور بے جا استعمال ہے۔

عام طور پر اظہارِ خیال کی صلاحیت کا مصرف اور اس کا موقع ومحل صرف دو ہی چیزیں ہوتی ہیں، موافقت یا مخالفت، عربی زبان کا محاورہ ہے: حبک الشي يعمي ويصم، کسی چیز کی محبت تجھے اندھا اور بہرا کر دیتی ہے، بالکل اسی طرح حد سے زیادہ کسی چیز کی ضرورت، اہمیت، افادیت کا احساس یا کسی طبقہ کی اندھی مخالفت آدمی کو گونگا اور بہرا کر دیتی ہے، حقیقت وسچائی اس کی نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، عدل وانصاف کی باتوں کو یہ سنی اَن سنی کر دیتا ہے، غرض اظہارِ خیال کا موقع اور موضوع موافقت کا ہو کہ مخالفت کا، ہر منصف مزاج اور سلیم الفکر صاحبِ قلم کو عدل واعتدال کا دامن تھامے رکھنا چاہیے، قرآن مجید کا فرمان ہے: وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا جب تم کوئی بات کہو تو انصاف

کی کہو۔ اور ایک جگہ حکم ہے: وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَن لَّا تَعْدِلُوْا کسی قوم کی دشمنی یا طبقہ کی مخالفت اتنی نہ بڑھ جائے کہ تم ان کے ساتھ ناانصافی کر بیٹھو۔

اظہارِ خیال میں عدل یہ ہے کہ اپنی بات انصاف وسچائی پر مبنی ہو، اور اعتدال یہ ہے کہ موضوع بحث میں جو چیز قابل تنقید ہے اس پر اتنی تنقید کی جائے جتنی کی ضرورت ہے اور جس کی وہ مستحق ہے، تنقید میں بہت زیادہ جذباتیت بلکہ جارحیت قلم کو راہِ اعتدال سے ہٹا دیتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں جو'' لکھا پڑھا''—— ''پڑھا لکھا'' نہیں، اس لیے کہ یہ طبقہ پڑھتا کم لکھتا زیادہ ہے،—— دانشور طبقہ ہے، مذہبی موضوعات بالخصوص علماء اور مدارس کے تعلق سے اس کی تحریریں اور تقریریں عادلانہ، منصفانہ، عالمانہ اور شریفانہ تو بہت دور کی بات انتہائی عامیانہ، سوقیانہ بلکہ جارحانہ اور ظالمانہ ہوتی ہیں، ہمارے دانشور حضرات کا سب سے بڑا سانحہ (وسیع معنوں میں ہم اس کو المیہ بھی کہہ سکتے ہیں) یہ ہے کہ وہ جب عصری موضوعات معاشیات، فلکیات، سائنس وغیرہ پر بولتے اور لکھتے ہیں اس کے لیے بھرپور تیاری کرتے ہیں، موضوع سے متعلق اپنا بہترین جائزہ اور تجزیہ پیش کرتے ہیں، پوری گفتگو نپی تلی، سنجیدہ اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے، لیکن موقع جب مذہبی مسائل کا ہو اور شوءِ قسمتی سے موضوع علماء اور مدارس ہو تو ان کی طرزِ گفتگو اور اندازِ تحریر بالکل بدل کر رہ جاتا ہے، پوری تحریر اور تقریر کا خلاصہ، لبِ لباب چند رٹے رٹائے جملے اور سنی سنائی باتیں ہوتی ہیں۔

مؤرخہ ۹ر ستمبر ۲۰۱۱، روزنامہ منصف کے مذہبی سپلمینٹ مینارۂ نور میں ایک مضمون شائع ہوا، مضمون کا بنیادی مقصد ماہِ رمضان کی ناقدری کے سلسلہ میں مسلمانوں کی غلطیوں اور غفلتوں کو واضح کرنا تھا، اس کے لیے فاضل مضمون نگار نے دینی مدارس اور علماء پر تنقید کرنا ضروری سمجھا، اس مضمون میں علماء اور مدارس کے تعلق سے بیان کردہ باتوں میں عقل کا قتل، عدل کو بے دخل اور اعتدال کو پامال کر دیا گیا، مثلاً:

۱) ایک جگہ انھوں نے نمازِ تراویح میں قرآن مجید کی تلاوت میں حفاظِ کرام کی عجلت وجلد بازی کا ذکر کیا اور اس کی وجہ سے ہو رہی قرآن مجید کی بے حرمتی میں دینی مدارس کو شریک بتایا، انھوں نے لکھا:

''رمضان کریم کی یہ درد بھری شکایت ان تعلیمی اداروں اور دینی مدارس سے بھی ہے کہ جہاں حفاظ کرام تیار کئے جاتے ہیں، کیوں کہ کلام اللہ کی بے حرمتی کے ذمہ دار صرف حفاظِ کرام ہی نہیں ہوتے بلکہ کلام اللہ کی بے حرمتی میں تعلیمی ادارے اور دینی مدارس اپنی ناقص تربیت کی وجہ سے برابر کے شریک ہوجاتے ہیں۔''

اس معاملہ میں قصور دینی مدارس کا نہیں بلکہ اصل مسئلہ عوامی مزاج اور رجحان کا ہے، دینی مدارس میں تجوید اور مخارجِ حروف کی صحیح ادائیگی پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے، لیکن ماہِ رمضان میں حفاظِ کرام پر دینی مدارس کی اس سالہا سال کی تربیت ومحنت کو عوام اپنی بدذوقی اور غلط رجحان کی وجہ سے بگاڑ دیتے ہیں۔ عوام کا دباؤ رہتا ہے کہ کم سے کم وقت میں حافظ صاحب نماز تراویح کو نمٹا دے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ جن مساجد میں تیز رفتاری کے ساتھ زیادہ قرآن مجید پڑھا جاتا ہے اور جلدی ختم کیا جاتا ہے، وہاں عوام کی تعداد زیادہ رہتی ہے، برخلاف جہاں سکون واطمینان کے ساتھ روزآنہ صرف ایک پارہ کی تلاوت ہوتی ہے، وہاں بہت ہی کم لوگ شریک ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ ہم کو یہ بھی دیکھنا اور سوچنا چاہیے کہ جن مساجد میں سکون واطمینان اور آرام و راحت کے ساتھ نمازِ تراویح ادا کی جاتی ہے وہاں کے امام اور حافظ صاحب بھی تو کوئی کانویٹ اسکول اور سعودی عرب کے شعبۂ تحفیظ کے تربیت یافتہ نہیں ہوتے، وہ بھی تو ان دینی مدارس کے تیار کردہ ہوتے ہیں، اگر واقعۃً تربیت ناقص ہوتی تو یہ چند گنے چنے حفاظ کرام بھی بہت عجلت میں قرآن مجید کی تلاوت کرتے، پس رمضان کی دردبھری شکایت عوام سے ہونی چاہیے، نہ کہ دینی مدارس سے ؎

الزام دوسروں کو دیتے رہے، قصور اپنا نکل آیا

۲) ایسا لگتا ہے کہ فاضل مضمون نگار نے عام مسلمانوں کی غفلت وکوتاہی سے متعلق رمضان کی دردبھری شکایت کم کی ہے، علماء اور دینی مدارس کے خلاف اپنے دل کی بھڑاس زیادہ نکالی ہے۔

یہ ایک واضح اور روشن حقیقت ہے کہ عام مسلمانوں میں دینی شعور بیداری اور دین سے وابستگی کا اصل کارنامہ اور بنیادی حصہ دینی مدارس کا ہے، مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے بقول: مدارس آدم گری اور مردُم سازی کی فیکٹری ہے، یہاں سے ملتِ اسلامیہ کو ہر میدان میں افرادِ

کارفرا ہم ہوتے ہیں، یہ مدارس جہاں مسلم معاشرہ کو بہترین خطیب، امام اور واعظ فراہم کرتے ہیں وہیں بلند حوصلہ اور بلند ہمت دین کے داعی اور مبلغ بھی تیار کرتے ہیں، جو اسلام کی فکری اور نظریاتی سرحدوں پر گمراہ تحریکوں اور باطل فرقوں سے برسر پیکار رہتے ہیں، ان ہی مدارس سے دینی و ملی تنظیموں اور جماعتوں کو اعلیٰ دماغ قائد اور بے لوث خادم ملتے ہیں، اگر حقیقت وسچائی کی نظر سے دیکھا جائے تو سیاسی، سماجی، رفاہی خدمات اور معاشی نظام میں بھی آپ فضلاءِ مدارس کو سرگرم پائیں گے، قصہ مختصر یہ کہ ؎ ''بہار جو دنیا میں آئی ہے، یہ پودا ان ہی کی لگائی ہوئی ہے''

پہلے دنوں میں عام مسلمان علماء اور اہل مدارس کی باتوں کو سنی ان سنی کر دیتے تھے، صرف وعظ ونصیحت کے طور پر لیتے تھے، لیکن موجودہ اسلام مخالف ماحول نے انھیں علمائے اسلام کی باتوں پر سنجیدگی سے سوچنے پر مجبور کر دیا، انھیں اپنی مذہبی شناخت کا احساس اور ملّی تشخص و امتیاز کا ادراک ہونے لگا، حوادثِ زمانہ نے انھیں یہ ماننے پر مجبور کیا کہ ''جنہیں ہم نے دیوانہ سمجھتے تھے، وہی فرزانہ کہلائے''

موصوف نے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مرحوم کے حوالہ سے بتایا کہ:

''بھارت میں اس وقت سیاسی اور مذہبی اعتبار سے علماء کا اثر ورسوخ نہ ہو نے کے برابر ہے۔''

ڈاکٹر صاحب مرحوم کی یہ بات اگر حقیقتِ واقعہ ہوتی تو انتخابات کے موقع پر سیاسی لیڈران علماءِ کرام کے دروازوں پر دستک نہیں دیتے، ان کی تائید وحمایت کرنے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کرتے، آسام میں ایک مولوی (مولانا بدرالدین اجمل) نے کانگریس حکومت کی کھٹیا کھڑی کر دی، یوپی میں علماء کونسل کے قیام کے بعد وہاں کی بڑی سیاسی جماعتیں ایک انجانے خوف میں مبتلا ہے، اسی طرح مذہبی اثر ورسوخ کی بات ہے، مسلمان اپنے مسائل میں برابر علماء کرام سے رجوع ہوتے ہیں، رات دیر گئے فون پر سوالات کا سلسلہ جاری رہتا ہے، قوم کے بے لوث خادم اور مخلص رہنما وقائد کی حیثیت سے علماءِ کرام انہیں ہمیشہ دستیاب رہتے ہیں، وہ ڈاکٹر، وکلاء اور دیگر پروفیشنلس کی طرح کوئی ''مشورہ

فیس'' بھی نہیں لیتے۔

آدمی کسی بھی شخص کی بات کو قبول کرنے اور رد کرنے کا مجاز ومختار ہے، لیکن رد وقبول کا کوئی معیار اور پیمانہ تو ہونا چاہیے، بہر حال یہ آپ کا اپنا ''حسن معیار'' ہے کہ بیرون ملک کے مہمان عالم دین کے چند روزہ سفر کے سرسری اور خلافِ واقعہ جائزہ وتبصرہ کو آپ اہمیت دیتے ہیں اور شمعِ فروزاں کے کالم نگار، ملکی اور عالمی حالات کے نہ صرف واقف کار بلکہ بہترین تجزیہ نگار قوم وملت کے نبض شناس حضرت الاستاذ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی صاحب کے معقول اور مبنی بر حقیقت تحریر کو نظر انداز کرتے ہیں، علماء بے زار عام تعلیم یافتہ نوجوان نہیں ہیں، بلکہ جنھیں جدیدیت کا نشہ دو آتشہ کیا ہے اور جو اسلام کو اپنی خزاں رسیدہ عقل کے مطابق سمجھنا چاہتے ہیں، جو وقت اور حالات کے تقاضوں کی دہائی دے کر اپنی اباحیت پسند طبیعت کی وجہ سے قانونِ شریعت کو ''موم کی ناک'' بنائے رکھنا چاہتے ہیں، یہی مٹھی بھر لوگ علماء سے بے زار ہوتے ہیں، بادی النظر میں علماء بے زار دین بے زار طبقہ ہوتا ہے، اس لیے ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کو معزز ومحترم بنایا ہے ویسے ہی اس کے نزدیک اس دین کے جاننے والے اہل علم بھی قابل اعزاز اور لائق اکرام ہیں، اس لیے کہ ایک مسلمان اگر کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر لے، اعلیٰ تعلیم کی ڈگری اس کے پاس کیوں نہ ہو، بڑے سے بڑے عہدہ پر وہ فائز ہو جائے، اگر اس میں مسلمانیت کی رمق باقی ہے وہ علماء سے بے زار تو کجا بے نیاز نہیں رہ سکتا۔

۳) فاضل مضمون نگار نے علماءِ کرام کے بارے میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مرحوم کے حوالہ سے لکھا ہے:

> ''دینی مدارس کے قیام کے نام سے خوب چندہ اکٹھا کرتے ہیں، جو لاکھوں اور کروڑوں تک بھی جاتا ہے، اس میں سے اپنا چالس فیصد کفاف کے نام پر ذاتی خرچ کے لیے نکال لیتے ہیں اور عالی شان کاروں میں گھومتے ہیں اور وہ بھی کاریں فینانس پر خریدی جاتی ہیں، جس کی اقساط میں سود بھی

ادا کی جاتی ہے،شاندار مکانوں میں رہتے ہیں،وغیرہ........''

ڈاکٹر صاحب مرحوم تو اس دنیا میں نہیں رہے،ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد ہے،لیکن فاضل مضمون نگار نے جس عقیدت اور جس وثوق اور اعتماد کے ساتھ اقتباس نقل کیا ہے،موصوف سے ضرور یہ دریافت کرنے کو جی چاہتا ہے کہ:

الف) کیا انھوں نے علماء کی خریدی ہوئی عالیشان کاروں کے کاغذات دیکھے ہیں، جس سے معلوم ہو کہ یہ کار فینانس پر خریدی گئی ہے۔

ب) کیا وہ دستاویزی ثبوت کے ساتھ بتا سکتے ہیں کہ ان کاروں کی اقساط میں وہ کتنا سود ادا کرتے ہیں؟

ج) موصوف کے نزدیک عالیشان کاروں،اور شاندار مکانوں کا کیا معیار رہے؟ اس لیے کہ ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ ایک عالم دین نے سیکنڈ ہینڈ کار خریدی اور سلیقہ سے اپنا چھوٹا سا ذاتی خوبصورت مکان بنایا تو ناقدین کی نگاہ میں یہ عالیشان کار اور شاندار مکان ہو گیا۔

یاد رکھئے کسی فرد یا طبقہ (بالخصوص جس کی اپنی ایک حیثیت عرفی ہو) سے متعلق سنی سنائی باتوں اور ہوائی تبصروں کو کہنے اور لکھنے سے حد درجہ احتیاط ہی نہیں بلکہ اجتناب کرنے کی ضرورت ہے،رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے کہ **کفی بالمرء کذبا ان یحدث بکل ما سمع**۔فاضل مضمون نگار نے ڈاکٹر صاحب مرحوم کے ان تأثرات پر حیرت کا اظہار کیا ہے،لیکن حیرت اس معنی پر ہونی چاہیے کہ ڈاکٹر صاحب جیسی صاحبِ علم وفہم شخصیت نے اس طرح کی بے بنیاد باتوں کو کیسے اپنے تأثرات میں جگہ دی؟

اس طرح کی باتوں کے صحیح یا غلط ہونے سے قطع نظر ہمیں اپنی بیمار اور پست ذہنیت کا علاج کروانے کی ضرورت ہے،علماءِ کرام کے تعلق سے قوم کی اکثریت کی ذہنیت اور سوچ یہ ہے کہ یہ طبقہ بالکل پھٹیچر حالت میں رہے، بوسیدگی، خستہ حالی اور پراگندگی ان کی پہچان بنی رہے، ہر شخص

کہتا پھرتا ہے کہ فلاں عالم دین کیا تھے؟ شروع شروع میں ان کے پاس صرف سائیکل تھی، لونا تھی ،اب وہ موٹر نشین ہو گئے،اس طرح کی سوچ رکھنے والوں کو خود اپنی ترقی اور خوشحالی کا جائزہ بھی لینا چاہیے،وہ بھی تو کوئی خاندانی نواب اور جاگیردار نہیں تھے،نہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے،ان کا ضمیر (اگر زندہ ہو تو) جانتا ہے کہ کتنے گھوٹالوں اور گھپلوں کے بعد وہ دولت مند بنے ہیں،پس جب خالص دنیا کمانے اور دنیا بنانے والوں کو ان کی محنت ومشقت پر اللہ تعالیٰ نوازتا ہے تو وہ اپنے دین کی خدمت کرنے اور اس راہ میں قوم کی کڑوی کسیلی سننے کے صلہ میں علماء کو ترقی وخوشحالی سے کیسے محروم رکھ سکتا ہے؟؟

۴) سلفِ صالحین کی زندگیاں اس پر گواہ ہیں کہ ان پر ابتدائی حالات بہت تنگ اور تلخ تھے، ان بزرگوں نے بڑی آزمائشیں اٹھائیں، مشقتیں جھلیں،تب ان کی زندگی کے آخری ایام میں فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا۔

حدیث کے مشہور راوی ،مدرسۃ الصفہ کے نامور فاضل صحابیِ رسول حضرت ابو ہریرہ ؓ کی ابتدائی زندگی فاقہ مستی کی تھی ،کئی کئی دن آپ ؓ بھوکے رہتے تھے،بھوک کی وجہ سے بے ہوش ہو کر راستہ میں گر جاتے ،لوگ سمجھتے کہ آپ ؓ کو مرگی کا دورہ پڑا ہے، پھر ایک دور وہ بھی آیا کہ آپ ؓ ریشمی رومال سے اپنی ناک صاف کرتے تھے۔مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کے حالات ِزندگی میں ہے کہ ابتداء میں آپؒ کی گزر بسر بہت مشکل سے ہوا کرتی تھی ،حتی کہ ایک مرتبہ سیرت النبی کتاب خریدنے کے لیے آپ کو اپنے ہاتھ کی گھڑی فروخت کرنی پڑی، پھر ایک دور ایسا بھی آیا کہ آپؒ پر ایوارڈوں کی بارش ہونے لگی ،عالمِ اسلام کا سب سے بڑا شاہ فیصل ایوارڈ آپؒ کو ملا، دنیا جہاں کی دولت آپؒ کے قدموں میں آ گئی ،خود ہمارے اس ریاست کے مشہور واعظ اور مصلح حضرت مولانا محمد حمید الدین عاقل حسامیؒ کی شخصیت ہے،آپ اپنی زندگی میں بیل گاڑیوں اور لال بس کے ذریعہ دور دراز دیہاتوں کا سفر کیا کرتے تھے، پھر ایک طویل جدوجہد،محنت ومشقت ،مجاہدہ اور آبلہ پائی کے بعد بفضل خداوندی خوبصورت اور شاندار قیمتی گاڑی آپ کی زندگی میں آئی ،لیکن کیا اس

گاڑی کے ملنے کے بعد آپ کی دینی جد وجہد کا انداز اور رخ تبدیل ہو گیا؟ نہیں، جو لوگ مولانا کے تبلیغی ودعوتی اسفار میں شریک رہے وہ ضرور اس بات کے چشم دید گواہ ہیں کہ جن پسماندہ اور مخدوش دیہاتوں کو آپؒ بیل گاڑی اور لال بس کے ذریعہ پہونچا کرتے ان دیہاتوں کو وہ اس نئی گاڑی سے بھی تشریف لے جاتے، عین بڑھاپے اور کمزوری میں بھی آپؒ اصلاحی مواعظ کے لیے سفر فرماتے۔

پس اگر علماءِ کرام کے پاس ''عالی شان کار'' ہوتی بھی ہے تو وہ سیر وتفریح کے لیے نہیں ہوتی بلکہ اس کا مصرف اور محل استعمال بھی دین وملت کی خدمت ہوتی ہے، انہیں جب جیسی سہولت میسر ہوئی اس سہولت کو انہوں نے دین کی دعوت کے لیے استعمال کیا، چاہے سہولت سائیکل اور لونا کی ہو یا عالی شان کار کی .... غالباً کسی بزرگ نے بہت پتہ کی بات کہی کہ جو آدمی اللہ والوں کی صرف انتہاء کو دیکھتا ہے، ابتداء کو نہیں دیکھتا، وہ ان کے تعلق سے غلط فہمی اور بدگمانی میں مبتلاء رہتا ہے۔

۵) ہم میں ایک بڑی کمزوری اور کمی یہ بھی ہے کہ کسی مسئلہ پر اظہارِ خیال کے وقت ہم اپنی شخصیت کے خول سے نہیں نکلنا چاہتے، کسی بات کو سمجھنے کے لیے ہم صرف اپنی شخصیت کو سامنے رکھتے ہیں، دوسروں کو اپنے اوپر قیاس کرتے ہیں کہ ہم جیسے ہیں دوسرے بھی ویسے ہی ہوں گے، مثلاً یہی بات کہ علماء ''عالیشان'' کاروں میں گھومتے ہیں، اس کو اس پہلو سے بھی سوچا جا سکتا ہے کہ دنیا میں دین واہل دین کے قدردانوں کی کمی نہیں، دین کی نسبت سے علماء کو چاہنے والے اور ان سے محبت کرنے والے بھی موجود ہیں، جو انہیں موقع بہ موقع ہدایا وتحائف پیش کرتے رہتے ہیں، ہر شخص اپنی حیثیت اور گنجائش کے مطابق اپنی سعادت سمجھ کر علماء کی خدمت میں ہدیہ وتحفہ پیش کرتا ہے، ان ہدایا وتحائف میں قلم سے لے کر کار بھی شامل ہوتی ہے، ایسے علماء کرام کی مثالیں موجود ہیں کہ دینی مزاج کے حامل دولت مند لوگ اپنی قیمتی اور شاندار کاریں ان کے پیچھے لیے پھرتے ہیں کہ کم سے کم یہ عالمِ دین تبرکاً ہی سہی تھوڑی دیر میری گاڑی میں بیٹھ جائے، حضرت مولانا مفتی محمود الحسنؒ دار العلوم دیوبند کی چھتہ مسجد میں قیام فرماتے، جب سفر کا ارادہ ہوتا تو مریدین اور متعلقین کے کاروں کی قطار لگ جاتی، دیکھنے والوں کو محسوس ہوتا کہ یہ کسی مولوی کا نہیں وزیر اعلیٰ یا کسی منسٹر کا قافلہ جا رہا ہے۔ عارف

باللہ حضرت قاری صدیق صاحب باندویؒ کا حال یہی رہا، جہاں آپ تشریف لے جاتے آپ کے محبین ومخلصین اپنی چمچماتی کاریں لے کر حاضر ہوجاتے، ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ حضرت میری گاڑی میں سوار ہوں، حضرت باندویؒ ان تمام کا دل رکھنے کے لیے ہر تھوڑی دور پر کار تبدیل فرماتے......... پس ضروری نہیں کہ اگر آپ علماء پر نہ خرچ کرتے ہوں تو دوسرے لوگ بھی آپ کی طرح قدر ناشناس ہوں گے!

۶) علماء کی ترقی وخوشحالی کے تعلق سے دانشوران کی بدگوئی اور بدگمانی نا قابل فہم ہے، اس لیے کہ ترقی وخوشحالی پر کسی کی اجارہ داری نہیں، پھر آخر کیوں ان سے علماء کی خوش حالی دیکھی نہیں جاتی؟

غور کرنے پر یہ ایک نفسیاتی بیماری اور کمزوری معلوم ہوتی ہے، دانشوران خیال کرتے ہوں گے کہ میں نے اپنی اعلیٰ تعلیم پر لاکھوں پیسے خرچ کئے، اعلیٰ منصب مجھے حاصل ہے، بڑی تنخواہ تمام سہولیات ومراعات واعزازات کے ساتھ میں پاتا ہوں، لیکن اس کے باوجود سماج میں میرا خاص اعزاز واکرام اور اثر ورسوخ نہیں، مگر یہ بے چارہ مکتب کا مولوی، دو رکعت کا امام، جو زکوٰۃ کی رقم سے پڑھا اور پلا ہو، آج بھی اس کی تنخواہ بہت معمولی ہے، لیکن اس کی زندگی میری زندگی کے مقابلہ میں بہت پرسکون ہے، اس کے اپنے ٹھاٹ باٹ ہیں، عالی شان کاروں میں یہ گھومنے لگا ہے، اب تو نئی ٹیکنالوجی، لیاپ ٹاپ وغیرہ بھی یہ استعمال کرنے لگا ہے، غرض یہ کہ اس طرح کی باتیں سوچ سوچ کر یہ جل بھن کر کباب بنے جاتے ہیں............ دانشور اگر دانشمندی سے کام لیں تو خود ان پر یہ حقیقت آشکارا ہوگی کہ اس ٹھاٹ باٹ اور بہتر طرزِ زندگی میں عالم دین کی شخصیت کا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ یہ صرف اور صرف دین اور علم دین کی نسبتِ کا اعزاز ہے، مشہور مقولہ ہے: من کان اللہ کان اللہ لہ جو اللہ کا ہوگیا اللہ اس کا ہوگیا۔

۷) علماءِ دین کی ترقی وخوشحالی سے متعلق دانشواران کی اس سوچ وذہنیت سے ان کے دورُخا پن اور دوغلا پن کا بھی اظہار ہوتا ہے، مثلاً: ہمارے یہ نام نہاد دانشوران دینی مدارس میں عصری تعلیم کا نظم کرنے پر اس لیے زور دیتے ہیں کہ دینی مدارس کے فارغین اور فضلاء معاشی طور پر خوشحال اور فارغ

البال رہیں، لیکن یہی طلبۂ مدارس تعلیم کی تکمیل پر اپنی ذمہ داریوں کوسنبھالتے ہیں اور اپنے طرز زندگی کو کچھ بہتر بناتے ہیں، تو یہ چیز ان دانشوران کو ذرّہ برابر نہیں بھاتی، طنزوتعریض اور تنقید کے تیرونشتر چلاتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں کہ یہ چندہ کا دھندہ ہے، کفاف کی آمدنی ہے وغیرہ۔ نیز جن مساجد کی کمیٹیوں کے یہ ذمہ دار ہوتے ہیں وہاں برسر خدمت ائمہ وعلماء کو بہت معمولی تنخواہیں ادا کرتے ہیں، حالانکہ وہ خود لاکھوں کی تنخواہ اور وظیفہ اٹھانے کے باوجود کمرتوڑ مہنگائی کا رونا روتے ہیں، لیکن ائمہ مساجد کو تنخواہیں ادا کرتے وقت مہنگائی کے متعلق ان کی شعوروآگاہی بے حسی میں بدل جاتی ہے۔

علماء برادری کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے راقم سطور کو اس کا احساس ہے کہ مذہب وملت کو سب سے زیادہ نقصان اس طبقہ کی کالی بھیڑیوں (علماءِ سوء) سے پہونچا، لیکن اس کے ساتھ بجا طور پر اس کا بھی ادراک ہے کہ منافق قسم کے دانشورانِ قوم نے دین وشریعت کو اس سے کم نقصان نہیں پہنچایا، یہ لوگ نہ سچے اور مخلصانہ انداز میں اسلام کی موافقت کرتے ہیں اور نہ صحیح ڈھنگ سے اسلام کی مدافعت کرتے ہیں، یہ لوگ ان سپاہیوں کی طرح ہوتے ہیں جو عین حالتِ جنگ میں دشمن کی فوج سے جا ملتے ہیں، نہ صرف جاملتے ہیں بلکہ حملے کے دوران جو ہتھیار دشمن سے چھوٹ جاتے ہیں انھیں اٹھا اٹھا کر دشمن کے ہاتھ میں دیتے ہیں۔

آخری بات

۱) کوتاہیاں ہر طبقہ میں ہوتی ہیں، ڈاکٹرس میں، انجینئرس میں، وکلاء میں، لیکن ان کی خامیوں، خرابیوں اور بدنامیوں کو نظرانداز کیا جاتا ہے، ان کی پیشہ ورانہ حیثیت کے مطابق انھیں ان کا مستحقہ مقام ومرتبہ دیا جاتا ہے، ان کی ''حیثیت عرفی'' کا لحاظ رکھا جاتا ہے، ان کی توہین وتحقیر نہیں کی جاتی، ضرورت ہے کہ اسی طرح کا معاملہ اور سلوک علماء کے ساتھ بھی ہو۔

۲) دو باتوں میں اپنی بیمار اور نہایت پست ذہنیت کو فی الفور بدلنا ضروری ہے، ایک یہ کہ علماء دین بالکل پھٹے پرانے کپڑوں، کم تر سواریوں اور خستہ حال مکانوں مین رہیں، دوسرے یہ کہ سماج کی ہر غلطی اور ہر برائی علماء کے کھاتہ اور دینی مدارس کے خانہ میں ڈالی جائے۔

خدا کرے کہ علماء اور مدارس کے متعلق اظہار خیال کے سلسلہ میں ان چند معروضات سے دانشوران کے فکر ونظر میں حقیقت، معقولیت اور انصاف پسندی کے دیے روشن ہوں اوران کے ذہن ودماغ سے شکوک وشبہات کی کانٹیاں ختم ہوں اور بدگمانی وبدگوئی کی خاردار جھاڑیاں صاف ہوں۔ قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلاً۔

علماءِ کرام کے تعلق سے قوم کی اکثریت کی ذہنیت اور سوچ یہ ہے کہ یہ طبقہ بالکل پھٹیچر حالت میں رہے، بوسیدگی، خستہ حالی اور پراگندگی ان کی پہچان بنی رہے، ہر شخص کہتا پھرتا ہے کہ فلاں عالم دین کیا تھے؟ شروع شروع میں ان کے پاس صرف سائیکل تھی، لوناتھی، اب وہ موٹرنشین ہو گئے، اس طرح کی سوچ رکھنے والوں کو خود اپنی ترقی اور خوشحالی کا جائزہ بھی لینا چاہیے، وہ بھی تو کوئی خاندانی نواب اور جاگیردار نہیں تھے، نہ سونے کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوئے، ان کا ضمیر (اگر زندہ ہوتو) جانتا ہے کہ کتنے گھوٹالوں اور گھپلوں کے بعد وہ دولت مند بنے ہیں، پس جب خالص دنیا کمانے اور دنیا بنانے والوں کو ان کی محنت ومشقت پر اللہ تعالیٰ نوازتا ہے تو وہ اپنے دین کی خدمت کرنے اور اس راہ میں قوم کی کڑوی کسیلی سننے کے صلہ میں علماء کو ترقی وخوشحالی سے کیسے محروم رکھ سکتا ہے؟؟

تحقیقِ آدم بہ جواب تخلیقِ آدم

کیا انسان خودرَو پودوں کی طرح پیدا ہوا ہے؟؟

مورخہ ۱۲/ستمبر ۲۰۱۴ء کو موقر اخبار روز نامہ منصف کے مذہبی سپلیمنٹ ''مینارۂ نور'' میں ایک مضمون بہ عنوان ''تخلیق آدم'' شائع ہوا، مضمون میں نہایت ہی احمقانہ اور جاہلانہ انداز میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق اور انسانیت کے آغاز سے متعلق میں عجیب وغریب اور گمراہ کن خیالات کا اظہار کیا گیا، خرافات، واہیات اور ہفوات پر مبنی ان غیر اسلامی خیالات کے جائزہ وتجزیہ کے سلسلہ میں چند حقائق پیش خدمت ہیں:

۱- سب سے اہم اور بنیادی سوال یہ ہے کہ فاضل مضمون نگار کی طرف سے قرآنی آیات کا بیان کردہ معنیٰ ومفہوم اور پھر اس کی روشنی میں پیش کردہ نتیجہ کی بنیاد کیا ہے؟ اس لئے کہ قرآن مجید ''دستورِ الٰہی'' ہے، اس دستورِ الٰہی کی بات تو بہت اونچی ہے، دنیا کے عام قوانین کی بھی جو کوئی تشریح کرتا ہے تو اُس کو قانون سازوں اور قانون دانوں کے اصولوں کی پیروی کرنی پڑتی ہے، اگر دستورِ ہند کی کسی دفعہ کی تشریح بابائے قانون ڈاکٹر امبیڈکر نے صراحت کے ساتھ کر دی ہو، پھر عین اس کے بالکل خلاف کوئی رکشہ راں اور پنکچر بنانے والا اس قانونی دفعہ کی ایک نئی اور انوکھی تشریح کرنے لگے تو کیا اُس کو قبول کرلیا جائے گا؟ اور کیا اُس کے عقل کی داد دی جائے گی؟ پس جب انسان کے بنائے ہوئے دستور وقانون ـــــ جس میں غلطی کا ہونا صرف ممکن نہیں بلکہ امر واقعہ ہے اور دسیوں بار تبدیلی وترمیم ہوا کرتی ہے ـــــ کی یہ حیثیت اور اہمیت ہو تو اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ قانونِ زندگی قرآن مجید کی عظمت واہمیت اس سے کہیں زیادہ بلند تر اور برتر ہے، اس لئے خدا ترس، خدا شناس اور حق آگاہ علومِ اسلامی کے ماہرین اور محقق علماء ربانیین نے قرآنی آیات کی تفسیر اور قرآن فہمی کے لئے چند بنیادی اصول وقواعد مقرر کر دیئے، قرآنی آیات کے جو بھی معانی اور مطالب بیان

کیئے جائیں وہ اصول وقواعد کے اسی چوکھٹے اور دائرہ میں رہ کر قبول کیے جائیں گے، اب سوال یہ نہیں رہا کہ مضمون میں اظہار کردہ خیالات کہاں تک صحیح اور کس حد تک درست ہیں؟ بلکہ اہم مسئلہ یہ ہے ان خیالات کا اظہار قرآن فہمی کے بنیادی اصولوں کے چوکھٹے میں رہ کر کیا گیا ہے یا نہیں ؟ پورے مضمون میں ایک حدیث کا بھی حوالہ نہیں ہے، جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی قرآن فہمی کے لئے سب سے بڑی اتھاریٹی ہے، جولوگ قرآنی آیات کے مطالب اور معانی کے بیان میں احادیث کو نظر انداز کرتے ہیں وہ اپنی حماقت ونادانی کے ثبوت میں یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ:

> ''قرآن مجید نازل تو ہوا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر لیکن میں آپ سے زیادہ قرآن مجید جانتا اور سمجھتا ہوں''

شاید فاضل مضمون نگار کو خارج از اسلام گمراہ فرقہ ''اہل قرآن'' سے فکری مناسبت اور نظریاتی قربت ہے اس لئے مضمون میں احادیث اور صحابہؓ کے اقوال کا حوالہ نہیں ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ تخلیق آدم اور انسانیت کے آغاز کے تعلق سے اظہار کردہ خیالات کی بنیاد فاضل موصوف کی ''عقل مندی'' ہے، کم علم اور کج فہم لوگوں کی ایسی ''عقل مندی'' کو قرآنی آیات کی ترجمانی اور تشریح کا معیار مان لیا جائے تو پھر **الامان الحفیظ**! قرآنی تعلیمات اور حقائق کا جنازہ نکل جائے گا، اور قرآن مجید نعوذ باللہ ''بازیچۂ اطفال'' بچوں کا کھلونا بن جائے گا، اسلامی تاریخ میں ایسے ''عقل مند بے وقوفوں'' کی کمی نہیں رہی جنہوں نے اپنی ''عقل مندی'' کے خوب گل کھلائے اور شگوفے چھوڑے، یہاں تک کہ دوسرے حماقت مآب لوگ بھی اپنے آپ میں شرم وعار محسوس کرنے لگے، کسی نے اپنی عقل مندی کی بنیاد پر بغیر والد کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا انکار کردیا، اور کسی نے **والسارق والسارقة فاقطعوا ايديهما** کا ترجمہ سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے سے کیا ہے بہر حال جولوگ علم صحیح کے بغیر قرآنی آیات کے ترجمہ ومطلب میں رائے زنی کرتے ہیں، ان کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان میں بڑی عبرت ونصیحت ہے: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعدہ من النار ،''جو شخص قرآن کے معاملہ میں بغیر علم کے کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''(حوالہ:سنن ترمذی ۲ / ۱۲۳،باب ماجاء فی الذی تفسیر القرآن برأییه)

۲- حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے انسانیت کا آغاز ہوا،اس لئے آپ علیہ السلام کو ''ابو البشر''(انسانوں کے باپ) کہتے ہیں،حضرت آدم علیہ السلام کے وجود سے پہلے کائنات میں''انسان''نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی،آپ علیہ السلام کی تخلیق کا بنیادی عنصر مٹی ہے،قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے حوالہ سے مٹی کے بارے میں کئی الفاظ آئے ہیں،کہیں ''تراب''کے الفاظ ہیں کہیں،''طین لازب''کہا گیا،اور کہیں اس مٹی کی پوری وضاحت''من صلصال من حمأ مسنون''سے کی گئی،یہ دراصل حضرت آدم علیہ السلام کو جس مٹی سے پیدا کیا گیا اُس کے مختلف مراحل کا بیان ہے،غور کرنا چاہئے کہ جب مختلف الفاظ اور تعبیرات کے ساتھ ایک سے زائد مرتبہ قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے مادۂ تخلیق مٹی کی تفصیلی وضاحت موجود ہے تو یہ کہنا سراسر غلط اور بکواس ہوگا کہ آپ علیہ السلام اور دوسرے عام انسانوں کی پیدائش خودرو پودوں کی طرح ہوئی،حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا خصوصی تذکرہ اور آپ علیہ السلام کی تخلیق کا خاص اہتمام دیگر مخلوقات کے مقابلہ میں انسانیت کے شرف واعزاز کا اعلان واظہار ہے،اس لحاظ سے مضمون میں خاص طریقہ پر صرف حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا انکار نہیں بلکہ بادی النظر میں انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کا انکار ہے،قرآن مجید میں باری تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے: ولقد کرمنا بنی اٰدم ہم نے انسانوں کو معزز ومحترم بنایا(بنی اسرائیل:)اگر فاضل مضمون نگار خود کو اشرف المخلوقات سے خارج کرنا چاہتے ہیں تو شوق سے کریں،لیکن دوسرے انسانوں سے اس شرف واعزاز کو چھیننے کا وہ ہرگز حق نہیں رکھتے،خود کو اولاد آدم سے خارج کرنے کے شوق پر ۲۱ / ویں صدی عیسوی کا جھوٹا مدعی نبوت مرزا غلام قادیانی کا یہ شعر اچھے موقع پر یاد آیا،اس شخص نے خود اپنے بارے میں کہا تھا:

کرم خاکی ہوں پیارے نہ آدم زاد ہوں
ہوں بشر کی جائے نفرت اور انسانوں کی عار ہوں

۳- فاضل مضمون نگار سے بنیادی غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے سورۃ الحجر کی آیت ۲۶ / میں لفظ ''الانسان'' سے تمام انسانوں کو مراد لے لیا، حالاں کہ یہاں پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں، چنانچہ آیت ۲۹ / میں اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر ارشاد فرمایا:

''پھر جب میں اُس کو پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں تو تم سب اُس کے روبرو سجدہ میں گر پڑنا، پس ابلیس کے سوا تمام فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا......''

سوال یہ ہے کہ اگر آیت میں تمام انسان مراد ہیں تو کیا اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو پیدا کرتے وقت براہ راست ان میں اپنی طرف سے جان ڈالی تھی؟ اور کیا فرشتوں نے تمام انسانوں کو سجدہ کیا تھا؟ جیسے یہ غلط ہے، اس سے زیادہ غلطی اور نادانی یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق سے متعلق اس خاص آیت کو عام انسانوں کی تخلیق سے متعلق سمجھا جائے، دوسرا سوال یہ بھی ہے کہ ''فاذاسویتہ'' پھر جب میں اُس کو پورا بنا چکوں اور ''نفخت فیه من روحی'' اور اُس میں اپنی طرف سے جان ڈال دوں، آخر اس جملہ کی وضاحت کیا ہے؟ آیت کا معنی ومفہوم بالکل واضح ہے ''بنا چکوں'' کا مطلب حضرت آدم علیہ السلام کے اعضا وجوارح کو بنانا ہے اور روح پھونکنے کا مطلب اعضاء وجوارح کے اس خالی ڈھانچہ میں جان پیدا کرنا ہے، اسی کو اگر تفسیر قرآن مجید کے ماہر علماء ربانیین نے ''پتلا بنانے'' سے تعبیر کیا ہے تو غلط نہیں کیا بلکہ آیت کے معنی ومفہوم کے عین مطابق ہے۔

مضمون میں ایک نئی بخ یہ پیش کی گئی کہ انسان کے جسم کی ساخت، اُس کے قدوقامت اور رنگ وروپ میں فرق کی وجہ ''ہر جگہ کی الگ زمینی آب وہوا ہے'' حالاں کہ یہ فرق آب وہوا کی وجہ سے نہیں بلکہ ہر جگہ کی مٹی کی خاصیت کا فرق ہے، اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق میں جس مٹی کا انتخاب فرمایا تھا، اُس میں زمین کے ہر حصہ کی مٹی شامل تھی، اس مٹی کا اثر تمام اولاد آدم میں نمایاں ہوا، ان میں کوئی گورا ہے تو کوئی سیاہ فام، کوئی آرام وراحت والا تو کوئی رنج وغم کا مارا، کسی کی سرشت میں گندگی وخباثت تو کوئی پاکباز وپاک طینت، حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

''ان اللہ خلق آدم من قبضۃ قبضھا من جمیع الارض فجاء بنو اادم علی قدر الارض، فجاء منھم الاحمرو الابیض ،والاسود وبین ذالک والسھل والحزن والخبیث والطیب''(حوالہ: سنن ترمذی ۲ / ۱۲۴،ابواب التفسیر،سورۃ البقرۃ)

۴- مضمون میں بڑی ڈھٹائی سے تمام انسانوں کا ایک جوڑے کی اولاد ہونے سے انکار کیا گیا، حالاں کہ وحدتِ آدم کا نظریہ مختلف قوموں،نسلوں، خاندانوں،فرقوں، جماعتوں اور مختلف مذاہب کے پیروکاروں کے درمیان رواداری اور یکجہتی پیدا کرنے کے لئے''نقطۂ اتحاد'' ہے،نسلی، قومی،لسانی، علاقائی اور مذہبی ہر طرح کی عصبیتِ جاہلیہ پر مبنی ظلم وتشدد کو ختم کرنے کے لئے ،ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کا حوالہ دیا گیا اور محض انسانی رشتہ کی وجہ سے دنیا کے تمام انسانوں کو بھائی چارگی اور اتحاد کے ساتھ رہنے کی تعلیم دی گئی، وحدتِ انسانی کا یہ عظیم قرآنی نظریہ اگر گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی ملتا ہے تو اس کو آفاقی سچائی سمجھنا چاہئے، اس کو''اسرائیلیات سے ماخوذ سراسر بکواس اور قرآنی آیات کی گمراہ کن ترجمانی'' وہی کہہ سکتا ہے جسے پاگل پن کا دورہ پڑ چکا ہے اور وہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگتا ہے۔

(ب) حماقت مآب فاضل مضمون نگار کی طرح قرآن مجید کے بعض حقائق ونظریات کو...... جن کا تذکرہ گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی ہے .....اگر''اسرائیلیات'' کہہ بالکل نظرانداز نہیں بلکہ مسترد کردجائے تو دین وایمان کی بہت سی بنیادی اور سچی باتوں کا بھی انکار کردینا پڑے گا، جیسے خود آقاء دو جہاں نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا معاملہ ہے،آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے کی علامتیں گذشتہ آسمانی کتابوں میں بھی مذکور ہیں ،ان ہی علامتوں کو پڑھ کر سعادت منداور نیک بخت یہودیوں اور عیسائیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت ورسالت کا اقرار کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ،اس لئے اسرائیلی روایات کے سلسلہ میں افراط وتفریط سے پاک عدل واعتدال کی بات وہی ہے جو فن تفسیر کے ماہر علماء ربانییّن نے بیان فرمائی ہے، وہ یہ کہ اسرائیلی روایات کو نہ من وعن جوں کا توں کا قبول کیا

جائے گا اور نہ ہی بالکلیہ یقینی طور پر رد کردیا جائے گا، اس لئے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں قرآن مجید میں فرمایا گیا "مصدق لما معکم" "تمہاری جو آسمانی کتابیں ہیں اُس کی تصدیق کرتا ہوں، ایک یہ جگہ یہ بھی فرمایا گیا "وانه لفی لزبر الاولین" "بے شک یہ باتیں پہلے لوگوں کے صحیفوں میں بھی ہیں، اس لئے اسرائیلی روایات کی تین قسمیں بیان کی گئیں، ایک وہ روایات جن کا سچا ہونا خود قرآن وحدیث سے ثابت ہے، مثلاً نبوتِ محمدی کے دلائل وپیشن گوئیاں، حضرت موسیٰؑ کا واقعہ فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ، ایسی روایات کو بطورِ استدلال قبول کیا جائے گا، دوسرے وہ اسرائیلی روایات جن کا جھوٹا ہونا قرآن وحدیث کے دوسرے دلائل سے ثابت اور واضح ہے، مثلاً: بعض اسرائیلی روایات میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام معاذ اللہ آخری عمر میں کافر ہوگئے تھے، قرآن مجید واضح طور پر اس کی تردید کرتا ہے" وما کفر سلیمان ولکن الشیطین کفرو "ایسی روایات نا قابل قبول ہوگی، تیسرے وہ اسرائیلی روایات جن کے بارے میں قرآن وحدیث اور دیگر شرعی دلائل خاموش ہیں، مثلاً تورات کے بعض احکام وغیرہ ایسی روایات میں قبول یا رد کا فیصلہ کرنے کے بجائے سکوت اختیار کیا جائے گا، لانصدق و لا نکذب، نہ تصدیق کی جائے گی اور نہ تکذیب، (ملخصاً از مقدمہ معارف القرآن/جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی)

(ج) مضمون میں حضرت حوا کی خاص انداز میں پیدائش کا بھی بڑے شدومد کے ساتھ انکار کیا گیا، حالاں کہ جب اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرتِ کاملہ سے ایک خاص انداز میں حضرت آدم علیہ السلام کو وجود بخش سکتے ہیں تو حضرت آدم ہی جسم کے ایک جز پسلی سے حضرت حوا کو پیدا کرنا اللہ تعالیٰ کے کیا مشکل ہے، اسی لئے سورۂ نسا کی آیت :۱ / میں اور سورۃ الاعراف کی آیت ۱۸۹ / میں "نفس واحدۃ" کے ساتھ "وخلق منها زوجها" فرمایا: عرب وعجم کے تمام مفسرین نے نفس واحدۃ سے حضرت آدم علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کو مراد لیا ہے اور "خلق منها زوجها" کا مطلب یہ بیان کیا کہ حضرت بی بی حواؑ کی پیدائش حضرت آدم علیہ ہی کے جنس سے ہوئی، یعنی حضرت بی بی حوا کا وجود حضرت آدمؑ کے جسم کا ایک حصہ ہے، عورت کی پیدائش کے بارے میں اگر اس قرآنی نظریہ کو بنظر انصاف سمجھنے کی کوشش کی جائے تو آج کے نام نہاد مہذب معاشرہ میں صنفی اور جنسی

بنیادوں پر خواتین کے ساتھ روا رکھے جانے والے فرق و امتیاز کو ختم کیا جا سکتا ہے، حضرت الاستاذ حضرت مولانا خالد سیف اللہ رحمانی نے اپنے ترجمہ قرآن ''آسان تفسیر'' میں اس ضمن میں بڑی اچھی اور دل لگتی بات کہی ہے:

''یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم ہی سے ان کا جوڑا حضرت حوا علیھا السلام کو پیدا فرمایا، اس میں ایک بلیغ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ عورت مرد کا ایک حصہ اور اُس کی تکمیل ہے، آج عورتوں کی آزادی کے نام پر جو تحریکیں چل رہی ہیں، انھوں نے مردوں اور عورتوں کو دو فریق بنا دیا ہے، اور ظاہر ہے کہ انسان اپنے فریق کے تئیں مخاصمت کا جذبہ زیادہ رکھتا ہے، محبت کا کم، قرآن مجید نے یہ تصور دیا کہ مرد عورتوں کو اپنا حصہ اور جز تصور کریں اور ظاہر ہے اپنے جز کے تئیں محبت و ایثار کا جذبہ ہوتا ہے نہ کہ مقابلہ اور مخاصمت کا''

(ص:۲۸۹، النساء:۱)

بہر حال حضرت حوا کا حضرت آدم علیہ السلام کی پسلی سے پیدا ہونا کوئی غلط اور نا قابل فہم بات نہیں ہے، بالخصوص جب کے صحیح بخاری کی ایک روایت میں عورتوں کو پسلی سے تشبیہ دے کر ان کی پیدائش کی طرف طرف اشارہ کیا گیا اور بعض روایات میں اس کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا۔ (صحیح بخاری: باب خلق آدم وذریتہ، حدیث نمبر:۳۲۲۱)

غرض یہ کہ دنیا کے تمام انسانوں کا ایک جوڑے کی اولاد ہونا قرآن مجید کی بیان کردہ ایک بدیہی واضح اور روشن حقیقت ہے، قرآن مجید میں یہ حقیقت اتنے آسان اور عام فہم انداز میں بیان کی گئی کہ معمول سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی اس کو بآسانی سمجھ سکتا ہے، مثلاً سورۃ نساء کی بالکل پہلی آیت میں فرمایا:

''اے لوگو! اللہ سے ڈرو، جس نے تمھیں ایک جان (آدم علیہ السلام) سے پیدا کیا، اور اُسی (آدم) سے اُس کا جوڑ (بیوی حضرت حوا) پیدا کیا، اور ان دونوں سے بہت سارے مردوں اور عورتوں کو پھیلایا (پیدا کیا)''

سورہ حجرات کی آیت نمبر ۱۳ / میں فرمایا گیا:

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، اور تمہارے درمیان خاندان وقبیلے اس لئے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو''

دن چڑھے سورج کی روشنی کی طرح اس واضح سچائی کو جھٹلانے کا نام سوائے عقلی فتور اور دماغی خلل کے اور کیا ہوسکتا ہے؟؟

۵- مضمون میں تمام انسانوں کے ایک جوڑے کی اولاد نہ ہونے کے سلسلہ میں دلیل یہ دی گئی کہ سب کا ڈی، ین اے ٹسٹ الگ ہوتا ہے، اگر تمام انسان ایک جوڑے کی اولاد ہوتے تو سب کا ڈی، این، اے ٹسٹ ایک ہی ہونا چاہئے، ایسا لگتا ہے کہ عقل مندی کے جنون میں فاضل مضمون نگار نے ایک جوڑے کی اولاد ہونے کا مطلب نہیں سمجھا اور نہ وہ ڈی، این، اے ٹسٹ کی حقیقت سے واقف ہیں، ایک جوڑے کی اولاد ہونے کا مطلب یہ کس نے بیان کیا کہ آج کا پیدا ہونے والا ہر انسان براہ راست حضرت آدمؑ سے ولدیت کا رشتہ رکھتا ہے، ایک جوڑے کی اولاد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا علیہما السلام سے نسل انسانی کا جو سلسلہ شروع ہوا، اب تک، آج تک اور تاقیامت پیدا ہونے والا ہر انسان اُسی نسل انسانی کا فرد ہے، جیسے انسان بھائی، باپ، چچا، دادا وغیرہ اپنی مختلف رشتہ داریوں کی وجہ سے خاندان وقبیلہ کا ایک فرد کہلاتا ہے، اسی طرح وہ خاندان وقبیلہ کے تعلقات سے آگے جاکر آخری کڑی کے طور پر وہ ''اولاد آدم'' ہی کا فرد کہلائے گا۔

جیسے درخت کی مثال ہمارے سامنے ہیں، ابتداء میں یہ صرف ایک بیج ہوتا ہے، اس کے بعد یہ بیج جڑ کی شکل کی اختیار کرتا ہے، جڑ بننے کے بعد مختلف تنے اُس کے اطراف میں پھیل جاتے ہیں، جس سے جڑ مضبوط ہوتی ہے پھر اُسی درخت کی مختلف شاخیں اور ٹہنیاں ہوتی ہیں، ہر شاخ کے الگ الگ پھل اور پھول ہوتے ہیں، پھر ہر پھل اپنی ساخت میں اور مزہ میں بھی دوسرے پھل سے مختلف ہوتا ہے، اب اس کو دانشورانہ حماقت نہیں تو اور کیا کہا جائے گا کہ جب کوئی یہ کہے: ''ان پھلوں کا تعلق اُس بیج سے نہیں ہے جو بویا گیا، بلکہ ٹہنیوں سے ہے، اس لئے کہ سب کا رنگ، مزہ

اور سائز الگ ہے'' اپنی بات کو پیش کرنے میں فاضل مضمون نگار کا طرز اور اُسلوب بھی اسی انداز کا ہے: مختلف رنگ وروپ اور قدوقامت والے انسانوں کا بنیادی اور اصلی تعلق ''انسانیت کے تخم'' حضرت آدم وحضرت حوّا سے نہیں ہے بلکہ ''شجرۂ آدم'' کی مختلف شاخوں جیسے خاندانوں اور قبیلوں سے ہے، اس لئے سب کا ڈی، این، اے، ٹسٹ الگ ہے، اگر تمام پھلوں کا تعلق بیج سے ہوتا تو سب کا مزہ بھی ایک ہی ہونا چاہئے بالکل اسی طرح اگر تمام انسانوں کا تعلق ایک جوڑے سے ہوتا تو سب کا ڈی، این، اے ٹسٹ بھی ایک ہونا چاہئے۔

(ب) ڈی این اے ٹسٹ کی حقیقت کیا ہے؟ اس بارے میں ڈاکٹرس اور میڈیکل سائنس کے ماہرین زیادہ بہتر جانتے ہیں، لیکن ڈی این اے کی حقیقت اتنی تو سب کو معلوم ہے کہ اس کے ذریعہ ثبوتِ نسب کا پتہ لگایا جاتا ہے، آدمی کا خاندان وقبیلہ معلوم کیا جاتا ہے، پہلے مرحلہ میں ایک شخص کے ڈی این اے ٹسٹ سے باپ کا پتہ لگایا جاتا ہے، پھر باپ کے ڈی این اے ٹسٹ سے دادا کا رشتہ معلوم کیا جاتا ہے، اس طرح جتنا آپ آگے بڑھیں، لیکن جہاں آپ کی کوشش ختم ہوگی اُس کے ڈی این اے ٹسٹ میں اور جہاں سے شروع کیا گیا اُس کے ٹسٹ میں فرق لازماً ہوگا اور اس فرق کی وجہ سے وہ شخص اپنے دادا، پردادا، سکڑ دادا کے خاندان سے خارج نہیں ہوجاتا، اگر ایسا ہوتا تو فاضل مضمون نگار نہ کسی کے دادا بنتے اور نہ وہ کسی کے پوتے کہلاتے، پس جب ایک ہی خاندان کے افراد کا ڈی این اے ٹسٹ الگ ہوتا ہے، تو یہاں تو مسئلہ صرف ایک خاندان اور ایک نسل کا نہیں بلکہ صدیوں پرانی کئی نسلوں پر مشتمل اولادِ آدم کا ہے، یہ بات ڈی این اے ٹسٹ کی دریافت سے بہت پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک کلام قرآن مجید میں بیان فرمادی تھی:

> ''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہارے درمیان خاندان وقبیلوں کا فرق اس لئے رکھا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو''

بہر حال ڈی این اے ٹسٹ کے بارے میں اگر فاضل مضمون نگار کی مضحکہ خیز منطق تسلیم بھی کرلی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تمام ہندوستانیوں کا ڈی این اے ٹسٹ ایک ہونا چاہئے، مگر

یہاں تمام ہندوستانیوں کی بات تو بہت دور کی ہے ایک شہر، ایک محلہ بلکہ ایک گلی کے رہنے والے ہندوستانیوں کا ڈی این اے ٹسٹ یکساں نہیں ہے۔

جو ماہرین ڈی این اے ٹسٹ کی حقیقت سے گہری واقفیت رکھتے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار کی بات کتنی بے تکی اور بے جوڑ ہے، تمام انسانوں کا ایک جوڑے کی اولاد ہونا اور تمام انسانوں کے درمیان ڈی این اے ٹسٹ کا فرق ہونا دونوں باتیں الگ ہیں، دونوں باتوں کو ایک دوسرے میں گڈمڈ کرنا بالکل ایسا ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ: ''دنیا گول ہے، اس لئے چاول کا دانہ بھی گول ہے'' یا یہ کہے کہ ''دہلی ہندوستان کا دارالحکومت ہے اس لئے کہ وہاں تاج محل نہیں ہے''۔

(ج) تمام انسان ایک جوڑے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کی اولاد ہونے کو فاضل مضمون نگار نے ''عقیدۂ راسخ'' قرار دیا ہے، بے شک یہ عقیدۂ راسخ ہے، لیکن اس ''عقیدۂ راسخ'' کی تردید کے لئے ''غیر راسخ'' سائنسی تحقیقات ڈی این اے ٹسٹ کو بنیاد بنایا گیا، سائنسی تحقیقات کا تعلق بنیادی طور پر ایمانیات سے نہیں ہوتا، بلکہ کائنات کے نظام میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت کے نمونوں اور شاہکاروں کو جاننے اور سمجھنے سے ہوتا ہے، ہر انسان اپنے علم وفہم (**وما اوتیتم من العلم الا قلیلاً** اور تمہیں علم کا صرف کچھ حصہ ہی دیا گیا، آیت ذہن میں رہے) کے مطابق نظام کائنات بشمول تخلیق انسان میں کھوج لگاتے ہیں تو سائنسی تحقیقات سامنے آتی ہیں، پھر چوں کہ ہر ایک سائنسداں کی کھوج وجستجو کا نتیجہ اعلیٰ وتحقیقی استعداد کے فرق کی وجہ سے دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، اس لئے آئے دن سائنسی نظریات اور تحقیقات میں تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے، جیسا کہ معلوم ہے جب ڈی این اے ٹسٹ کی دریافت ہوتی تو اُس کی حقیقت اُس وقت کچھ اور تھی، پھر ہر گذرتے دن کے ساتھ اس میں تبدیلی اور ترقی ہوتی رہی، یہاں تک کہ اُس کی موجودہ شکل ہمارے سامنے ہے، آئندہ نہیں معلوم کہ مزید اس میں کیا تبدیلی اور ترقی ہوگی اور اس کی کیا حقیقت اور حیثیت سامنے آئے گی بقول شاعر اسلام علامہ اقبالؒ: ؎

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات ایک تغیر کو ہے زمانے میں

اس لئے تمام انسان ایک ہی جوڑے حضرت آدم اور حضرت حوا کی اولاد ہونے کا عقیدہ مسلمانوں میں یوں ہے راسخ نہیں ہوگیا بلکہ اس کے پیچھے قرآن وحدیث کی مضبوط بنیاد ہے،قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کے ایک جوڑے حضرت آدمؑ اور حضرت حواؑ کے اولاد ہونے کی وضاحت بھی فرمائی اور دسیوں جگہ اسی ایک جوڑے کی اولاد ہونے کا حوالہ دے کر ''یا بنی آدم'' کے الفاظ سے تمام انسانوں کو مخاطب فرمایا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

(۱) يَا بَنِيْ آدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا (الاعراف:۲۶) اے اولاد آدم! ہم نے تمہارے لئے لباس فراہم کیا ہے،(۲) وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِن بَنِيْ آدَمَ مِن ظُهُورِهِمْ (الاعراف:۱۷۲) جب تمہارے رب نے اولاد آدم کی پشت سے ان کی اولاد کو نکالا،(۳) يَا بَنِيْ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ (الاعراف:۳۸) اے اولاد آدم! جب تمہارے پاس تمہیں میں سے پیغمبر آئیں۔

اس کے علاوہ آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بے شمار احادیث میں تمام انسانوں کو ایک جوڑے حضرت آدم وحواؑ کی اولاد فرمایا، حجۃ الوداع کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے لاکھوں صحابہ کرام کے مجمع سے ارشاد فرمایا:

''ان اباکم واحد، وان دینکم واحد، ابو کم ادم وادم خلق من تراب، (مجمع الزوائد، باب لافضل لاحد علی أحد حدیث نمبر:۱۳۰۷۹)

تمہارے باپ ایک ہیں تمہارا دین ایک ہے،تمہارے باپ آدم ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے''۔

ایک جگہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کل بنی ادم خطاؤون وخیر الخطائین التوابون ،تمام اولاد ادم خطاء کار ہیں اور بہترین خطاء کار وہ ہیں ، جوتوبہ کرتے ہیں، (:سنن ترمذی، کتاب صفة القیامه، حدیث نمبر:۲۴۹۹)

بعض مرتبہ احادیث میں ''بنی آدم'' کے بجائے ''ابن ادم'' کے الفاظ آئے ہیں،مثلاً: ایک

جگہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انسان کی کمزوری حرص وہوس کو بیان کرتے ہوئے فرمایا: ابن ادم کو دولت کی حرص رہتی ہے، اگر اُس کو ایک سونے کا جنگل مل جائے تو وہ دو جنگل کی تمنا کرے گا، یہاں تک کہ قبر کی مٹی ہی سے اس کا منہ بھرے گا، یعنی موت آنے پر ہی اُس کی حرص ختم ہوگی (صحیح بخاری، کتاب الرقاق، حدیث نمبر ۶۰۷۵)

غرض یہ کہ اس طرح کی بے شمار قرآنی آیات اور احادیث کی بنیاد پر مسلمان تمام انسانوں کے ایک جوڑے (آدم وحوا) کی اولاد ہونے کو ''عقیدۂ راسخ'' کی طرح مانتے ہیں، اگر ڈی این اے ٹسٹ وغیرہ سائنسی تحقیقات سے اس کی تائید وتصدیق نہیں ہوتی ہے تو وہ اپنی بلا سے! لیکن مسلمان اس پر غیر متزلزل یقین رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے فرمان سے بڑھ کر کسی کی بات سچی نہیں ہو سکتی ''و من اصدق من اللہ قیلاً'' پہاڑ اپنی جگہ بدل سکتے ہیں، پہاڑ ہی کیا، دنیا کی ہر ''انہونی چیز'' ہوسکتی ہے لیکن الصادق الامین حضرت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد کبھی غلط نہیں ہوسکتا، جو لوگ سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ان باتوں کو غلط ثابت کرتے ہیں وہ بجائے خود اپنے غلط اور جھوٹے ہونے کا ناقابل تردید ثبوت پیش کرتے ہیں۔

اس طرح کی بے شمار قرآنی آیات اور احادیث سے جہاں تمام انسانوں کا ایک جوڑے (حضرت آدم حضرت حوا) کی اولاد ہونا واضح ہے وہیں فاضل مضمون نگار کے اس گمراہ کن دعوی کی بھی پُرزور تردید ہوتی ہے کہ ''انبیاء کرام ہی حضرت آدم کی نسل سے تعلق رکھتے ہیں'' اگر یہ دعوی صحیح ہوتا تو ''بنی آدم'' کے الفاظ صرف انبیاء کرام کے لئے خاص ہونا چاہیئے، جب کہ قرآن وحدیث میں ان الفاظ کے ذریعہ پورے انسانوں کو مخاطب کیا گیا۔

۶- فاضل مضمون نگار نے اپنی بے ہودہ بکواس میں سلفِ صالحین کی کتب تفاسیر کو ''عجمی معاشرہ کی ترجمان'' کہا اور بتایا کہ ''آج ہمیں ان تحریروں میں فرق باطلہ اور یہودیت کے اثرات نظر آتے ہیں'' ذیل میں قادیانی فرقہ کی نام نہاد تفسیر ''تفسیر کبیر'' کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے، تاکہ معلوم ہو کہ یہ بات کہاں تک درست ہے؟ قادیانی فرقہ کا دوسرا سربراہ اور مرزا غلام قادیانی کا بیٹا مرزا بشیر الدین محمود نے لکھا ہے:

''میں سب سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ آدم علیہ السلام کے ذکر سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ بشر کی پیدائش آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے چلی ہے یا یہ کہ خدا تعالیٰ نے یک دم ایک بشر یعنی آدم کو پیدا کردیا اور پھر اُس کی پسلی سے اُس کے لئے بیوی بنادی اور ان سے آگے انسانی نسل چلی، اس خیال کی تصدیق قرآن کریم سے ہرگز نہیں ہوتی، بلکہ یہ بیان بائبل اور دوسری کتب کا ہے اور اُسے غلطی سے اسلام کی طرف منسوب کردیا گیا ہے'' (تفسیر کبیر ۱/ ۲۸۷-۲۸۸، البقرہ: ۳۰)

قادیانی فرقہ کی اس نام نہاد تفسیر میں حضرت آدمؑ سے متعلق آیات کی تشریح کو سامنے رکھ کر فاضل مضمون نگار کی اس عبارت کو بغور پڑھیے!

''تخلیق آدم سے متعلق یہ مشہور ہے کہ جب اللہ نے آدم کی تخلیق کا ارادہ کیا تو، اس نے اپنے ہاتھوں سے ایک مٹی کا پتلا بنایا اور اُس پتلے کے منہ میں پھونک کر جان ڈال دی، اس طرح آدم پیدا ہوئے، پھر جب آدم نے اللہ سے اکیلے پن کی شکایت کی تو آدم کی پسلی سے ان کی زوجہ حوا پیدا کردی گئی، اس طرح اس واحد جوڑے سے ہی انسانوں کی پیدائش کا سلسلہ شروع ہوا، مذکورہ خیال اسرائیلیات سے ماخوذ سراسر بکواس اور قرآن آیات کی گمراہ کن ترجمانی ہے......''

اپنی اسی گمراہ کن تفسیر میں مرزا بشیرالدین محمود نے اپنے باپ مرزا غلام قادیانی کے حوالہ سے لکھا ہے:

''............اور نہ ہی ہم اس بات کے مدعی ہیں کہ یہ تمام نسلِ انسانی جو اس وقت دنیا کے مختلف حصوں میں موجود ہے یہ اُس آخری آدم کی نسل ہے، ہم تو اس آدم سے پہلے بھی نسلِ انسانی کے قائل ہیں، جیسا کہ قرآن شریف کے الفاظ سے پتہ لگتا ہے، خدا نے یہ فرمایا کہ انی جاعل فی الارض خلیفة،

خلیفہ کہتے ہیں جانشین کو اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ آدم سے پہلے بھی مخلوق موجود تھی پس امریکہ اور آسٹریلیا وغیرہ کے لوگوں کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ وہ اس آخری آدم کی اولاد میں سے ہے یا یہ کہ کسی دوسرے آدم کی اولاد میں سے ہیں۔ (حوالہ سابق: ۳۰۱)

مرزا غلام قادیانی کی اس منطق سے ملتی جلتی منطق فاضل مضمون نگار کی بھی ملاحظہ فرمائیں:

''......اور جب یہ مان لیا جائے کہ دنیا کے سارے ہی انسان آدم کے ہی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں تو ان کے (DNA) میں بھی کوئی فرق نہیں ہونا چاہئے، لیکن ایسا کچھ نہیں ہے......ایک ہندوستانی شخص اور افغانی کے DNA میں خاندانی اور نسلی فرق موجود ہے، ٹھیک یہی حال افریقی، روسی، چینی اور امریکی حضرات کے DNA کا ہے، اور یہ فرق اس وجہ سے ہے کہ موجودہ دور کے بے شمار لوگوں کا تعلق نسل آدم سے نہیں ہے''

یہ صرف دو نمونے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ فاضل مضمون نگار اور باطل فرقہ ــــ یہودیت کا ضمیمہ (دُم چھلہ) ــــ قادیانی فرقہ کے خیالات بلکہ نظریات میں کتنی ہم آہنگی اور یکسانیت ہے، اہل ایمان کے بارے میں اچھا گمان رکھنے کے حکم کی وجہ سے اگر فاضل مضمون نگار قادیانی نہ بھی ہوں تو کم از کم تخلیق آدم کے سلسلہ میں قادیانی ہونے کا ثبوت انہوں نے پیش کر دیا ہے، بہر حال ؎ ''الزام دوسروں کو دیتے تھے قصور اپنا نکل آیا'' کے مصداق فرق باطلہ اور یہودیت کا کے اثرات سلفِ صالحین کی تفسیروں میں نہیں خود فاضل مضمون نگار کے افکار و نظریات میں ہیں ــــ یہاں مؤقر اخبار روزنامہ منصف کے قابل احترام انتظامیہ کے لئے بھی لمحۂ فکریہ ہے کہ روزنامہ منصف پورے ملک کا وہ واحد اخبار ہے جس نے اپنے مذہبی ایڈیشن میں فتنۂ قادیانیت کی تردید میں سلسلہ وار مضامین شائع کئے، یہ منصف کا ایک شاندار اور قابل رشک ریکارڈ ہے، لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ غیر معروف مضمون نگار نے اپنے گمراہ مضمون کے ذریعہ در پردہ قادیانی خیالات کی اشاعت کے لئے روزنامہ منصف کا باوقار اور قابل اعتبار پلیٹ فارم کو استعمال

تونہیں کیا ہے؟؟ تا کہ فتنہ قادیانیت کے خلاف منصف کے روشن کردار کو مجروح ومخدوش کیا جا سکے، اس کو بڑی گہرائی اور گیرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۷- مضمون میں گہرے غور وفکر کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بادی النظر میں نعوذ باللہ حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت ورسالت کا انکار کیا گیا، مثلاً مضمون میں بتایا گیا کہ انبیاء کرام کا تعلق ذریتِ آدم حضرت آدم کی نسل سے ہے، پھر آگے بتایا گیا:

''ذریت آدم کے علاوہ اور انسانوں میں حضرت آدم کو ہی افضلیت حاصل ہے شاید اللہ تعالیٰ کو حضرت آدم کی ذریت سے ہی انبیاء کرام کو پیدا کرنا مقصود تھا، اسی وجہ سے اللہ نے آدم کو تمام انسانوں میں چن لیا''

یہاں دو باتیں وضاحت طلب ہیں، ایک یہ کہ ''ذریتِ آدم کے علاوہ اور انسانوں میں'' اس جملہ کا کیا مطلب ہے؟ کیا حضرت آدم علیہ السلام کا شمار صرف انسانوں میں ہے، پیغمبروں میں نہیں ہے؟ قرآنی آیات میں اگر ''ذریة آدم'' کا مصداق صرف انبیاء کرام ہیں تو کیا حضرت آدمؑ صرف ان انبیاء کرام کے باپ ہیں؟ وہ بذات خود نبی نہیں ہیں، جس طرح تمام عورتوں میں حضرت مریم علیہ السلام کو فضلیت دی گئی اور انہیں نبی نہیں بتایا گیا تو کیا اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام کو نبی اور پیغمبر بنائے بغیر دوسرے عام انسانوں کے مقابلہ میں انہیں صرف فضلیت دی گئی؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''چن لینا'' کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ آپ کی نسل میں انبیاء کرام کو پیدا کیا جائے یا پھر آپ علیہ السلام کو بھی نبی بنانا مقصود تھا؟ دوسری بات یہ ہے کہ مضمون میں جب کھلے طور پر حضرت آدم علیہ السلام کے پہلے انسان ہونے کا انکار کر دیا گیا تو اس سے از خود حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت کا انکار بھی ثابت ہو گیا، اس لئے کہ اسلامی عقیدہ کے مطابق حضرت آدم علیہ السلام پہلے انسان بھی ہیں اور پہلے پیغمبر بھی ہیں، انسانی نسل کا آغاز بھی آپ علیہ السلام کی ذات سے ہوا اور نبوت ورسالت کا سلسلہ بھی آپ ہی سے شروع ہوا، حضرت آدم علیہ السلام کے جب پہلے انسان ہونے کا انکار کر دیا گیا تو یہ اسلامی عقیدہ کہاں باقی رہے گا؟؟

۸- قرآن فہمی کے سلسلہ میں عربی زبان کی اپنی مسلمہ اہمیت ہے، اس سے ضروری اور

بنیادی واقفیت قرآن مجید کو سمجھنے کے لئے نہایت اہم ہے، محض قرآن مجید کے چند اردو اور انگریزی تراجم پڑھ کر کوئی قرآنی تعلیمات کو سمجھنے کا دعویٰ نہیں کرسکتا، پھر یہ کہ قرآنی آیات میں الفاظ کے ظاہری معنی و مفہوم سے زیادہ اہم مسئلہ ''منشاء خداوندی'' کو سمجھنے کا ہے، صحابہ کرامؓ اہل زبان تھے، اس لئے آیات کے ظاہری و معنی و مفہوم سے وہ بخوبی واقف تھے، لیکن اس کے باوجود منشا خداوندی کو پانے کے لئے ان برگذہ ہستیوں نے صاحبِ قرآن حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے باضابطہ تربیت حاصل کی، ایک ایک سورت سیکھنے اور سمجھنے میں انہیں کئی سال اور مہینے لگے، تخلیق آدم کا مسئلہ ہو یا دیگر اسلامی عقائد و نظریات ان کے دیگر تفصیلات اور احکام کو جاننے کا، دین و شریعت کا منہج اور مزاج کو معلوم کرنا زیادہ اہمیت رکھتا ہے، حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کے ذریعہ صرف ان کی پیدائش کا تذکرہ مقصود نہیں بلکہ انسانی وحدت اور انسانی عظمت و شرافت کا اعلان کرنا ہے، صحابہ کرامؓ نے قرآنی علوم و معارف نے اس عظیم اور قابل فخر سرمایہ کو براہ راست رسول اللہ ﷺ سے حاصل کیا، اس لئے کہ آپ ﷺ پر نزول قرآن کا مقصد یہ تھا کہ آپ اُس لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کردی، **وانزلنا الیک الذکر لتبین الناس مانزل الیھم** صحابہ کرامؓ کے بعد علوم نبوت کی یہ میراث قرآنی علوم و معارف ہر دور میں انبیاء کے وارثین علماء ربانیین کی حصہ میں آئی اور انھوں نے اس کو امانت سمجھ کر اللہ کے بندوں تک پہونچایا، مگر افسوس کہ فاضل مضمون نگار نے علماء ربانیین کی ان تفسیری خدمات کو ''عجمی معاشرہ کی ترجمان'' کہہ کر بڑی گستاخی اور جسارت کی۔

پھر یہ کہ جیسے انسانی شرافت اور عظمت کا اصل معیار تقویٰ و پرہیزگاری ہے، اُس میں عرب وعجم کی کوئی تفریق و تقسیم نہیں ہوتی، اسی طرح دین و شریعت کے علم و فہم میں اصل معیار حق و صداقت اور انصاف و سچائی کا ہے، کسی عرب رائٹر کی غلط بات محض اس لئے صحیح نہیں ہوجاتی کہ وہ عرب ہے اور کسی عجمی مصنف کی صحیح بات صرف اس لئے غلط نہیں ہوجاتی کہ وہ غیر عرب ہے، قرآنی آیات کے معنی و مفہوم کو قبول کرنے اور رد کرنے اصل معیار یہ ہے کہ وہ معنی و مفہوم تفسیر قرآن کے بنیادی اصولوں کے مطابق ہے یا نہیں، چاہے وہ مفہوم و معنی بیان کرنے والا عرب رائٹر ہو یا غیر عرب، نیز یہ بھی تاریخی حقیقت اور سچائی ہے کہ اسلام آفاقی مذہب ہونے کی وجہ سے اسلامی اخوت اور ملت

واحدہ کا ایک وسیع تصور مسلمانوں میں ہے، اس لئے علاقائی یا فرق وامتیاز کی کسی بھی بنیادوں پر باصلاحیت اور قابل ترین اہل علم اصحاب فن اور ارباب دانش سے کوئی بھید بھاؤ نہیں کیا جاتا ہے، چنانچہ عجم کے بہت سے اہل علم نے عربوں سے اپنی صلاحیت وقابلیت کا لوہا منوایا، اور عربوں نے بھی اعلیٰ ظرفی اور فراخ چشمی کے ساتھ ان کی اعلیٰ علمی، ادبی اور تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف کیا، یہاں تک یہ جملہ اہل علم میں مشہور ہے کہ: قرآن مکہ میں نازل ہوا، مصر میں پڑھا گیا، اور ہندوستان میں سمجھا گیا، مصر کے ایک زبردست عالم اور مشہور فاضل علامہ سید رشید رضاء مصری ملک کی قدیم اعلیٰ تعلیمی، فکری ودینی درسگاہ دارالعلوم دیوبند یوپی آئے اور یہاں کے بلند پایہ نامور محدث علامہ انور شاہ کشمیریؒ کی فنِ حدیث میں زبردست صلاحیت کا بھرپور اعتراف کیا، اس کے علاوہ مختلف اسلامی موضوعات پر عجم کے کئی اہل علم کی علمی وتحقیقی کتابیں عربوں کی لائبیریوں کی زینت ہے، ماضی قریب میں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی عربیت کی دھاک عربوں پر بیٹھی ہوئی تھی، مولاناؒ کی کئی کتابیں آج بھی وہاں کی درسگاہوں میں داخل نصاب ہیں، بہرحال ہندوستان وپاکستان کے اہل علم کے ان وسیع اور بلند پایہ علمی کارناموں کی طویل تاریخ کے پس منظر میں ایک کوڑھ مغز اور تنگ نظر شخص کو ہی ان کی تفاسیر میں ''عجمی معاشرہ کی ترجمانی'' اور ''فرق باطلہ اور یہودیت کے اثرات'' نظر آتے ہیں۔

''تخلیق آدم'' مضمون کے تجزیہ کا نتیجہ اور خلاصہ اگر مختصر لفظوں میں بیان کیا جائے تو اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ''بک رہا ہوں جنون میں کیا کیا'' مضمون نگاری کے لئے صرف قلم اور کاغذ کافی نہیں ہے، بلکہ عقل وفہم بھی نہایت ضروری ہے بالخصوص مذہبی موضوعات پر اظہار خیال کے لئے طرزِ نگارش سے زیادہ عقیدہ کی درستگی اور فکر ونظر کی سلامتی زیادہ اہمیت رکھتی ہے، اردو میں تو یہ محاورہ ہے کہ ''اللہ گنجے کے ہاتھ کو ناخن نہ دے'' لیکن ''تخلیق آدم'' جیسے مضامین پڑھ کر یہ دعاء کرنی پڑتی ہے کہ ''اللہ کم علم اور کج فہم گمراہ فکر کے لوگوں کے ہاتھ میں قلم نہ دے''۔

ربنا لاتزغ قلوبنا بعد اذھدیتنا وھب لنا

من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب

قرآنی تفسیر میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ
احتیاط واعتدال کی ضرورت

گزشتہ دنوں روزنامہ منصف کے مذہبی سپلیمنٹ ’’مینارۂ نور‘‘ (۱۵؍جنوری ۲۰۱۰ء) میں محترم جناب حقانی صاحب کا مضمون بعنوان ’’قرآنی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی ضرورت‘‘ پڑھنے کا اتفاق ہوا، قرآن اور سائنس سے متعلق محترم موصوف اور دیگر حضرات کے مضامین روزنامہ منصف کے سائنس وٹکنالوجی کے سپلیمنٹ میں بھی شائع ہوتے ہیں، اس کے علاوہ شہر کی ایک معروف مسجد میں خاص اس موضوع پر ’’درس قرآن‘‘ کا سلسلہ بھی جاری ہے، محترم جناب غلام حقانی صاحب اپنے مضمون کا اختتام ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ’’سائنٹفک نقطۂ نظر سے قرآن کریم کا اسی طرح مطالعہ کیا جائے تو اور بھی بہت سی آیات ایسی ملتی ہے جن کی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی سخت ضرورت محسوس ہوگی، تب ہی قرآن مجید کا صحیح مفہوم اخذ کیا جاسکے گا، کیوں کہ سائنٹفک پہلوؤں کا لحاظ نہ کرنے کی وجہ سے یا تو قرآنی آیات کا صحیح مفہوم سامنے نہیں آتا یا پھر آیات کے معنی ومطالب ہی یکسر بدل جاتے ہیں، جیسا کہ اوپر دی ہوئی چند مثالوں سے پتہ چل جاتا ہے‘‘

محترم موصوف نے جس پُر جوش اور پُر زور انداز میں اپنے مضمون کا مقصد اور پیغام ’’اجاگر‘‘ کیا ہے اس کے صحیح اور درست ہونے کے سلسلہ میں چند اُمور قابلِ توجہ ہیں:

۱- ’’سائنٹفک پہلوؤں‘‘ کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے کر قرآنی آیات میں اس کی تلاش وجستجو کرنا اور تفسیر میں ان کو ملحوظ رکھنا خود قرآن مجید کے موضوع کے ساتھ ناانصافی اور زیادتی ہے،

کیوں کہ قرآن مجید کا موضوع انسانیت کی ہدایت ورہنمائی ہے، ایمان ویقین کی پختگی، عقائد واعمال کی درستگی اور آخرت کی تیاری، یہ قرآن مجید کے خاص بنیادی اور مرکزی مضامین ہیں، مطالعہ قرآن اور قرآن فہمی کی بنیاد یہی مضامین ہونے چاہئے نہ یہ کہ سائنسی تحقیقات اور تشریحات اس سے ثابت کی جائیں، اس لئے کہ وہ سائنسی کتاب نہیں ہے، کتابِ ''ہدایت'' ہے، پس قرآن مجید سے استفادہ کا معقول، ماجور اور قابلِ قبول طریقہ یہ ہے کہ اس کے موضوع کی رعایت و پابندی کی جائے، کوئی عقل مند قانون و دستور کی کتابوں میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کے پہلوؤں کو ''اجاگر'' نہیں کرتا اسی طرح قرآنی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو بھی اجاگر نہیں کیا جاسکتا۔

۲- سائنسی تحقیقات کی بنیاد تجربات اور مشاہدات پر ہوتی ہے، تجربات و مشاہدات کی گاڑی ہمیشہ ایک پٹری پر نہیں چلتی، اس کے سوار بھی بدلتے رہتے ہیں اور ڈرائیور بھی تبدیل ہوتے ہیں، اس لئے ان وقتی اور عارضی تحقیقات پر قرآن مجید کی ابدی تعلیمات کی بنیاد رکھنا گویا ''ریت پر محل تعمیر کرنا ہے'' چنانچہ قرآن مجید کے ''بعض نادان دوستوں'' نے قرآنی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی تو ان کی یہ کوشش ''گنبد پر اخروٹ'' رکھنے کی طرح ثابت ہوئی، مثلاً سائنس دانوں نے جب کہا کہ زمین ساکن ہے، اس کو ثبوت میں فوراً قرآن مجید کی آیت پیش کی گئی، **أَمَّن جَعَلَ الْأَرْضَ قَرَارًا** (سورۃ النمل:۶۱) یا وہ ذات لائق عبادت ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا، حالانکہ قرآن مجید کی اس آیت کا مقصد کسی سائنسی نظریہ اور تھیوری ثابت کرنا نہیں ہے، اس میں بندوں پر اللہ تعالیٰ کا انعام واحسان بیان کیا گیا کہ وہ انسانوں پر کتنا مہربان ہے کہ اس نے زمین کو ٹھہراؤ کی جگہ بنایا تاکہ اس کے بندے زمین پر ڈانواڈول رہنے کی بجائے سکون واطمینان کے ساتھ رہیں، آرام سے لیٹیں اور بیٹھیں، پھر زمین کے بارے میں سائنس دانوں کا نظریہ بدل گیا کہ زمین ساکن نہیں ہے متحرک ہے، اس کو ثابت کرنے کے لیے ''سائنٹفک نقطۂ نظر'' سے ''قرآن کا مطالعہ'' کیا گیا، اور یہ آیت چسپاں کی گئی، **وَتَرَى الْجِبَالَ تَحْسَبُهَا جَامِدَةً وَهِيَ تَمُرُّ مَرَّ السَّحَابِ** (سورۃ النمل:۸۸) اور تم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ یہ جامد (ٹھہرے ہوئے) ہیں اور یہ بادل کی طرح

چل رہے ہوں گے، اس آیت میں زمین کی حرکت ثابت کرنے والوں نے ''تمر'' کا ترجمہ ''چل رہے ہوں گے'' کے بجائے ''چل رہے ہیں'' کردیا، حالانکہ یہاں بھی آیت کا سیاق وسباق (Context) صاف واضح ہے کہ اس میں قیامت کے حالات کا ذکر ہے، یعنی قیامت کے دن سارے پہاڑ جنہیں تم اپنی جگہ اٹل سمجھتے ہو، فضاء میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے لیکن سائنٹفک پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش اور خواہش نے آیت کے سیاق وسباق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا، اس سلسلہ میں بلند پایۂ محقق اور نامور عالم دین جسٹس مولانا مفتی تقی عثمانی لکھتے ہیں:

> ''جس وقت لوگ قرآن سے زمین کا ساکن ہونا ثابت کرنا چاہ رہے تھے وہ بزعم خود قرآن کی خدمت تصور کرتے تھے، لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہوجاتی اور عالمگیر طور پر مان لیا جاتا کہ قرآن زمین کے ساکن ہونے کا قائل ہے تو آج جب کہ زمین کو ساکن سمجھنا سائنس کے نقطۂ نظر سے کلمۂ کفر کہنے کے مترادف ہوگیا ہے [تو اندازہ لگائیے] قرآن کے ساتھ یہ نادان دوستی کیا نتائج پیدا کرتی؟ لہٰذا سائنس کے بارے میں جو باتیں قطعی طور سے قرآن کریم میں موجود ہیں انہیں قرآن کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے، لیکن جن باتوں کی قطعی وضاحت قرآن نے نہیں کی ان کو خواہ مخواہ اس کی طرف سے منسوب کرنا کل بھی غلط تھا اور آج بھی غلط ہے'' (علوم القرآن، ص: ۳۹۵)

پس سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ زمین کی حرکت وسکون قرآن مجید کے موضوع اور مقصد سے خارج ہے اس لئے پورے قرآن مجید میں کہیں بھی اس کی وضاحت نہیں ہے، اصولی اور بنیادی طور پر وہ باتیں قرآن مجید کا موضوع ہیں جو انسانی عقل سے ماوراء (بالاتر) ہیں جن کا سمجھنا صرف وحی الٰہی ہی کی روشنی میں ممکن ہے، البتہ قرآن مجید میں جہاں کائنات اور آفاق وانفس سے متعلق باتوں کا ذکر ہے وہ ضمنی طور پر ہیں، کیوں کہ ان باتوں کا ثبوت زیادہ تر انسانوں کی تحقیق وجستجو پر ہے، ان باتوں سے متعلق قرآن مجید اپنا اٹل اور قطعی فیصلہ سنا کر انسانی عقل کے استعمال اور اس کی پرواز پر قدغن (پابندی)

لگانا نہیں چاہتا، وہ کائنات میں پھیلی اور بکھری نعمتوں اور نشانیوں کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان میں غور وفکر وتدبر کی تعلیم دیتا ہے۔

۳- سائنٹفک پہلوؤں سے اگر کوئی بات مانی اور منوائی جائے تو ان کی بنیاد پر قرآن مجید کی آیات سے انکار اور فرار کی راہ بھی ہموار ہوتی ہے، یہ محض خام خیالی اور سخن سازی نہیں بلکہ ایسا ہو چکا ہے، علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی جناب سرسید احمد خان مرحوم کے نام اور کام سے کون واقف نہیں ہے، لیکن انہوں نے سائنسی تحقیقات کی بنیاد پر اسلامی نظریات ومسلّمات اور معجزات کا انکار کر دیا، مثلاً قرآن مجید میں ایک سے زائد مرتبہ حضرت آدم علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر ہے جس میں فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آپ علیہ السلام کو سجدہ کریں، فرشتوں نے سجدہ کیا اور ابلیس نے انکار کیا، انسانیت کے آغاز کی یہ تفصیلات چوکہ ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کے مطابق نہیں تھی اس لئے سرسید احمد خان مرحوم نے ان تفصیلات کو مجاز واستعارہ کے معنی میں لیا، چنانچہ لکھتے ہیں:

"آدم کے لفظ سے وہ ذاتِ خاص مراد نہیں ہے جس کو عوام الناس اور مسجد کے ملّاباوا آدم کہتے ہیں بلکہ اس سے نوعِ انسانی مراد ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:

"اس قصہ میں چار فریق بیان ہوئے ہیں،، ایک خدا، دوسرے فرشتے (یعنی قوائے ملکوتی) تیسرے ابلیس یا شیطان (یعنی قوائے بہیمی) چوتھے آدم (یعنی انسان جو مجموعہ ان قویٰ کا ہے اور جس میں مرد وعورت دونوں شامل ہیں) مقصود وقصہ کا انسانی فطرت کی زبانِ حال سے انسان کی فطرت کا بیان کرنا ہے" (تفسیر القرآن ۱/۴۸ بحوالہ علوم القرآن: ۴۰۲)

یہی انداز سرسید احمد خان صاحب نے جنت اور جہنم کے تذکرہ میں بھی اختیار کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بات شاید محترم فاضل مضمون نگار کو گراں گزرے لیکن بحیثیت طالب علم یہ کہنے میں مجھے کوئی جھجک نہیں کہ قرآن کی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کی "تحصیل" کے پیچھے زمانہ کی

سائنسی تحقیقات سے مرعوب اور مغلوب ذہنیت کارفرما ہوتی ہے، مضمون کے آغاز میں محترم موصوف کا یہ کہنا تو ٹھیک ہے کہ ''قرآن مجید کا یہ بھی بڑا اعجاز ہے کہ وہ ہر زمانہ اور ہر ہر دور سے ہم آہنگ رہا'' لیکن ''ہم آہنگی'' کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ زمانہ کے بے بنیاد اور بودے نظریات وتحقیقات سے بھی موافقت رکھتا ہو، اس لئے یہ کہنا زیادہ صحیح اور مناسب ہوگا کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ہر دور میں ''قابلِ عمل'' رہا، کیوں کہ قرآن کریم زمانہ سے نہیں ہے کہ قرآنی تعلیمات زمانہ کے انکشافات اور تحقیقات کے فریم میں فٹ کی جائیں، بلکہ زمانہ خود قرآن سے ہے، اس کی تازہ اور نئی تحقیقات قرآن مجید کی تصدیق وتائید کے بعد قبول کی جائیں گی، پس معلوم ہوا کہ قرآنی تفسیر میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ اصولِ تفسیر کے چوکھٹے اور دائرہ میں ہو، اور ''استفادہ'' ''استدلال'' نہ بن جائے، اس میں عقیدہ وایمان کی سلامتی ہے، ورنہ اگر تفسیر کے اصول وقواعد سے بے نیاز ہوکر سائنسی تحقیقات کا آزادانہ استعمال کیا جائے تو پھر یہ پُر خطر راہ ارتداد والحاد کی دہلیز پر ختم ہوگی، اسلامی تاریخ میں مرتد اور گمراہ فرقے اس کی نمایاں مثال ہے۔

۴- محترم مضمون نگار نے قرآنی تفسیر میں ''سائنٹفک پہلوؤں'' کی چند مثالیں بھی پیش کی ہے، ان میں سورۃ الھمزہ کی آیت نمبر ۶/اور ۷/ ہے، نَارُ اللّٰہِ الْمُوقَدَۃُ ۔ الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْأَفْئِدَۃِ کا ترجمہ ''آگ کا دلوں تک جا پہونچنا'' محترم موصوف کی نگاہ میں سائنسی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے، وہ اس کا ترجمہ ''دلوں کو اطلاع دینا'' کرتے ہیں یعنی مجرمین کے جسم کو آگ کے جلانے کی وجہ سے جو تکلیف واذیت ہوتی اس کی خبر دلوں کو ہوتی ہے، آیت کا پہلا ترجمہ آیت کے ظاہری اور حقیقی معنی کے مطابق ہے آسان اور عام فہم بھی، اس سے دوزخ کے عذاب کی شدت اور ہولنا کی بآسانی سمجھ میں آتی ہے، اس لئے کہ آگ کی خاصیت ہے جب وہ کسی چیز کو جلانا شروع کرتی ہے تو اس کو مکمل جلا کر رکھ دیتی ہے، دنیا میں انسان کو آگ لگتی ہے، لیکن آگ اس کے دل تک پہنچنے سے پہلے ہی انسان کی موت ہوجاتی ہے، اس کو اپنے دل کے جلنے کا احساس ہی نہیں ہوتا، برخلاف دوزخ کی آگ کے کہ وہ اتنی خطرناک اور ہولناک ہوتی ہے کہ آگ بدن کو لگتے ہی دلوں تک جا پہنچے گی اور اس کو جلا دے گی، اور

دوزخ میں جلنے والا جیتے جی دل کے جلنے کا عذاب چکھے گا۔

دوسرے یہ کہ کسی تکلیف اور اذیت کا احساس ہونا اور بذات خود اس تکلیف میں مبتلا ہونا دونوں میں بڑا فرق ہے، ایک شخص پولیس لاک اپ میں تھرڈ ڈگری کی سزا سے صرف واقف ہے، اس کے تصور اور احساس سے اس کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، دوسرا شخص تھرڈ ڈگری کی سزا کو عملاً جھیل چکا ہے، تھرڈ ڈگری کی سزا کی شدت اور سختی دوسرے شخص کو زیادہ معلوم ہوگی، پھر یہ کہ اطلاع دینا اور خبر کا پہونچانا اس وقت ہوتا ہے جب وہ مقام واقعہ سے دور ہو، فاصلہ پر ہو، یہاں تو مجرم دوزخ میں جل رہا ہے، جسم اور دل ساتھ لگا ہوا ہے، اس کے باوجود اطلاع دینا/خبر کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟ جسم کی تکلیف سے دل از خود متاثر ہوجاتا ہے، جیسے ہم دیکھتے ہیں بدن کے کسی عضو کو کوئی چیز چبھ جائے تو سارا جسم بے چین ہوجاتا ہے، پس آیت کے ظاہری اور قریبی معنی وتشریح کو چھوڑ کر سائنسی تحقیق پیش کرنا گویا ''دور کی کوڑی لانا ہے''۔

دوسری مثال سورۃ العلق کی آیت نمبر ۱۵/اور ۱۶/ ہے کَلَّا لَئِن لَّمْ يَنتَهِ لَنَسْفَعاً بِالنَّاصِيَةِ ، نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ یہاں پر بھی علماء کرام نے آیت کے ظاہری اور حقیقی معنی کو پیش نظر رکھ کر ''ناصیہ'' کا ترجمہ ''پیشانی/ پیشانی کے بال'' کیا ہے، لیکن محترم مضمون نگار نے اس کی تفسیر یہ بیان کی کہ یہ دماغ کی اس صلاحیت کا نام ہے جو انسان کے ہر اچھے اور برے کاموں کی ذمہ دار ہے، حالانکہ علما کرام کی بیان کردہ تفسیر کو ماننے میں کوئی پریشانی اور دشواری نہیں ہے، اس لئے کہ پیشانی / ہر انسانی وجود کا مرکزی حصہ ہے، یہ حصہ اگر کسی کے ہاتھ میں آجائے تو انسان پوری طرح اس کے ہاتھوں مجبور بے بس ہوگا، اللہ تعالیٰ کے حکم سے فرشتے پیشانی کے بال پکڑ کر انہیں گھسیٹتے ہوئے جہنم میں پھینک دیں گے، پیشانی کے جھوٹی اور خطا کار ہونے کا مطلب خود انسان کا جھوٹا اور خطا کار ہونا ہے، جیسے ہم محاورہ میں کہتے ہیں ''ناک کٹ گئی'' یا حدیث میں محاورہ ہے ''رغم انفه'' اس کی ناک خاک آلود ہو، اس کا مطلب کوئی بھی یہ نہیں لیتا کہ حقیقت میں ناک کٹ جائے گی یا ناک پر مٹی ڈالی جائے، بلکہ اس سے مراد ذلیل ورسوا ہونا ہے، حدیث میں اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا سکھائی ہے، اس میں

ایک جملہ یہ بھی ہے ’’ناصیتی بیدک ‘‘ اے اللہ میری پیشانی آپ کے قبضہ میں ہے، مطلب یہ کہ میرا پورا وجود آپ کے اختیار میں ہے، میرے متعلق آپ کا ہر فیصلہ مجھے بسر وچشم قبول ہے، پس علماء کرام کی بیان کردہ تفسیر اصول تفسیر کے عین مطابق ہے، تفسیر کا یہ مسلمہ ضابطہ ہے کہ جب کسی لفظ کے ظاہری اور حقیقی معنی واضح ہوں اور اسے لینا ممکن ہو تو وہی معنی مراد لئے جائیں گے، آیت کے ظاہری اور حقیقی معنی کو چھوڑ کر محض سائنسی بنیاد پر اس طرح کی اگر نئی تشریح وتعبیر کی جائے تو دین وشریعت کی کوئی بات اپنی اصل حقیقت اور حیثیت میں باقی نہیں رہے گی ، چنانچہ قدیم زمانہ میں قرامطیہ اور باطنیہ کے نام سے ایک جماعت گزری ہے، جس نے قرآنی آیات کے ظاہری معانی کو چھوڑ کر قرآن کی تفسیر میں ایسے ہی گل کھلائے ہیں، مثلاً صلوٰۃ (نماز) کے معنی امام (باطنی لیڈر) کی اطاعت ہے، صوم (روزہ) سے مراد اس لیڈر کا راز فاش نہیں کرنا اور زنا کا مطلب باطنی فرقہ کا راز ظاہر ہونا ہے۔

دوسرے یہ کہ دوزخ ان امور میں سے ہے جس کی تفصیلات کا ادراک واحساس انسانی عقل سے بالاتر (ماورائے عقل) ہے، اس کو ہم صرف اور صرف وحی الٰہی کی بنیاد پر تسلیم کرتے ہیں اور اسی کی روشنی میں اس کی تفصیلات سمجھتے ہیں، یہاں سائنسی تحقیقات کو داخل نہیں کیا جاسکتا، اگر ایسا کیا جائے تو دوزخ کے وجود اور ثبوت پر سوال کھڑا ہوگا، اس لئے مسئلہ قرآنی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کا نہیں ہے، بنیادی سوال سائنٹیفک پہلوؤں کی تشریح کے لیے موقع ومحل کی تعیین کا ہے، آیا پورے قرآن مجید میں سائنٹفک پہلوؤں کو اُجاگر کیا جائے یا صرف ان مقامات میں جہاں آفاق وانفس سے متعلق نشانیوں کا ذکر ہے، وہاں حسب گنجائش وضرورت ان کو بیان کیا جائے؟؟ علماء کرام نے اپنے اپنے ذوق وصلاحیت کے مطابق صرف ان قرآنی آیات میں سائنسی تشریحات کو جگہ دی ہے جن میں سورج وچاند، ستارں، سیاروں اور سمندروں وغیرہ کا ذکر ہے، اس سلسلہ میں مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب ’’قرآن اور سائنس‘‘ بہت مشہور اور معتبر کتاب مانی جاتی ہے، غرض یہ کہ موقع ومحل کی مناسبت اور ضرورت وگنجائش کے مطابق قرآنی تفسیر میں سائنسی تحقیقات سے استفادہ ایک معتدل اور معتبر طریقہ ہے، اس سے قرآن مجید کا صحیح مفہوم معلوم ہوگا اور آیات کے معانی ومطالب بھی اپنی اصل حالت پر

باقی رہیں گے، اس کے بغیر ہماری "تحقیق"، "تحریف" کہلائے گی۔

۵- قرآن مجید میں "صراطِ مستقیم" کی رہنمائی کے لیے دعا سکھلائی گئی، سیدھی راہ اللہ تعالیٰ کے انعام یافتہ بندے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ ہے، **انعم اللہ علیهم من النبین والصدیقین والشهداء والصالحین** تفسیر قرآن میں "صراطِ مستقیم" کی پیروی کی بہتر صورت یہ ہے کہ سائنسی تحقیقات کے بجائے ان نیک و برگزیدہ ہستیوں کی تشریحات کو اہمیت و ترجیح دی جائے۔

ہوئے کس قدر بے توفیق اہلِ حرم
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

"قرآن مجید کا موضوع انسانیت کی ہدایت و رہنمائی ہے، ایمان ویقین کی پختگی، عقائد واعمال کی درستگی اور آخرت کی تیاری، یہ قرآن مجید کے خاص بنیادی اور مرکزی مضامین ہیں، مطالعہ قرآن اور قرآن فہمی کی بنیاد یہی مضامین ہونے چاہئے نہ یہ کہ سائنسی تحقیقات اور تشریحات اس سے ثابت کی جائیں، اس لئے کہ وہ سائنسی کتاب نہیں ہے، کتابِ "ہدایت" ہے، پس قرآن مجید سے استفادہ کا معقول، ماجور اور قابلِ قبول طریقہ یہ ہے کہ اس کے موضوع کی رعایت و پابندی کی جائے، کوئی عقل مند قانون و دستور کی کتابوں میں ڈاکٹری اور انجینئرنگ کے پہلوؤں کو "اجاگر" نہیں کرتا اسی طرح قرآنی تفسیر میں سائنٹفک پہلوؤں کو بھی اجاگر نہیں کیا جاسکتا"

ظفر آدمی اُس کو نہ جانئیے گا ، وہ ہو کیسا ہی صاحبِ فہم وذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی ، جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

گلے سے گلے لگائیے، گلے شکوے ختم کیجئے!

آج عید الفطر ہے، خوشی و مسرت، فرحت و شادمانی کا دن ہے، تتلیوں اور کلیوں کے مانند معصوم بچے کھلونوں کی خریداری اور ان سے دل بہلائی میں مگن ہیں، بڑے بزرگ مسکراہٹوں کے تبادلہ کے ساتھ ایک دوسرے کو عید کی مبارکبادیاں دے رہے ہیں اور کچھ منچلے نوجوان "کمرتوڑ" گلے مل رہے ہیں، غرض یہ کہ کیا بوڑھے کیا جوان، تمام ہی مسلمان آج شاداں و فرحاں ہیں۔

فرحت و انبساط کی اس بسیط فضا اور پر لطف ماحول میں بھی کچھ لوگ اپنے بعض دوستوں اور رشتہ داروں سے الگ تھلک رہنے کی کوشش کرتے ہیں، انھیں آتا دیکھ کر راستہ بدل دیتے ہیں، کبھی نگاہیں اور توجہ پھیر لیتے ہیں، ایک دوسرے سے دور رہتے اور انجان بنے رہنے کی ہر ممکن طریقہ پر پوری کوشش کرتے ہے، اس طرح کا باہمی قطع تعلق ہمیشہ مذموم اور ناپسندیدہ ہے، لیکن عید کے دن جب کہ ہر جگہ خوشیاں بکھیری جارہی ہوں، ہنسنے اور ہنسانے کا ماحول ہو، خوش رہنے، خوش رکھنے اور خوش کرنے کا موقع ہو، ایسے مرحلہ پر قطع تعلق اور ایک دوسرے سے دوری اختیار کرنا اپنے مزاج کے خشک ہونے کی علامت ہے، اپنی طبیعت کی مایوسی، افسردگی اور پژمردگی کی نشانی ہے۔

باہمی تعلقات اور رشتہ داریاں زندگی کا ایک بنیادی اور اٹوٹ حصہ ہے، اسی سے خاندان اور قبیلہ کا قیام ہے، صالح اور مہذب معاشرہ کی تعمیر ہے، زندگی تبدیلی اور انقلاب کا دوسرا نام ہے، نشیب و فراز اور اتار چڑھاؤ زندگی میں آتے رہتے ہیں، اس لحاظ سے تعلقات بھی سرد گرم حالات سے دوچار ہوتے ہیں، ایسے میں ایک سچے اور حقیقی مسلمان کے لیے اسلامی تعلیمات بہتر نمونہ ہیں، اس کی رہبری میں وہ اپنے کشیدہ تعلقات میں بہتری لاسکتے ہیں اور اپنے معطل و منقطع تعلقات کو بحال کرسکتے ہیں۔

اچھے اور خوشگوار تعلقات کی بنیاد سچی، خالص، بے غرض اور بے لوث محبت پر ہوتی ہے،

احادیث میں دوستی اور دشمنی کا معیار اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَ الْبُغْضُ لِلّٰہِ کوقرار دیا گیا، دوستی و دشمنی صرف اللہ ہی کے لیے ہو، اس میں خودغرضی اور مفاد پرستی نہ ہو، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ میری وجہ سے باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں؟ آج انھیں میں اپنے سایہ میں جگہ دوں گا، آج کے دن میرے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ (ریاض الصالحین ص: ۱۷۷ باب فضل الحب فی اللہ ......) حضرت معاذ بن جبلؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی رضاوخوشنودی کے خاطر محبت کرنے والوں کے واسطے روشنی کے منبر ہوں گے، انہیں دیکھ کر انبیاء اور شہدا بھی رشک کریں گے۔ (ریاض الصالحین ص: ۱۷۸ باب فضل الحب فی اللہ ......) اللہ تعالیٰ کے لیے اگر ایک دوسرے سے محبت ہوتو زبان سے اس کا اظہار کردینا بہتر اور مناسب ہے، تاکہ اگر دل میں اپنے مفاد ومطلب کا کوئی شبہ اور وسوسہ ہوتو وہ بھی ختم ہوجائے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی اپنے بھائی سے محبت کرے تو وہ اپنے بھائی کو بتادے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں (ریاض الصالحین، ص:۱۷۹ باب فضل الحب فی اللہ......)۔

مشہور اور جلیل القدر تابعی حضرت ابوادریس خولانیؒ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے معجزہ جیسی کرامت ظاہر فرمائی، وہ یہ کہ جھوٹے مدعی نبوت اسود عنسی نے انہیں جھوٹی نبوت پر ایمان نہ لانے کی پاداش میں زندہ آگ میں ڈلوادیا تھا، لیکن آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح ان کے لیے "گل گلزار" بن گئی اور حضرت ادریس خولانیؒ زندہ سلامت آگ سے نکل آئے، یہ تابعی ایک مرتبہ دمشق کی جامع مسجد میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے یہاں پہنچے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم! میں اللہ کی رضاوخوشنودی کے لیے آپ سے محبت کرتا ہوں، حضرت معاذ بن جبلؓ نے پوچھا کیا آپ واقعی اللہ تعالیٰ کے خاطر مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ حضرت ادریس خولانیؒ نے کہا کہ ہاں اللہ کے لیے، حضرت معاذؓ نے پھر پوچھا: کیا اللہ تعالیٰ کے لیے آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟ حضرت خولانیؒ نے کہا ہاں میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے آپ کو چاہتا ہوں، حضرت ادریس خولانیؒ فرماتے ہیں کہ اتنا سننا تھا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ نے اپنی چادر کے گھیرے سے مجھے قریب کیا اور مجھے اپنی جانب کھینچا اور فرمایا: تمہیں خوشخبری ہو، میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا، آپ ﷺ

نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ میری محبت ان لوگوں کے لیے واجب ہوگئی جو میرے خاطر باہم محبت کرتے ہیں، میری وجہ سے ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر بیٹھتے ہیں، میرے لیے ایک دوسرے کے یہاں آتے جاتے ہیں، مجھے راضی اور خوش کرنے کے لیے ایک دوسرے پر خرچ کرتے ہیں۔ (ریاض الصالحین ،ص:۱۷۸باب فضل الحب فی اللّٰہ......) اللہ تعالیٰ کے خاطر دوسروں سے محبت کا مطلب یہ ہے کہ کسی کے ساتھ رشتہ وتعلق میں صرف اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی مطلوب ومقصود ہو،کسی سے ملاقات اور زیارت میں اپنی عافیت پسندی اور مزاج کا دخل نہ ہو، نیز یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی انہیں لوگوں سے دوستی و ملاقات میں ملے گی جو اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار ہیں، جونیکوکار اور صالح ہیں، جولوگ اللہ تعالیٰ کے باغی اور اس کے نافرمان ہیں ان سے دوستی ومحبت دراصل اللہ تعالیٰ کی ناراضگی مول لینا ہے۔

دوسرے یہ کہ باہمی تعلقات میں کشیدگی اور خرابی اس وقت پیش آتی ہے جب اپنی طبیعت ومزاج اور مرضی کے خلاف کوئی کام ہوجاتا ہے یا کوئی بھی بات کہہ دی جاتی ہے،ایسے موقع پر خودکو اعتدال وتوازن کے دائرہ میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے،اس کے لیے اسلام میں عفو ودرگذر کی تعلیم دی گئی ہے،تاکہ اس کی وجہ سے اپنے آپ پر قابو پانا آسان ہو،قرآن مجید میں نیکوکار اور پرہیزگاروں کی ایک علامت بھی بتائی گئی کہ وہ غصہ کو پی جانے والے اورلوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔ (آل عمران: ۱۳۴) خود رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارک یہ تھی کہ آپ ﷺ انتقام اور بدلہ لینے کے بجائے عفوودرگذر سے کام لیتے وَلٰکِنْ یَّعْفُوْ وَیُصَفُحو, عفوودرگذر کے حوالہ سے حضرت حسنؓ کا واقعہ دلچسپ انداز میں تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے،ایک مرتبہ حضرت حسنؓ دسترخوان پر تشریف فرماتھے،آپؓ کی باندی سالن کا برتن لا رہی تھی کہ کچھ سالن حضرت حسنؓ پر پڑ گیا،حضرت حسنؓ کے چہرہ پر غصہ وناراضگی کے آثار ظاہر ہوئے، باندی چوں کہ پڑھی لکھی خاتون تھی،اس نے قرآن کی آیت پڑھی،جس میں فرمایا گیا: اللہ کے نیک اور متقی بندے وہ ہیں جوغصہ کو پی جاتے ہیں،اس پر حضرت حسنؓ نے کہا کہ میں غصہ کو پی گیا ہوں تجھ پر ناراض نہیں ہوں، باندی نے مزید پڑھا کہ متقی لوگ لوگوں کو معاف کردیتے ہیں،حضرت حسنؓ نے کہا کہ میں نے تجھے معاف کردیا، باندی صرف

تعلیم یافتہ نہیں تھی بلکہ کچھ دلیر اور ہوشیار بھی تھی، اس نے آیت کا آخری ٹکڑا بھی پڑھ دیا کہ اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے، اس پر حضرت حسنؓ نے کہا کہ جا! میں نے تجھے آزاد کر دیا، اس طرح حضرت حسنؓ نے عفو و درگذر کی اعلیٰ مثال قائم کی پوری آیت یوں ہے: **الذین ینفقون فی السرا و الضراء و الکاظمین الغیظ و العافین عن الناس و اللّٰہ یحب المحسنین**، (اٰل عمران: ۱۳۴)

عفو و درگذر کے معاملہ میں احسان کا مرتبہ یہی ہے کہ جو ہمارے ساتھ برا سلوک کرے یا تکلیف پہنچائے تو ہم تکلیف پہنچانے والے کی سطح سے بلند ہو کر اس کے ساتھ خلافِ توقع اعلیٰ درجہ کا حسن سلوک کریں "جیسے کو تیسا" محاوہ پر عمل نہ کیا جائے، حدیث میں فرمایا گیا کہ **لَاتَکُوْنُوْا اِمَّعَۃً** حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ تم اس طرح مت کہو کہ لوگ میرے ساتھ جیسے رہیں میں بھی ویسا رہوں گا۔ (معارف الحدیث ۲ / ۱۸۸ کتاب الاخلاق) یہ بھی تعلیم واضح طور پر دی گئی کہ جو تم سے قطعِ تعلق کرے تم اس سے اپنا رشتہ و تعلق جوڑو، جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کرو اور جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تو تم اس سے اچھے برتاؤ سے پیش آؤ۔ صل من قطعک و اعفو عن من ظلمک و احسن الی من اساء ک۔

باہمی تعلقات میں تلخی اور کشیدگی رشتہ دار اور عزیز و اقارب میں بھی ہوتی ہے، اس میں حکم ہے کہ دوسرے فریق کی زیادتی کو برداشت کرتے ہوئے ان کی غلطیوں کو نظر انداز کیا جائے اور اپنا فریضہ یعنی حسن سلوک ان کے ساتھ برابر باقی رکھے، حضرت ابو ہریرہؓ کا بیان ہے کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اپنے رشتہ داروں کی شکایت کرنے لگے کہ میں ان سے رشتہ ناطہ جوڑنا چاہتا ہوں تو وہ مجھ سے بے تعلق رہتے ہیں، میں ان سے اچھا سلوک کرتا ہوں تو وہ میرے ساتھ بُرا برتاؤ کرتے ہیں، میں ان کی غلطیوں کو برداشت کرتا ہوں تو وہ مجھ پر اور ظلم کرتے ہیں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے اس شخص سے کہا: تم ان سے برابر اچھا سلوک کرتے رہو، جب تک تم اس پر قائم رہوگے اللہ تعالیٰ کی مدد و نصرت تمہارے ساتھ رہے گی کہ رشتہ داروں کی زیادتیاں اور ظلم تمہارا کچھ نقصان نہیں کرے گی۔ (ریاض الصالحین، ص: ۱۵۳، باب بر الوالدین و صلۃ الارحام) واقعہ افک میں میں حضرت ابو بکرؓ کے ایک عزیز رشتہ دار بھی ماخوذ تھے، اس پر حضرت ابو بکرؓ نے ان پر اپنی خصوصی داد و دہش بند کر دی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیت نازل ہوئی:

وَلاَ يَأْتَلِ اُولُوا الْفَضْلِ مِنْكُمْ وَالسَّعَةِ اَنْ يُؤْتُوا اُولِی الْقُرْبٰی تم میں سے اہلِ فضل ،صاحب وسعت یعنی مال دار لوگوں کو اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرنے سے انکار نہیں کرنا چاہیے (سورۃالنور:۲۲)

آیت میں مزید فرمایا گیا:

انھیں چاہیے کہ وہ معاف کریں اور نظر انداز کریں ،کیا تم نہیں چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں معاف کرے،

اس آیت کے نزول کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اپنے عزیز رشتہ دار کی مدد و نصرت کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اُس میں مزید اضافہ بھی فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ دوسروں کی غلطیوں کو معاف کرنا اور نظر انداز کرنا صرف باہمی تعلقات کی بحالی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اپنی غلطیوں کی معافی کی راہ پیدا کرنا ہے۔

غصہ و ناراضگی ایک فطری چیز ہے ،کسی معاملہ میں اہل تعلق اور دوست واحباب کے ساتھ ایسی بات پیش آجائے تو حدیث میں اس کے لیے صرف تین دن کی اجازت دی گئی ،آپؐ نے فرمایا کہ کسی مسلمان کے لیے روا نہیں کہ وہ اپنے مسلمان بھائی سے تین دن سے زیادہ بات چیت بند رکھے ، (ریاض الصالحین ،ص:۵٦۷باب تحریم هجران المسلمین ......) اللہ کے رسول ﷺ کی یہ بھی حدیث ہے کہ پیر اور جمعرات ان دو دنوں میں اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی مغفرت و بخشش فرماتے ہیں سوائے مشرک کے اور ان دو آدمیوں کے جو ایک دوسرے سے قطع تعلق کیے ہو، جب تک وہ ایک دوسرے سے مل نہیں جاتے ان کی مغفرت و بخشش نہیں ہوتی ۔(حوالہ سابق)

کشیدہ تعلقات میں بہتری اور تازگی باہم سلام کو رواج دینے اور سلام میں پہل کرنے سے ہوتی ہے۔ نبی ﷺ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا کہ کیا میں ایسی چیز بتادوں جس کو تم کرنے لگو تو آپس میں تمہاری محبت بڑھ جائے ؟ تم سلام کو اپنے درمیان رواج دو ،(ریاض الصالحین ،ص:۱۷۷باب فضل الحب فی اللہ ......) ایک جگہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جس نے سلام کرنے میں پہل کی وہ غرور و تکبر سے بری ہے البادئ بالسلام بری من الکبر (معارف الحدیث ۱۵۰۵/٦ کتاب المعاشرہ ......) پس جن

بھائیوں کے باہمی تعلقات کشیدہ ہیں سلام میں پہل کر کے اپنے تعلقات کی تجدید و بحالی کا فیصلہ کن قدم اٹھا سکتے ہیں۔

عید الفطر کے موقع پر ہماری باہمی محبت و چاہت اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی کے لیے ہونی چاہیے، اس مرحلہ پر ہم صرف رسمی طور پر گلے نہ لگائیں بلکہ دل سے دل ملائیں، پیار و محبت کے گیت گائیں، اخوت و بھائی چارگی کا پیغام دنیا کو سنائیں اور اپنی باہمی رنجشیں و کدورتیں ہم ختم کریں، یہ بھی عید الفطر کا اہم سبق اور پیام ہے، شاعر کا یہ شعر ہماری دوستی و محبت کا آئینہ ہو:

جب گلے مل کے وہ پلٹے تو ہوا یوں محسوس
جیسے کھینچے لیے جاتا ہے کلیجہ کوئی

”باہمی تعلقات میں کشیدگی اور خرابی اس وقت پیش آتی ہے جب اپنی طبیعت و مزاج اور مرضی کے خلاف کوئی کام ہوتا ہے یا کوئی بھی بات کہہ دی جاتی ہے، ایسے موقع پر خود کو اعتدال و توازن کے دائرہ میں رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس کے لیے اسلام میں عفو و درگذر کی تعلیم دی گئی ہے، تاکہ اس کی وجہ سے اپنے آپ پر قابو پانا آسان ہو، قرآن مجید میں نیکوکار اور پرہیزگاروں کی ایک علامت بھی بتائی گئی کہ وہ غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں۔ (آل عمران: ۱۳۴) خود رسول اللہ ﷺ کی عادتِ مبارک یہ تھی کہ آپ ﷺ انتقام اور بدلہ لینے کے بجائے عفو و درگذر سے کام لیتے وَلٰکِنْ یَّعْفُوْ وَیَصْفَحُو“

گلے ملیں نہ ملیں، دل ملائے رکھیے!

عید الفطر کا یہ دن اپنی تمام مسرتوں، خوشیوں اور شادمانیوں کے ساتھ پھر ایک مرتبہ ہم پر سایہ فگن ہے، اس مبارک و مسعود دن میں فرحت و سرور کی یہ ساعتیں اور لمحات تمام عالمِ اسلام کے مسلمانوں کے لیے مبارک ہو، اسلام نفرت و عداوت اور تحقیر و اہانت کا نہیں بلکہ پیار و محبت اور الفت و انسیت کا مذہب ہے، یہ اپنے پیروکاروں کو اخوت و بھائی چارگی اور محبت و ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے، یہ تعلیم روزمرہ کی زندگی کے تمام مراحل اور معاملات اور مواقع کے لیے ہے، لیکن عید الفطر کے دن پیار و محبت سے متعلق اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کو بجالانے کا خاص موقع ہوتا ہے، اس لیے اس دن ہمارے دل ہر طرح کی نفرتوں اور کدورتوں سے پاک ہونا چاہیے۔

آج کے اس خوشی و مسرت کے دن مسلمان مختلف طریقوں سے اپنے دینی و ایمانی بھائیوں کے ساتھ پیار و محبت کے آداب بجالاتے ہیں، خوش پوشاکی کے ساتھ خوش مزاجی کا بھی بھرپور مظاہرہ کرتے ہیں، چہروں پر تبسم اور مسکراہٹ سجائے ہوئے ایک دوسرے سے مصافحہ کرتے ہیں، ایک دوسرے کو گلے لگا کر ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے اور بچھڑے ہوئے جسموں کو ملانے کی کوشش کرتے ہیں، گرمجوشی کے ساتھ مبارک بادی کے پیغامات کے تبادلے اور ان کی ترسیل ہوتی ہے اور کچھ منچلے نوجوان گلے ملتے وقت ''کمر توڑنے'' کا مقابلہ شروع کر دیتے ہیں، اخوت و محبت کے ان سارے طریقوں اور مظاہروں کے پیچھے دراصل باہمی محبت اور الفت کا جذبہ کارفرما ہے۔

ایک بندۂ مؤمن اور مسلمان کی شان یہ ہونی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے وہ کسی کے ساتھ دوستی و محبت کا تعلق قائم کرے اور اس کی کسی سے دوری اور دشمنی بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہو، مسلمان اگر کسی کو چاہتا ہے تو صرف اس بنا پر کہ وہ اللہ تعالیٰ کا نیک اور فرماں بردار بندہ ہے، کسی کو اگر وہ ناپسند کرتا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کا باغی ہے اور اسلام کا دشمن

ہے، دوستی یا دشمنی ہر دو صورت میں مسلمان دنیوی فائدہ اور ذاتی مفاد پیش نظر نہیں رکھتا، اس کو احادیث میں اَلْحُبُّ فِی اللّٰہِ وَ الْبُغْضُ لِلّٰہِ سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس کی بڑی فضیلت بیان کی گئی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب اور پسندیدہ وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو اور وہ بغض وعداوت ہے جو اللہ کے لیے ہو، (معارف الحدیث ۲/۱۹۷، کتاب الاخلاق) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ بندۂ مومن کا یہ عمل کے کسی سے دوستی ودشمنی میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ذات اس کے پیش نظر ہو تو بلاشبہ یہ بہت اونچا مقام ہے، ایک دوسری حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ ایمان کے مضبوط ہونے کی دستاویز اور سند یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے محبت کرنا اور تعلق جوڑنا ہو اور کسی سے تعلق ختم کرنا ہو، (حوالہ سابق ۱/۱۴۱ کتاب الایمان) پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے کسی سے محبت ونفرت خود باری تعالیٰ کی عظمت وتوقیر کا تقاضہ ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس بندہ نے بھی اللہ کے لیے کسی بندہ سے محبت کی اس نے اپنے رب عزوجل ہی کی عظمت وتوقیر کی، ایک جگہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ کے بیان کردہ اعلان کی روشنی میں بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے لیے کسی سے محبت ونفرت کرتے ہیں ان کا ہر تعلق ورشتہ اللہ تعالیٰ کی رضا وخوشنودی کے تحت ہوتا ہے، کوئی دنیوی فائدہ اور ذاتی مفاد اس میں نہیں ہوتا اور پھر خود اللہ تعالیٰ بھی اپنے ان نیک بندوں کو اپنی محبت کا پروانہ دیتے ہیں، حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ میری محبت واجب ہے ان لوگوں کے لیے جو باہم میری وجہ سے محبت کریں، میرے تعلق سے کہیں جڑ کر بیٹھیں، میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں۔ (ریاض الصالحین، ص:۱۷۸، باب فضل الحب فی اللّٰہ......)۔

کسی تعلق ورشتہ یا کسی غرض یا فائدہ کی وجہ سے کسی سے دوستی اور محبت کرنا یہ ایک انسانی فطرت ہے، آدمی کو اپنے اعزہ واقارب سے محبت ہوتی ہے، کوئی شخص کسی مالدار سے محبت کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس کی معاشی اور مالی ضروریات کی تکمیل کرتا ہے، اس طرح کی محبت وچاہت میں قوم ومذہب کی

تخصیص نہیں، یہاں تک کہ جانوروں اور درندوں میں بھی یہ محبت ہوتی ہے، کمال اور خوبی یہ ہے کہ کسی رشتہ اور قرابت کسی مالی لین دین اور کسی تحفے اور ہدیہ کے بغیر محض اللہ کے دین کی نسبت سے محبت و تعلق ہو، حدیث میں ان کی خاص فضیلت بیان کی گئی اور قیامت کے دن ان کے خصوصی مقام ومرتبہ کی نشاندہی کی گئی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہدا تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن بہت سے انبیاء اور شہدا ان کے خاص مقامِ قرب کی وجہ سے ان پر رشک کریں گے، صحابہؓ نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ہمیں بتلا دیجئے کہ وہ کون بندے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: وہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے بغیر کسی رشتہ ناطہ اور بغیر کسی مالی لین دین کے روحِ خداوندی (دین) کی وجہ سے باہم محبت کی، پس قسم ہے خدا کی ان کے چہرے قیامت کے دن نورانی ہوں گے، بلکہ سراسر نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف وہراس ہوگا اس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے، (معارف الحدیث ۲/ ۲۰۱، کتاب الاخلاق) اسی طرح قیامت کے میدان میں جب نفسانفسی کا عالم ہوگا اور تمام انسان حیرانی و پریشانی میں ہوں گے اور سورج سوا نیزہ پر ہونے کی وجہ سے لوگ گرمی کی شدت سے بے چین و بے قرار ہوں گے، ایسے نازک موقع پر اللہ کے لیے محبت کرنے والے اور دوستی اور دشمنی رکھنے والے عرشِ الٰہی کے سایہ ہوں گے اور اس دن اللہ کے عرش کے سایہ کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ (ریاض الصالحین، ص: ۱۷۶ باب فضل الحب فی اللہ......)

عید کے دن ایک دوسرے سے ملاقات کے لیے جانا ہوتا ہے، اس میں بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ دوستی اور رشتہ داری کے تعلقات کو خوش گوار اور استوار رکھنا ہے، اس لیے جانا ہے، یہ مقصد اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی نیت ہونی چاہیے کہ مجھے اللہ واسطے ان سے محبت و تعلق ہے، اس لیے جارہا ہوں، رسول اللہ ﷺ نے ایک واقعہ بیان فرمایا کہ ایک شخص اپنے بھائی سے جو کسی دوسری بستی میں رہا کرتا تھا ملاقات کے لیے نکل پڑا، اللہ تعالیٰ اس کی راہ گذر پر ایک فرشتہ کو اس کے انتظار میں بٹھادیا، جب وہ شخص اس راستہ سے گذرا تو فرشتہ نے پوچھا: تمہارا کہاں کا ارادہ ہے؟ اس شخص نے جواب دیا کہ میں اس بستی میں رہنے والے اپنے بھائی سے ملنے جارہا ہوں، فرشتہ نے کہا: کیا اُس پر

تمہارا یا اُس کا تم پر کوئی احسان ہے اور کوئی حق نعمت ہے جس کو تم پورا اور پختہ کرنے کے لیے جارہے ہو؟ اس بندہ نے کہا: نہیں، میرے جانے کا باعث اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کے لیے مجھے اس بھائی سے محبت ہے، فرشتہ نے کہا کہ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ اللہ تم سے محبت کرتا ہے جیسا کہ تم اللہ کے لیے اس کے اس بندہ سے محبت کرتے ہو۔ (ریاض الصالحین، ص: ۱۷۱ باب زیارۃ اہل الخیر)

عید کے دن مسلمان مصافحہ کرتے ہیں، مصافحہ کے موقع پر مزاج میں روکھا پن اور خشکی نہ ہو، ہاتھ ملانے والے کو اس کا احساس نہ ہو کہ آپ بادلِ ناخواستہ ناگواری اور ناراضگی کا ماسک لگائے ہوئے اس سے مصافحہ کررہے ہیں، مصافحہ بالکل اچھے موڈ میں اور ہنستے مسکراتے چہرہ کے ساتھ ہونا چاہیے، ہنستے مسکراتے چہرہ کے ساتھ کسی کا استقبال کرنا اگرچہ دیکھنے میں معمولی اور چھوٹا کام ہے لیکن اس کو حقیر اور کم تر سمجھ کر چھوڑ دینا نہیں چاہیے، آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے: کسی نیکی کو معمولی اور چھوٹی مت سمجھو اگرچہ تم اپنے بھائی سے مسکراہٹ لیے ہوئے گرم جوشی سے ملاقات کرو۔ (ریاض الصالحین: ۲۹٦ باب استحباب طیب الکلام......)

گلے لگانا یا گلے ملنا یہ عید کے دن کا ایک روایتی اور رسمی عمل ہے، اس عمل سے حقیقی محبت اور دوستی کا ادراک اور احساس تب ہی ہوگا جب صرف گلے سے گلے نہ لگائیں بلکہ دل سے دل بھی ملائیں، دلوں میں حسد، کینہ کپٹ اور عداوت وکدورت بدستور باقی ہو اور صرف گلے مل رہے ہوں تو یہ عمل صرف روایتی اور رسمی بن کر رہ جاتا ہے، اس لیے ان بیماریوں سے دلوں کا پاک ہونا ضروری ہے: بقول شاعر ؎

وہ خود آرائی کہاں، خوشیوں کی اب تمہید کہاں
رسم ادا کردیتے ہیں، مل لیتے ہیں اب عید کہاں

آپ ﷺ کا ارشاد ہے: تم حسد کی بیماری سے بہت بچو، حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھاجاتا ہے جس طرح آگ لکڑی کو کھاجاتی ہے۔ (ریاض الصالحین، ص: ۵۵۹ باب تحریم الحسد) ایک جگہ رسول اللہ ﷺ

نے فرمایا کہ: ''تم سے پہلے امتوں کی مہلک بیماری یعنی حسد اور بغض تمہاری طرف چلی آرہی ہے، یہ بالکل صفایا کردینے والی اور مونڈ دینے والی ہے، میرے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ بالوں کو مونڈنے والی ہے بلکہ یہ مونڈتی ہے اور بالکل صفایا کردیتی ہے دین کا، وَلٰکِنْ تَحْلُقُ الدِّیْنَ۔ (معارف الحدیث ۲/۲۱۷ کتاب الاخلاق) نیز یہ کہ جب تک دو مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے تعلق سے اپنے دلوں کے اندر دشمنی اور کینہ رکھتے ہیں وہ اپنے گناہوں کی مغفرت و بخشش کی نعمت سے محروم رہتے ہیں، رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے: ہر پیر اور جمعرات کو جنت کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور شرک نہ کرنے والے ہر بندۂ مؤمن کی معافی کا فیصلہ کردیا جاتا ہے سوائے اُس آدمی کے جس کے بھائی سے اُس کی دشمنی ہو، باہمی دشمنی رکھنے والے اِن دو آدمیوں کے متعلق حکم ہوتا ہے کہ ان دونوں کو چھوڑے رکھو، یہاں تک یہ دونوں آپس میں صلح نہ کریں۔ (ریاض الصالحین، ص:۵۵۸ باب النھی عن التباغض)

غرض یہ کہ خوشیوں، مسرتوں اور شادمانیوں والی عید کا یہ دن، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے، بچھڑے ہوئے جسموں کو ملانے، نفرت اور عداوت کی دیواروں کو ڈھانے، ناچاقی اور نااتفاقی کے فاصلوں کو سمیٹنے، باہمی اختلافات کی خلیج کو پاٹنے کا دن ہے، جب یہ ساری خوبیاں ہوں گی تو ہماری عید کی خوشیاں دوبالا ہوجائیں گی، دلوں کی صفائی اور ان کے جوڑ کی اہمیت کے پس منظر میں عیدالفطر کا یہ پیغام شاید قارئین کو پسند آئے۔

دشمنی لاکھ سہی ختم نہ کیجئے رشتہ
گلے ملیں نہ ملیں، دل ملائے رکھیے!

یتیم کی قسمت جب جاگ اٹھی

آج ہی کی طرح عید کا دن ہے، چھوٹے چھوٹے معصوم بچے خوشیوں سے سرشار، بڑوں کی روک ٹوک سے آزاد، خوبصورت وخوشنما کپڑوں میں ملبوس کھیل کود میں مصروف اور مگن ہیں، چہکتی مہکتی ان کلیوں میں اور اڑتی پھرتی ان رنگارنگ تتلیوں میں ایک معصوم سا بچہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے، دوسرے بچوں سے الگ تھلگ، خاموش کھڑا رُو رہا ہے، پیارے بچوں کے پیارے نبی ﷺ عید کی نماز کے لیے عید گاہ نکل آتے ہیں، راستہ میں جنت کے اس مرجھائے ہوئے پھول کو دیکھ کر قریب تشریف لاتے ہیں اور پوچھتے ہیں بیٹا! تم دوسرے لڑکوں سے اس طرح الگ اور تنہا کیوں کھڑے ہو؟ کیا تمہارے پاس کھیلنے کے لیے اخروٹ نہیں ہے، آؤ! میں تمہیں اخروٹ دلوادوں، معصوم بچہ جس کو رسول اللہ ﷺ کا اسمِ مبارک تو معلوم تھا، لیکن وہ آپ ﷺ کے چہرۂ انور سے واقف نہیں تھا، کہنے لگا: چچا جان! آپ مجھے اپنے حال پر رہنے دیجئے، آپ میرے زخموں کو ہرا اور میرے غموں کو تازہ کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ پھر اس افسردہ اور رنجیدہ لڑکے نے اپنی داستان یوں بیان کرنی شروع کی:

> ”میرا باپ ایک جنگ میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ گیا تھا، وہ شہید ہوگیا، میری ماں نے دوسرا نکاح کرلیا، ان دونوں نے میرا مال ہضم کرلیا اور مجھے میرے سوتیلے باپ نے گھر سے نکال دیا، اب میرے پاس نہ کھانے پینے کا سامان ہے اور نہ ہی رہنے سہنے کے لیے مکان ہے“

اتنا کہنے کے بعد معصوم بچہ اپنے ننھے منے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکا اور یکا یک اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھریاں بہنا شروع ہوگئی............رسول اللہ ﷺ اپنے دستِ شفقت سے آنسوؤں کو پوچھتے ہیں اور یوں فرماتے ہیں:

> ”بیٹا!“ کیا تم اس پر خوش نہیں ہوگے کہ محمد تمہارے باپ ہوں، عائشہؓ تمہاری ماں ہو، فاطمہؓ تمہاری بہن اور حسن وحسین تمہارے بھائی ہوں“

اتنا سننا تھا کہ بچہ خوشی سے جھوم اٹھا اور آپ ﷺ سے لپٹ گیا، آپ ﷺ بچہ کا ہاتھ پکڑ کر گھر لائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا: اس بچہ کو نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہناؤ اور اچھا کھانا کھلاؤ، اس کے بعد یہ لڑکا ہنسی خوشی اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا، یہ لڑکا ہمیشہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں رہا کرتا تھا، جب آپ ﷺ کی وفات ہوئی، اس پر اتنا غم طاری ہوا کہ وہ اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہوا یوں کہتا پھرتا تھا کہ آج میں پھر یتیم ہو گیا، اس کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اس لڑکے کو اپنی پرورش میں لے لیا، (ملخص از اخلاق نبوی واقعات کے آئینہ میں، ص: ۱۴۵ / مؤلف مولانا حفظ الرحمن قاسمی)

یہ سیرتِ مبارکہ کا ایک واقعہ ہے، یوں تو مجبور بے کس لوگوں کے ساتھ آپ ﷺ کی ہمدردیاں، مہربانیاں، شفقتیں اور محبتیں ہمیشہ رہتی تھیں، بقول علامہ حالی: ؎

وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا
مرادیں غریبوں کی بَر لانے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا
فقیروں کا ملجا، ضعیفوں کا ماویٰ
یتیموں کا والی، غلاموں کا مولیٰ

رسول اللہ ﷺ نے شہادت اور درمیانی انگلی کو ملا کر ارشاد فرمایا کہ قیامت کے دن میں اور یتیم کی کفالت (دیکھ ریکھ) کرنے والا ان دو انگلیوں کی طرح ہوں گے، میرے اور اس کے درمیان فاصلہ نہیں ہوگا، بالکل قریب ہوں گے۔ (ریاض الصالحین، ص: ۱۳۴ باب ملاطفة الیتیم) نبی رحمت ﷺ کے امتی اور پیروکار ہونے کے ناطے ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم عید کے اس پرمسرت موقع پر معاشرہ میں موجود یتیم لڑکوں اور مجبور و بے بس افراد پر خوشیوں کے سوغات لٹائیں، انہیں یتیمی، مجبوری اور بے کسی کے احساس سے نجات دلا کر ان کا غم ہلکا کریں۔

عید اُس کی ہے جس کی عید کے ساتھ
سَو غریبوں کی عید ہوتی ہے

قربانی کا فریضہ ـــــ عشق وجنوں کا نمونہ

عشق ومحبت اور جنون ودیوانگی کے سلسلہ میں لیلیٰ مجنون اور فرہاد کے واقعات اور قصے بعض مرتبہ حماقت وبیوقوفی کی مثالیں معلوم ہوتی ہیں، لیکن سچی اور صحیح بات یہ ہے کہ جب خود اپنے اوپر ان چیزوں کا گذر ہوتا ہے تو اُس موقع پر آدمی اپنے مجنونانہ رویہ اور طرزِ عمل کی کوئی عاقلانہ اور دانشمندانہ تاویل وتوجیہ نہیں کر پاتا، ایسے موقع پر اُس کے خیر خواہ اور محسن بارہا اُس کو عقل کی دہائی دیتے ہیں، مختلف اندیشوں اور خطرات سے ڈراتے ہیں، مگر وہ بہ زبانِ حال یہی کہہ رہا ہوتا کہ ''میں دیوانہ ہوں، مجھے دیوانہ رہنے دو''، واقعہ یہ ہے کہ زندگی کے بعض مراحل اور مسائل میں انسان پر جنون ودیوانگی آتی ہے، یہاں عقل ودانائی کی دہائی بے وقت کی راگنی لگتی ہے، مثلاً کسی کو سگریٹ اور پان کی عادت ہو یا وہ شراب کا رسیا ہوجائے، آپ اس کے سامنے کتنا ہی مہنگائی کا رونا روئے، اُس کے سامنے سگریٹ اور شراب نوشی کے نقصانات اور بیماریاں بتائیں وہ تو بس یہی کہے گا کہ ؎ ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں۔

اسلام اپنے پیروکاروں سے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت ومحبت میں اسی طرح کی جنون ودیوانگی چاہتا ہے، اُس کو سراہتا اور پسند کرتا ہے، اُس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ''تم اللہ کا ذکر اتنی کثرت سے کیا کرو کہ لوگ تمہیں پاگل مجنون کہنے لگیں''، ذکر صرف چند مخصوص تسبیحات اور ''اوراد وظائف'' پڑھ لینے کا نام نہیں ہے بلکہ دین وشریعت کا ہر وہ عمل اور کام جس سے اللہ تعالیٰ اور اُس کے رسول ﷺ سے محبت واطاعت کا تعلق قائم ہو اور ان کی رضاء وخوشنودی ملے، وہ سب ذکر کے مفہوم میں داخل وشامل ہے، جیسے نماز کے متعلق فرمایا گیا کہ ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ'' (سورۃ طٰہٰ: ۱۴) میری یاد کے لیے نماز قائم کرو، اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کی شان بتائی گئی کہ ''اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ'' (سورۃ آل عمران: ۱۹۱) وہ کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، غور کیجیے کہ عین کاروبار کے عروج اور شباب کے وقت باعمل مسلمان اپنی دوکان بند کر کے مسجد کا رُخ کرتا ہے، دنیا کے عقلاء اور ''دانشورانِ قوم'' طنز وتعریض کا نشانہ بنا کر کہتے ہیں:

''یہ بھی کیا پاگل پن اور جنون ہے کہ اچھے خاصے مہنگے گاہکوں کو چھوڑ چھاڑ کر آدمی نماز پڑھنے چلا جائے''

جب کہ مسلمان تاجر قرآن مجید کی اس آیت پر عمل پیرا ہونا چاہتا ہے کہ **رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ** (سورۃ النور:۳۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں تجارت وکاروبار اور خرید وفروخت اللہ کی یاد اور نماز قائم کرنے سے غافل نہیں کرتی۔

قربانی کا فریضہ دراصل اسی عشق ومحبت اور جنون ودیوانگی کا نام ہے، قربانی کے عظیم الشان واقعہ میں شامل ہر ہستی کا کردار اللہ تعالیٰ کی مرضی وخوشنودی پانے کے لیے جذبہ فدائیت اور فنائیت کی لازوال مثال ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لمبی مدت کے بعد بڑی امیدوں، آرزوؤں، تمناؤں، دعاؤں اور منتوں کے بعد ایک فرزندِ صالح عطا ہوتا ہے، بیٹا ابھی بالکل شیر خوار ہے، باپ کی بے پناہ اور اتھاہ محبت وشفقت کا محتاج ہے، ایسے وقت میں حکم ہوتا ہے کہ اس ننھے اور معصوم سے بچے کو بے آب وگیاہ، لق دق چٹیل میدان میں اُس کی والدہ کے ساتھ چھوڑ کر ملکِ شام چلے جاؤ، پھر عین ایسے موقع پر جب کہ فرزندِ صالح اپنے والد کی انگلی پکڑ کر چلنے لگتے ہیں، بوڑھے باپ کی لاٹھی بننے کے قابل ہوتے ہیں تو حکم دیا جاتا ہے کہ اپنے اس لاڈلے اور چہیتے بیٹے کو ذبح کردو، حضرت بی بی ہاجرہؓ کو دیکھئے کہ جنگل وبیابان میں اپنے لختِ جگر کے ساتھ تنہا اکیلی رہ جاتی ہیں، جہاں نہ دانہ ہے نہ پانی، ہر سو ویرانی ہی ویرانی، اپنے شوہر سرتاج سے پوچھ بیٹھتی ہیں کہ آخر کس لیے آپ ہمیں تنہا چھوڑ جا رہے ہیں؟ جواب نہ ملنے پر پھر خود ہی کہتی ہیں کہ کیا اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام ''ہاں'' کا اشارہ کرتے ہیں، تب حضرت بی بی ہاجرہؓ پرسکون ہوکر بھرپور اطمینان اور پورے یقین وتوکل کے ساتھ بول اٹھتی ہیں کہ ''تب تو اللہ تعالیٰ ہم کو ہرگز ضائع نہیں کرے گا''، خود سیدنا حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بلند کردار ہے، ابھی حضرت اسماعیل علیہ السلام نے دنیا دیکھی ہی کہاں تھی، مدتوں وہ والد بزرگوار سے دور رہے، ابھی وہ لڑکپن کی عمر میں ہے، جیسے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں اپنا خواب سنایا اور اللہ تعالیٰ کا منشاء سامنے رکھا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام بغیر کسی پس وپیش اور شش وپنج کے بلا چون وچرا، بغیر قیل وقال اور آنا کانی کے پورے حوصلہ اور جذبہ کے ساتھ سر تسلیم خم کردیا اور والدِ محترم کو جواب دیا کہ ''**يَا اَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَاءَ اللهُ مِنَ الصَّابِرِيْنَ**'' (سورۃ

الصافات:۱۰۲) پیارے ابا جان! جس بات کا آپ کو حکم دیا گیا کر گذریئے، انشاء اللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے، پھر آگے بڑھ کر اس کی تدبیر اور ترکیب بھی بتادی کہ ابا جان! جب آپ مجھے ذبح کے لیے لٹائیں تو اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لیں، تا کہ شفقتِ پدری حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آڑے نہ آجائے، شاعر نے بالکل سچ اور برموقع کہا کہ ؎

یہ فیضانِ نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آدابِ فرزندی

قربانی کے اس واقعہ کو بار بار پڑھیے، اِس کے ہر جز اور پہلو پر غور کیجیے، کہیں بھی عقل ودانائی کی کارفرمائی نظر نہیں آئے گی، بلکہ اس پورے واقعہ میں عشق ومحبت، فدائیت وفنائیت اور جنون ودیوانگی کی فرمانروائی ملے گی۔ ''روشن خیال اور دانشورانِ قوم'' نے فریضہ قربانی کی اس روح کو سمجھا ہی نہیں، یہاں بھی وہ عقل وخرد کی ترازو لے کر بیٹھ گئے اور احمقانہ انداز میں تولنے لگے، فرماتے ہیں:

''قربانی کے لیے مسلمان ہزاروں لاکھوں روپے کے جانور خریدتے ہیں اور گوشت خوری کے ذریعہ اُس کو ضائع کردیتے ہیں، قوم کے ہزاروں افراد فاقہ کشی کا شکار ہیں، بے شمار بچے تعلیم سے بے بہرہ ہیں، کیا ہی اچھا ہوتا کہ قربانی کی ادائیگی میں لاکھوں کا سرمایہ لگانے کے بجائے اس سرمایہ سے قوم کی غربت وفاقہ کشی دور کی جاتی اور قوم کے بچے تعلیم سے آراستہ ہوتے''۔

گستاخی معاف! ہمارے دانشورانِ قوم اپنا یہ احمقانہ مشورہ ملک کے کرتا دھرتا لیڈران، قانون دانوں اور قانون ساز اداروں کو بھی پیش کریں کہ:

''یومِ آزادی کے موقع پر چھوٹے بڑے بہت سارے پروگراموں میں بہت زیادہ ''ترنگا لہرایا جاتا ہے'' جب کہ ملک میں شہریوں کی بڑی تعداد ننگی اور بھوکی رہتی ہے، اس لیے بہتر یہی ہے کہ یومِ آزادی کی تقاریب میں ترنگا لہرانے کے بجائے یہ کپڑا غریبوں میں تقسیم کردیا جائے تا کہ وہ اپنا جسم چھپا سکیں''

اس پر یہی کہا جائے گا کہ عقل سٹھیا گئی، اتنا بھی شعور نہیں کہ یومِ آزادی کی تقاریب مجاہدینِ

آزادی کوخراجِ تحسین پیش کرنے اوراپنے اندرآزادیِ وطن کے جذبہ کو پروان چڑھانے کے لیے ہوتی ہیں، پس مسلمان بھی قربانی کے موقع پر صرف گوشت وخون کی قربانی نہیں کرتے بلکہ اپنے جذبات اور احساسات کا خون کرتے ہیں، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کوخراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں اوراپنے اس جذبہ دروں کا اظہار کرتے ہیں کہ خداوندا! جانور کے گلے پر چھری چلانا ہمارا ظاہری عمل ہے، جس طرح آج ہم جانور پر چھری چلا رہے ہیں اسی طرح انشاء اللہ زندگی کے ہر موقع اور مرحلہ پر تیرے حکموں کی تابعداری اور تیرے نبی ﷺ کی سنتوں اور طریقوں کی پیروی میں ہم اپنے جذبات ،نفسانی خواہشات، خاندانی اور سماجی روایات پر بھی چھری چلا دیں گے۔

غرض یہ کہ ایک مسلمان صاحبِ ایمان کی صبح وشام کی پوری زندگی قربانی سے عبارت ہے، اسلام کا نام ہی خودسپردگی ہے، اپنے آپ کوغیر مشروط طور پر اللہ اوراس کے رسول ﷺ کے حوالہ کردینا ہے، مسلمان نماز پڑھتا ہے تو وقت کی قربانی دیتا ہے، روزہ رکھتا ہے تو نفسانی خواہشات کوقربان کرتا ہے، زکوٰۃ میں مال کی قربانی ہے، فریضہ حج میں وقت اور مال دونوں کی قربانی ہے، اسی طرح حلال وحرام کی قیود و پابندیوں کے ذریعہ اسلام زندگی کے ہر قدم اور ہر موڑ پر قربانی کا مطالبہ کرتا ہے، اس مطالبہ کی تکمیل جذبہ جنون ودیوانگی سے ہوتی ہے اور اس کا آغاز جذبہ تسلیم ورضاء سے ہوتا ہے، اس لیے مسلمان اس کا عملی ثبوت پیش کریں کہ ''اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (سورۃ الاعراف: ۱۶۳) یقینا میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت پروردگارِ عالم کے لیے ہے، سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے قربانی کا یہ واقعہ اس کا زندہ جاوید نمونہ ہے ؎

اطاعت چیز ہے کیا؟ اور تسلیم ورضاء کیا ہے؟
خلیل اللہ سے پوچھو، ذبیح اللہ میں دیکھو

چھری آپ نے کس پر چلائی؟

اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر اُنسیت والفت کا مادّہ اور جذبہ رکھا ہے، مستقل اور مسلسل ساتھ رہتے رہتے آدمی کو اپنے دوست واحباب، ساتھیوں اور متعلقین سے ایک طرح کی انسیت والفت پیدا ہوجاتی ہے، اگر کوئی ان میں انتقال کرجائے یا کسی حادثہ کا شکار ہوجائے تو اس کے متعلقین کو بہت دنوں تک اس کی یاد ستاتی اور تڑپاتی ہے، بعض مرتبہ حادثہ اور انتقال تو نہیں ہوتا لیکن ساتھ رہنے والا شخص نقلِ مقام کرجاتا ہے، ایسے موقع پر بھی اس کی باتیں، ادائیں اور حرکتیں رہ رہ کر یاد آتی ہیں، ان ہی انسیت والفت کے جذبات کے طفیل آدمی کو ''مونس وغمگسار'' ساتھی ملتے ہیں، خوشی اور غمی میں یہ اس کے کام آتے ہیں، بالخصوص مصیبت وحادثہ کے وقت مونس وغمگسار رفقاء سے انسان اپنا غم غلط کرتا ہے۔

الفت وانسیت کے جذبات آدمی کو صرف اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ ہی نہیں بلکہ جانوروں اور چوپایوں کے ساتھ بھی ہوتے ہیں، پالتو جانور اپنے مالک سے بہت ہی زیادہ مانوس ہوتے ہیں، مثلاً بکرے بکریاں، گائے بھینس، کبوتر وغیرہ، مالک کی آواز پر جمع ہوتے اور بکھر جاتے ہیں، بعض مرتبہ پالتو جانوروں سے انسیت اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ مالک کی بو محسوس کرکے وہ گھر میں جمع ہوجاتے ہیں، بے وقت آواز لگانے پر بھی مالک کے سامنے گھیرا ڈالتے ہیں، اتنی اطاعت وفرمانبرداری تو مالک کی اپنی اولاد بھی نہیں کرتی، پھر ان جانوروں کو کبھی کچھ ہوجاتا ہے تو مالک خود بھی اداس وافسردہ رہنے لگتا ہے، جو گھرانے اچھل کود اور شور شرابہ کرنے والے بچوں کی نعمت سے محروم رہتے ہیں وہ عام طور پر ایسے ہی پالتو جانوروں سے اپنی دل بہلائی اور دل چسپی کا سامان کرتے ہیں۔

پہلے زمانے میں عیدِ قرباں کے موقع سے مسلمان گھرانوں میں بہت پہلے ہی قربانی کے جانور خرید لیے جاتے تھے، گھر کے بزرگ مرد وخواتین خوب اہتمام سے انھیں دانہ پانی ڈالتے اور ان کے

چارہ گھاس کا خاص انتظام کرتیں، گھر کے چھوٹے چھوٹے معصوم بچے ان جانوروں کے ساتھ ہر روز ایک نیا تماشا کرتے، چارہ کھلانے کے لیے وہ ضد کرنے لگتے، پھر لطف یہ کہ ہر بچہ الگ سے اپنے سے مانوس جانور کا نام بھی رکھ لیتا، گویا وہ جانور نہیں فیملی ممبر ہوگیا، پھر جب عیدِ قرباں کی صبح ہوتی اور قربانی کا جانور ذبح ہوتا تو گھروں میں خوشی وغم کا ملا جلا ماحول ہوتا، خوشی اس کی کہ ہمارا محبوب اور مانوس جانور اللہ کی رضاء وخوشنودی میں قربان ہورہا ہے، اور غم اس کا کہ ہمارا مونس ورفیق جانور ہم سے جدا ہورہا ہے، دیکھنے والا تو بظاہر یہ سمجھتا ہے کہ قربانی کرنے والا اپنے جانور کے گلے پر چھری چلا رہا ہے، لیکن اس کا دل جانتا ہے کہ وہ جانور کے گلے پر نہیں اپنے جذبات پر چھری چلا رہا ہے، وہ جانور کا خون نہیں بلکہ قربانی کے جانور کے ساتھ الفت وانسیت سے بھرے اپنے اتاہ جذبات کا خون کرتا ہے۔

قربانی کا مقصد اور اس کی روح دراصل یہی ہے کہ مسلمان اپنی آرزوئں، امیدوں، تمناؤں اور جذبات وخواہشات کو اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی کے لیے قربان کردے، صبح وشام کی پوری زندگی تسلیم ورضاء کا نمونہ ہو، خدا تعالیٰ کے جس برگزیدہ پیغمبر کی یاد اور ان کی اتباع وپیروی میں قربانی کا مقدس فریضہ انجام دیا جاتا ہے انھوں نے قربانی کا سبق اور درس یہی دیا کہ بندۂ مؤمن پروردگار کے حکم وفرمان پر بلا چون وچرا، بغیر کسی پس وپیش کے، تذبذب اور ٹال مٹول کے اپنا سرِ تسلیم خم کردے ؎

اطاعت چیز ہے کیا ؟ اور تسلیم ورضا کیا ہے؟
خلیل اللہ سے پوچھو ذبیح اللہ میں دیکھو؟

قربانی کے پس منظر پر غور کیجیے کہ سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر مبارک ۸۰ / ۸۴ سال کو پہونچتی ہے، پیرانہ سالی اور بزرگی کی اس منزل میں عموماً اولاد کی کوئی امید اور توقع نہیں ہوتی، عمر کے اس حصہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونہار وبردبار لڑکے کے پیدا ہونے کی خوش خبری اور بشارت ملتی ہے، حضرت ابرہیم علیہ السلام کے لیے یقیناً خوشی ومسرت کا موقع تھا کہ بڑی دعاؤں اور التجاؤں کے بعد اللہ تعالیٰ نے بیٹا عطا فرمایا، حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ابھی پیدا ہوئے کچھ دن ہی گذرے تھے کہ حکم ہوا کہ اپنے اس نورِ نظر، لختِ جگر، لاڈلے اور چہیتے فرزند کو ایک لق ودق میدان اور جنگل وبیابان میں

چھوڑ آؤ، جہاں پانی کا کوئی قطرہ نہیں، درختوں کا سایہ نہیں اور نہ کھیتی باڑی کا ذریعہ ہے، ایسے وقت جب کہ بیٹے کو باپ کی شفقت و محبت کی شدید ضرورت ہے اور باپ خود بھی اس کو ہمیشہ اپنی نگاہوں میں رکھنا چاہتا ہے، بیٹے کو اس کی والدہ کے ساتھ ویران صحراء میں چھوڑ دینا یقینا کتنی بڑی آزمائش و امتحان ہے؟ لیکن اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حکم کو پورا کرتے ہیں، حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا پوچھتی ہیں کہ ہمیں اس ویران وسنسان وادی میں تنہا کیوں چھوڑ رہے ہو؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام کوئی جواب نہیں دیتے، بار بار پوچھنے پر جب کوئی جواب نہیں ملا تو حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کیا اللہ تعالیٰ نے اس کا حکم دیا ہے؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام جواب دیتے ہیں ہاں! تب حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا پورے اطمینان کا اظہار کرتی ہیں اور کہتی ہیں: اللہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی روانگی کے بعد ماں اور بچہ اس جنگل و بیابان میں اکیلے رہتے ہیں، یہاں تک کہ ساتھ لائے ہوئے کھجور اور پانی ختم ہو جاتا ہے، حضرت اسماعیل علیہ السلام بھوک و پیاس سے بے قرار ہو جاتے ہیں، ماں کی ممتا تڑپ اٹھی، حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا بے چین و بے قرار ہو کر پانی کی تلاش میں ایک پہاڑی سے دوسری پہاڑی کا چکر لگانا شروع کر دیتی ہیں، جب تک بچہ نظروں میں رہتا ہے وہ پہاڑ پر چڑھتی ہیں پھر جیسے ہی بچہ نگاہوں سے غائب ہونے لگتا ہے وہ پہاڑ پر چڑھے بغیر ہی بچہ کی فکر میں واپس پلٹ آتی ہے کہ کہیں بچہ کو کچھ نقصان نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کو حضرت بی بی ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی بے چینی و بے قراری اور بیتابی کی یہ ادائیں اتنی پسند آئیں کہ وہ رہتی دنیا تک فریضہ حج کے ارکان کا حصہ بنا دی گئیں۔

اس طرح دن مہینوں میں اور مہینے سال میں بدلتے اور گذرتے رہے، یہاں تک کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام چلنے پھرنے اور بھاگ دوڑ کرنے کی عمر کو پہونچ گئے، جوان اولاد کو آدمی اپنی پیرانہ سالی کا سہارا اور بڑھاپے کی لاٹھی سمجھتا ہے، دل کے کئی ارمان اس سے وابستہ ہوتے ہیں، یہاں پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو باری تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اپنے جوان بیٹے کو خود اپنے ہاتھوں سے ذبح کرو، یہ امتحان و آزمائش کی آخری حد تھی، اس پر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے فرزندِ ارجمند کھرے اترے، چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ کے حکم کی تعمیل میں بیٹے کو لے کر ذبح کرنے کے لیے میدان کی طرف نکل پڑے، لائق و باکمال فرزند نے ذبح ہونے سے پہلے شفقتِ پدری کا جذبہ نہ ابھر آنے کے لیے

تمام احتیاطی تدابیر باپ کے سامنے بیان کردی ؎

یہ فیضان نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی ؟

غرض یہ کہ باپ اللہ تعالیٰ کے لیے فدائیت وفنائیت کا حوصلہ لیے ہوئے اور فرزندِ ارجمند تسلیم ورضاء کے جذبہ کے ساتھ اپنے آپ کو پوری طرح بارگاہِ الٰہی میں پیش کردیا اور باپ نے پیشانی کے بل لٹا کر بیٹے کے گلے پر چھری رکھ کر چلانی شروع کردی تو خداوندِ قدوس نے آواز دی: اے ابراہیم! تم نے اپنا خواب سچ کردکھایا اور پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام جنت کے مینڈھے کے بدلہ میں چھڑا دیئے گئے، یہ انسانی تاریخ کی سب سے عظیم ترین قربانی تھی جس کو قیامت تک کے لیے یادگار بنادیا گیا۔

مسلمان، دراصل ملتِ ابراہیمی کا نام ہے، وہ دین ابراہیمی کے پیروکار اور علمبردار ہیں اور قربانی سنتِ ابراہیمی ہے، مسلمان ملتِ ابراہیمی کے فرد اور دین ابراہیمی کے پابند ہونے کی حیثیت سے سنتِ ابراہیمی کے مقصد اور روح کو سمجھیں، دین وشریعت کے مقابلہ میں اپنے نفسانی جذبات اور خواہشات پر چھری چلا کر ان کو قربان کردیں اس طرح دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ کی رضاء وخوشنودی والی زندگی کو شاندار اور یادگار بنائیں۔

اطاعت چیز ہے کیا ؟ اور تسلیم ورضا کیا ہے؟
خلیل اللہ سے پوچھو ذبیح اللہ میں دیکھو

✿✿✿

یہ فیضان نظر تھا یا مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیل کو آداب فرزندی ؟

✿✿✿

آج بھی ہو جو براھیم کا ایمان پیدا
آگ کرسکتی ہے اندازِ گلستان پیدا

جانور کی قربانی سے نفس کی قربانی تک

سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت بی بی ہاجرہؓ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زندگیوں میں قدم قدم پر ہمیں قربانی کا سبق ملتا ہے، مسلمان قربانی کو سنتِ ابراہیمی سمجھ کر ادا کرتا ہے، لیکن جس مقصد اور روح کے ساتھ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے رب کی بارگاہ میں اپنی قربانی پیش کی، اس کو بھی سامنے رکھنے کی ضرورت ہے اور ایک سچے مسلمان کی نشانی ہے کہ وہ زندگی کے ہر موڑ اور ہر مرحلہ پر قربانی کے سبق کو یاد کرے اور دہرائے، اس لیے کہ اسلامی تعلیمات اور شرعی احکام زندگی کے ہر شعبہ میں ہم سے قربانی کا مطالبہ اور تقاضہ کرتے ہیں، مثلاً نماز میں وقت اور مصروفیت کی قربانی ہے، روزہ میں خواہشات کو قربان کرنا پڑتا ہے، زکوٰۃ میں مال کی قربانی ہوتی ہے، اسی طرح اور دیگر عبادات بھی ہیں۔

سب سے بڑی قربانی تو نماز کے موقع سے ہوتی ہے، اس لیے کہ نماز کوئی ایک وقت تک محدود نہیں رہتی کہ صبح میں نمازِ فجر پڑھ لینے کے بعد تو شام تک کی فرصت رہے، برخلاف روزہ، زکوٰۃ اور حج کے کہ وہ تو ایک خاص وقت پر شروع ہوتے ہیں اور پھر ختم ہو جاتے ہیں، آدمی صبح سحری کر لے اور شام تک اپنا اطمینان سے رہے، کام کاج میں کوئی خلل نہیں، کوئی التواء نہیں، لیکن نماز وہ عبادت ہے کہ اس میں وقفہ وقفہ سے آدمی کو اپنی مصروفیات روکنا پڑتا ہے، اس لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا کہ نماز پڑھنا لوگوں پر بھاری اور مشکل ہے، سوائے ان کے کہ جو اللہ سے ڈرتے ہیں: **وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلاَّ عَلَى الْخَاشِعِيْنَ** (سورۃ البقرۃ: ۴۵) مسلم معاشرہ میں ایک بڑی تعداد نماز نہ پڑھنے والوں کی ہے، جو دیندار سمجھے جاتے ہیں وہ بھی مصروفیات کا بہانہ بنا کر باجماعت نماز ادا کرنے کے بجائے تنہا نماز پڑھ لیتے ہیں یا پھر اپنے ہی مقام پر باجماعت نماز کا اہتمام کر لیتے ہیں، گویا وقت کی قربانی اور مصروفیات پر چھری چلانے کا حوصلہ وہ بھی نہیں کر پاتے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ سب سے بہترین عمل نماز کو اس کے وقت پر پڑھنا ہے۔

پھر پانچ نمازوں میں عصر اور فجر کی نماز کا وقت بڑی ابتلاء وآزمائش کا ہوتا ہے، عصر کے وقت کاروبار بالکل عروج اور شباب پر رہتا ہے، سیٹھ صاحب کو سر کھجانے کی فرصت نہیں ہوتی، گاہک قطار در قطار کھڑے سر پر سوار رہتے ہیں، ایسے میں مؤذن اذان کی آواز لگاتا ہے، اس موقع پر کتنے ہوتے ہیں جو مؤذن کی آواز پر لبیک کہتے ہیں؟ ؟ اور رب کے حضور اپنے وقت اور کاروبار کی قربانی پیش کرتے ہیں؟؟ قرآن مجید میں نمازوں کی پابندی کی طرف توجہ دلانے کے بعد عصر کی نماز کی پابندی بطورِ خاص الگ بیان کی گئی ، ارشادِ ربانی ہے :**حَافِظُوْا عَلٰی الصَّلَوَاتِ وَالصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی** (سورۃالبقرۃ:۲۳۸)''نمازوں کی پابندی کرواور درمیان والی نماز کی بھی'' مفسرین نے ''صلوٰۃ وسطیٰ'' کی تعیین نمازِعصر سے کی ہے، اللہ کی صفت ''رزاقیت'' پر جس کا سچا ایمان ہوگا وہ یقینا برضاء ورغبت اذان کی آواز پر مسجد کا رُخ کرے گا، قرآن مجید میں صحابہ کرامؓ کی شان بیان کی گئی کہ تجارت وکاروبار اور خرید وفروخت کے ہنگامے انھیں اللہ کی یاد اور نماز قائم کرنے سے غافل نہیں کردیتے: **رِجَالٌ لاَّ تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلاَ بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَاِقَامِ الصَّلٰوةِ** (سورۃالنور:۳۷) صحابہ کرامؓ اذان کی آواز کے ساتھ ہی دوکانداری اور کاروبار سے اپنا دامن ایسا جھاڑ کر اٹھتے تھے کہ گویا انھیں اس سے کچھ سروکار اور واسطہ ہی نہیں، اسی طرح نمازِ فجر کی ادائیگی کا مسئلہ ہے، بالخصوص جاڑے اور سردی کی راتوں میں نرم اور گرم بستر پر آدمی گہری اور میٹھی نیند سوتا ہے، یوں بھی رات کے آخری پہر میں ٹھنڈی اور خنک ہواؤں کے خوشگوار جھونکے آدمی کو بستر سے جلدی الگ ہونے نہیں دیتے، ایسی میٹھی اور گہری نیند میں اذان کی آواز سونے والے کے کان سے ٹکراتی ہے تو وہ نیند ہی نیند میں بڑبڑاتا ہے کہ مؤذن صاحب نے آج وقت سے پہلے اذان دے دی! عیدِ قرباں کے موقع پر جانور کے گلے پر چھری چلانے والا مسلمان اگر قربانی کی روح اور اس کے مقصد کو سمجھتا ہے تو وہ یہاں بھی اپنی نیند کو قربان کرے گا اور مسجد کے لیے نکل پڑے گا، رسول اللہ ﷺ نے بشارت سنائی کہ قیامت کے دن وہ لوگ نور کے ممبروں پر ہوں گے جو رات کی تاریکی میں مسجد کو جایا کرتے ہیں۔

جذبات وخواہشات کو قربان کرنے اور ان پر چھری چلانے کا مرحلہ نکاح کے وقت بھی پیش آتا ہے، نکاح میں آدمی ہونے والی شریکِ حیات کے ساتھ اپنی زندگی کا نیا سفر شروع کرتا ہے اور زندگی

کے نئے دور میں قدم رکھتا ہے، اس موقع پر شادی کے بندھن میں بندھنے والے صرف دو افراد کی نہیں بلکہ گھر اور خاندان کے ہر فرد کی اپنی الگ خواہش ہوتی ہے، والدین کے ارمان الگ ہوتے ہیں، دوست واحباب کی آرزو ہوتی ہے کہ جتنی موج ومستی اور ناچ گانا کرنا ہو کرلو، اس لیے کہ شادی زندگی میں ایک بار ہوتی ہے بار بار نہیں ہوتی اور رقص وسرور کی محفلیں بھی بار بار آیا نہیں کرتیں، اس لیے ڈھول باجے اور پٹاخوں کے ساتھ جتنا اودھم مچانا ہے مچاؤ، گھر کی بوڑھی خواتین پرانی رسوم وروایات کو بجالانے پر اڑی رہتی ہیں، یہاں پر بھی عاقدین اور ان کے سرپرستوں کا امتحان ہے کہ کیا وہ ان ارمانوں، آرزؤں، امیدوں اور تمناؤں کے آگے ہتھیار ڈال دیں گے یا فریضہ قربانی کے سبق کو یاد کریں گے اور جانور کے گلے پر چھری چلانے کی طرح اہل خانہ وخاندان اور دوستوں کی ارمانوں اور اُمنگوں پر بھی چھری چلا دیں گے؟؟ ایک میں مخلوق کی رضاء وخوشنودی ہے تو دوسرے میں خالق کی، انتخاب اپنے اپنے حوصلہ اور ہمت پر ہے، بقول ؎

توحید تو یہ ہے کہ خدا حشر میں کہہ دے
یہ بندہ دوعالم سے خفا میرے لیے ہے

پس ضروری ہے کہ سنت طریقہ پر نکاح کو رواج دیا جائے، اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ سب سے بہترین نکاح وہ ہے جس میں کم خرچ ہو، اس وقت سماج میں نئے رشتوں اور جوڑوں میں بگاڑ اور دراڑ اسی وجہ سے ہے کہ نئی زندگی کا آغاز گناہ اور برائی سے ہوتا ہے، آغاز جب معصیت اور نافرمانی سے ہو تو انجام میں خیر وبھلائی کی امید وتوقع کیوں کر کی جاسکتی ہے؟؟

عیدِ قرباں کے موقع سے ذبح کے لیے جانور کو پہلو کے بل لٹاتے وقت آدمی بڑے سے بڑے سرکش اور شریر جانور پر قابو پالیتا ہے اور اس کی گردن پر چھری چلا دیتا ہے، لیکن یہاں سوچنے اور غور کرنے کا مقام ہے کہ یہی شخص زندگی کے مختلف معاملات اور مسائل میں نفس کے سرکش اور شریر بھڑیئے پر کہاں تک اور کتنا قابو پاتا ہے؟ کیا اس کے اندر اتنی ہمت اور جرأت ہوتی ہے کہ خدا اور رسول کے حکموں کی تابعداری اور پیروی میں وہ نفس کے چونچلوں کو ذبح کردے؟ کاروبار اور کھانے پینے کی

چیزوں میں حلال وحرام کی تمیز اور جائز وناجائز امور میں احتیاط کے وقت نفس کو کیسے کیسے بہانے اور مصلحتیں سوجھتی ہیں، حق وصداقت کی راہ واضح ہونے کے بعد لوگ حق کو قبول وتسلیم کرنے سے محض اس لیے کتراتے ہیں کہ ان کا نفس آمادہ نہیں ہوتا، قرآن مجید میں سب سے بڑا گمراہ اس شخص کو کہا گیا جو نفسانی خواہشات کی پیروی کرے: وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللهِ (سورۃ القصص: ۵۰)، اور یہ بھی فرمایا گیا کہ جو شخص اپنے رب کے حضور حاضری سے ڈرتا ہو اور اپنے نفس کو خواہشات کی تکمیل سے روکے رکھا ہو تو اس کو جنت میں ٹھکانہ کی خوش خبری ہے، وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَأْوٰى: (سورۃ النازعات: ۴۰)، اس لیے جو قربانی کے مقصد اور اس کی روح کو سمجھے گا اور اس کے سبق کو یاد رکھے گا تو وہ بتوفیقِ الٰہی اپنی نفسانی خواہشات پر غلبہ پائے گا اور ان کو قربان کرے گا، نفس کو مارنا اور اس پر غلبہ پانا یہی دراصل قربانی کا مقصد ہے، بقول ذوقؔ ؎

بڑے موذی کو مارا نفسِ امارہ کو گر مارا
نہنگ و اژدھا و شیر نر مارا تو کیا مارا

قربانی کے اسی مقصد کے تحت مسلمان کی زندگی گذرے اور اس کی روشنی میں اپنا سفر طئے کرے، قرآن کی زبان میں: اِنَّ صَلٰوتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ (سورۃ الانعام: ۱۶۲) ”بے شک میری نماز، میری قربانی اور میرا جینا ومرنا سب پروردگارِ عالم کے لیے ہے“۔

...... روزنامہ منصف: ۲۱/دسمبر ۲۰۰۷ء......

بھروسہ کچھ نہیں اِس نفسِ امارہ کا اے زاہد
فرشتہ بھی یہ ہو جاوے تو اس سے بدگمان رہنا

ناشر : دارالثقافة حیدرآباد، الهند